ABC CERTIFIED

چہار سو

ماہنامہ

جلد۱۴، شمارہ جولائی/اگست، ۲۰۰۵ء

قیمت

فی پرچہ	35روپے
چھ شمارے	150روپے
زرِ سالانہ	300روپے

بیرونِ ملک ہوائی ڈاک سے

امریکہ کینیڈا	40 ڈالر
برطانیہ	20 پونڈ
سعودی عرب	80 ریال
متحدہ عرب امارات	80 درہم
قطر	ایضاً
شارجہ	ایضاً

رابطہ: 1-D/537 ویسٹرج III راولپنڈی۔

فون 5462495 فیکس 4433619 موبائل: 0300-5176062

E-Mail:waqars_oma@yahoo.com

پرنٹر : فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

گذارشِ مدیر: "قرطاسِ اعزاز" سے قطع نظر "چہارسو" میں تمام غیر مطبوعہ تخلیقات شاملِ اشاعت کی جاتی ہیں۔ یہ امر باعثِ افسوس ہے کہ بہت سے تخلیق کار ادب کو ملک و بیرونِ ملک کے خانوں میں تقسیم کرتے ہوئے ایک ہی تخلیق کو بیک وقت ایک سے زائد جرائد کو اشاعت کی غرض سے ارسال کیا کرتے ہیں۔ جب یہ عمل سینئر اور معتبر اہلِ قلم سے سرزد ہوتا ہے تو دل کو اخلاقی اقدار کی پامالی پر ملال ضرور ہوتا ہے۔ از راہِ کرم "چہارسو" میں اشاعت کے لئے تخلیقات ارسال کرتے وقت "غیر مطبوعہ" کی شرط کا خیال ضرور رکھئے اور مسودہ کی فوٹو کاپی ارسال کرنے کے بجائے اصل مسودہ بھیجئے...... ادارہ

قرطاسِ اعزاز

"........جو کچھ میں نے دیکھا اور سہا
اس کے بعد اب میں دنیا کی ہر بُرائی اور ظلم
کے لیے تیار ہوں مجھے بدلے ہوئے زمانے بدلی ہوئی
تہذیب اور بدلی ہوئی اقدار کے ساتھ زندہ رہنے
کے لیے کہا گیا ہے........"

"........اور لمحہ ختم ہو گیا۔ لمحہ جو
کبھی حاصل نہ ہو گا لیکن اس لمحے کا
توازن اس کا اپنا وجود ہمیشہ قائم رہے گا........"

"........لیکن کیا ہُوا۔ صنم کدے تو
کبھی ویران نہیں ہوتے۔ خدا آتے رہتے ہیں، جاتے
رہتے ہیں........"

"........سُرخ گلابوں کی مدھم روشنی
کے سائے میں مَیں غالباً یہی سوچتی ہوئی مروں
گی کہ اور کیا تھا........اور کیا تھا........اور
کیا تھا؟ صرف زندہ رہنے کا عمل۔ زندہ رہنے کا
عمل........"

"........ذہن اور ذوق کی کائنات سے
الگ حقیقی واقعاتی زندگی میں یہی سب
میرے ساتھی ہیں۔ انہی لوگوں میں مجھے اپنی
عُمر بِتانی ہے۔ اُن سے کچھ نہیں کہا جا سکتا
کچھ نہیں........"

قرۃ العین حیدر

کے

نام

ستاروں سے آگے

تذ
کشور
وکرم

قرۃ العین حیدر کی پیدائش ۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء کو علی گڑھ اتر پردیش میں ہوئی۔ ان کے والد سید سجاد حیدر یلدرم جن کا شمار اردو کے مشہور کہانی نویسوں میں ہوتا ہے۔ یوپی کے ایک ایسے پڑھے لکھے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جن کے افراد دربار مغلیہ میں سہ ہزاری پنج ہزاری اور منصب داروغیرہ رہے تھے۔ ان کے بزرگ دادا سید حسن ترمذی وسط ایشیا سے ہندوستان آئے تھے اور ان کے خاندان میں علم کی وراثت ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہی تھی اور ان کے گھرانے کی عورتیں بھی پڑھی لکھی تھیں۔ یلدرم کی نانی سیدہ ام مریم نے تو قرآن شریف کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔

۱۸۵۷ء میں ان کے پردادا امیر احمد علی نے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جس کے نتیجے میں ان کی جاگیر وغیرہ ضبط ہوگئی۔ بعد میں ان کے والد سید جلیل الدین حیدر اور ان کے چھوٹے بھائی سید کرار حیدر نے انگریزی تعلیم حاصل کر کے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ سید جلال الدین حیدر شہر بنارس کے حاکم مقرر ہوئے اور انہیں خان بہادر کے خطاب سے نوازا گیا۔ سید کرار حیدر یوپی میں سول سرجن رہے اور ان کا شمار صوبے کے مشہور ڈاکٹروں میں ہوتا تھا۔ ۱۸۹۶ء میں گھوڑے سے گرنے سے ان کا انتقال ہو گیا۔

سجاد حیدر یلدرم ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایم اے او کالج علی گڑھ سے بی اے کیا اور الہ آباد یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ بعد میں انہوں نے ایم اے او کالج میں ایل ایل بی میں داخلہ لیا۔ اس دوران وہ نواب اسمٰعیل خاں تعلقہ دار میرٹھ اور راجہ صاحب محمود آباد کے سیکریٹری بھی رہے۔ پھر وہ بغداد میں برطانوی کونسل خانے میں ترکی مترجم کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔

پہلی جنگ عظیم کے کچھ دن پہلے انہیں سابق امیر کابل یعقوب خاں کا اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کر کے ہندوستان بھیج دیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں ان کی شادی نذر زہرا بیگم سے ہوئی۔

امیر کابل کی وفات کے بعد ان کی خدمات یوپی سرکار سول سروس میں منتقل کر دی گئیں۔ ۱۹۲۰ء میں جب ایم اے او کالج مسلم یونیورسٹی بنا تو انہیں اس کا پہلا رجسٹرار مقرر کیا گیا۔ وہ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اعزازی صدر بھی رہے اور ان کا شمار انجمن اردوئے معلیٰ کے بانیوں میں بھی ہوتا ہے۔ ۱۹۲۸ء میں حکومت نے انہیں یونیورسٹی سے بلا کر جزائر انڈیمان نکوبار میں ریونیو کمشنر بنا کر پورٹ بلیئر بھیج دیا۔ واپس آنے پر غازی پور اور اناؤ کے اضلاع میں تعینات رہے۔ ۱۹۳۵ء میں خرابی صحت کی بنا پر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

قرۃ العین کی والدہ نذر سجاد حیدر کی ولادت ۱۸۹۲ء میں صوبہ سرحد میں ہوئی تھی۔ ان کے پردادا معصوم علی مصنف "انشائے معصوم" سلطنت اودھ میں ناظم اور چکلہ دار تھے اور ان کے دادا خان بہادر میر قاسم علی کو پنجاب کے قانون اراضی کی تشکیل و تنظیم کے لئے منتخب کیا گیا۔ نذر کے والد میر نذر الباقر فوج کے محکمہ سپلائی میں بطور ایجنٹ صوبہ سرحد میں مامور رہے۔

شادی سے پیشتر بنت نذر الباقر کے نام سے تہذیب نسواں پھول اور دیگر رسائل میں مضامین لکھا کرتی تھیں۔ ان کا پہلا ناول اختر النسا بیگم ۱۹۰۸ء میں دار الاشاعت لاہور سے شائع ہوا جب کہ ان کی عمر صرف ۱۲ برس تھی۔ ۱۹۱۲ء میں ان کی شادی ہوئی اور وہ نذر سجاد حیدر کے نام سے لکھنے لگیں۔ انہوں نے سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور کئی اسلامی ممالک کی سیاحت بھی کی۔

قرۃ العین حیدر کی ابتدائی زندگی پورٹ بلیئر جزائر انڈیمان میں گزری اور ابتدائی تعلیم انہوں نے دیرہ دون میں حاصل کی۔ پھر وہ لکھنؤ کے مشہور ازابیلا تھوبرن کالج میں داخل ہوئیں اور وہاں سے ۱۹۴۷ء میں انگریزی

میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے گورنمنٹ اسکول آف آرٹس لکھنؤ اور ہیتھرلیز اسکول آف آرٹس لندن میں تعلیم پائی۔

قرۃ العین حیدر نے پہلی کہانی صرف چھ برس کی عمر میں لکھی تاہم ان کی یہ کہانی کہیں شائع نہیں ہوئی۔ (ان کی پہلی تخلیق بی چوہیا کی کہانی بچوں کے اخبار پھول لاہور میں اشاعت پذیر ہوئی جبکہ ان کی عمر تیرہ برس تھی) پانچ سال بعد ان کی کہانی 'یہ باتیں' لاہور کے مشہور رسالے ہمایوں (۱۹۴۲) میں شائع ہوئی۔

۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء کو ان کے والد سید سجاد حیدر یلدرم کی لکھنؤ میں وفات ہوگئی۔ یہ اپنی ابتدائی کہانیوں میں انگریزی کا استعمال کثرت سے کرتی تھیں لہٰذا ایک خاتون نے ان کی کہانی کا سرسری مطالعہ کرتے ہوئے کہا تھا..... آپ انگریزی بہت اچھی لکھتی ہیں اسی طرح میرے بھی صنم خانے میں بڑے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر نے تبصرہ کیا تھا کہ اس کتاب میں سوائے پارٹیوں کے تذکرے کے اور کچھ نہیں ہے۔

تقسیم ملک کے بعد وہ کچھ مدت پاکستان میں سکونت پذیر رہیں۔

۱۹۵۰ء میں وہ پاکستان کی وزارت اطلاعات و نشریات میں انفارمیشن آفیسر مقرر ہوئیں اور لندن میں پاکستان ہائی کمیشن میں پریس اتاچی کی حیثیت سے بھی تعینات رہیں..... وہ ڈاکومنٹری فلموں کے پروڈیوسر کے علاوہ پاکستان کوارٹرلی کے ایکٹنگ ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتی رہیں۔ کچھ دنوں انہوں نے پاکستان ایئرلائنز میں بھی کام کیا۔ اسی اثنا میں ان کا شہرت یافتہ ناول آگ کا دریا شائع ہوا جس پر پاکستان میں ایک بحث و تنازعہ شروع ہوگیا اور پھر چھٹے دہے کے ابتدائی برسوں میں وہ پاکستان سے مستقل طور پر ہندوستان آگئیں۔

۱۹۶۴-۶۸ء کے دوران وہ امپرنٹ بمبئی کی منیجنگ ایڈیٹر رہیں۔

۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۵ء کے دوران وہ مشہور انگریزی ہفتہ وار السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کی مدیر معاون رہیں۔ وہ سنٹرل بورڈ آف فلمز سے بھی منسلک رہیں۔

۱۹۶۷ء میں انہیں افسانوں کے مجموعے پت جھڑ کی آواز پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دیا گیا اور اسی برس ۱۹ اکتوبر کو ان کی والدہ نذر سجاد حیدر کی طویل علالت کے بعد بمبئی میں وفات ہوگئی۔ ۱۹۶۹ء میں انہیں تراجم پر سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ عطا کیا گیا۔

۱۹۸۲-۸۴ء میں وہ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں وزیٹنگ پروفیسر رہیں... ۱۹۸۴ء میں پدم شری اور غالب ایوارڈ ملا۔

۱۹۹۰ء میں انہیں ان کی ادبی خدمات پر ہندوستان کا سب سے بڑا اعزاز گیان پیٹھ ایوارڈ دیا گیا جو اس سے پیشتر اردو میں صرف مشہور اردو شاعر حضرت فراق گورکھپوری کو ہی عطا کیا گیا تھا۔

مطبوعات

افسانوں کے مجموعے

۱۔ ستاروں سے آگے (۱۹۴۷ء)
۲۔ شیشے کے گھر (مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۵۴)
۳۔ پت جھڑ کی آواز (مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۷)
۴۔ روشنی کی رفتار (ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۲)
۵۔ جگنوؤں کی دنیا (انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۹۰)
۶۔ پکچر گیلری
۷۔ کوہ گل فروش (اول دوم)
۸۔ داستان عہد گل

ناول

۱۔ میرے بھی صنم خانے (۱۹۴۹)
۲۔ سفینۂ غم دل (۱۹۵۲)
۳۔ آگ کا دریا (۱۹۵۹)
۴۔ آخر شب کے ہمسفر (۱۹۷۱)
۵۔ کار جہاں دراز ہے (دو جلدوں میں) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۰۔
۶۔ گردش رنگ چمن (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۸)
۷۔ چاندنی بیگم (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۹)
۸۔ شاہراہ حریر (کار جہاں دراز ہے حصہ سوم)

ناولٹ

چار ناولٹ: (۱۹۸۹)
۱۔ دلربا۔
۲۔ سیتا ہرن۔
۳۔ چائے کے باغ۔
۴۔ اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو۔
ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

رپورتاژ

۱۔ ستمبر کا چاند، دو جن بروملی، دفتر حال گذشت (نقوش لاہور)
۲۔ کوہ دماوند (آج کل نئی دہلی)
۳۔ گلگشت (گفتگو بمبئی)
۴۔ خضر سوچتا ہے، یک ہاپی ٹیل: جہان دیگر (آج کل اردو)

ایک لمحے کے لئے دل ڈوب گیا

قرۃ العین حیدر

آج صبح ہی صبح ہماری پیاری بہن نفیس کا فون آیا کہ بھئی تمہارے متعلق وہ مشہور و معروف مضمون تیار ہے۔ ایک لمحے کے لیے دل ڈوب گیا..... پھر خیال آیا کہ مضمون بہت اہم ہستیوں کے لیے لکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ فی الفور کچھ عجیب آسانی خوشی سی محسوس ہوئی۔ قصہ یوں ہوا کہ نفیس کے میاں جو ہیں لیفٹننٹ کمانڈر عسکری ان کا نام ہے۔ اور آپ کچھ ادب وغیرہ سے شغل کرتے ہیں۔ اور دوسرے سارے نہایت قابل اور جینیئس لوگوں کی طرح یہ بھی INCOGNITION رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ تو آپ نے کیا ایک مضمون اس خاکسار کے بارے میں رقم فرمایا (یہ ایک اور عسکری ہیں وہ جو دوسرے والے عسکری صاحب ہیں تو وہ بھلا ہم جیسے حقیر ہستیوں پر کیا مضمون لکھیں گے۔ حالانکہ ڈرتے ڈرتے ایک روز خیال تو آیا تھا کہ ان سے کہا جائے کہ اللہ عسکری صاحب ایک مضمون آپ ہی لکھ دیجیے۔ مگر پھر سوچا کہ کہاں ملارمے اور ریں بو اور کہاں ہم خاکسار لوگ) تو قصہ مختصر یہ کہ اب عسکری (ابن سعید) نے شخصیت نگاری کیا شروع کی۔ کئی دفعہ ان سے کہا تھا کہ بھئی مضمون لکھو خدا کے لیے ہم پر مضمون لکھو۔ ایک وعدہ کیا کہ آئندہ ''ابن سعید سیریز'' کی نظر میں کسی قسم کا ایک مضمون میں بھی لکھ دوں گی۔

بہر حال، تو اب محترمہ نفیس عسکری نے مطلع فرمایا کہ مضمون تیار ہو چکا ہے بس ایک آنچ کی کسر ہے۔

دراصل ہمارے بارے میں اس قدر بھانت بھانت اور انواع اقسام کے مضامین لکھے گئے ہیں کہ ہم بالکل Demoralized ہو چکے ہیں۔ چنانچہ عسکری یعنی ابن سعید نے اور ہم نے طے کیا کہ یہ ہو ہی بہتر ہے کہ گیارہویں Commandment پر عمل کرتے ہوئے اپنی مدد آپ کرو اپنے اوپر مضمون خود لکھو اور کسی دوسرے کو اس کا موقع نہ دو۔ یعنی جو ایکٹوٹی وہ تم پر کیا جانا چاہتا ہے اس سے پہلے کر ہو جائے گا ایکٹوٹی اپنے اوپر خود کرلو۔
پھر سوال یہ بھی ہے کہ اس قدر پریشانی کا ہے کی بقول شاعر:

ع جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈر

یا شاید یہ کہ: ع دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر

بلکہ ایک اور ضرب المثل ہے کہ:..... بہر حال، دراصل شخصیت نگاری یوں کی جاتی ہے کہ:

''موصوفہ ایک شاعرانہ مزاج کی مالک ہیں۔ پھولوں اور قوس قزح سے سخت دلچسپی ہے۔ موسیقی سے الفت، فلسفے کی کتابوں کا مطالعہ کرتی ہیں۔ ان کے گھر کا رنگ ہلکا ہے۔ پردے چینی دریچوں میں جھومتے شگوفے پڑے مہکتے ہیں۔''

ادیبوں کے بارے میں اس طرح کے مضمون پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ زور سے چیخوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس طرح کی ''شخصیت نگاریاں'' اب دیکھنے میں نہیں آتیں۔

عسکری صاحب (یعنی ابن سعید) نے تو بہت شرافت سے کام لیا ہے ورنہ حقیقت حال جو ہے وہ تو ہم ہی پر خوب روشن ہے۔ مثال کے طور پر عسکری نے یہ بھی نہیں لکھا بلکہ صاف چشم پوشی بھی کی کہ ہم نہایت ذوق و شوق سے رسالہ ''شمع'' پڑھتے ہیں اور یہ بھی کہ جب سارے بہن بھائیوں کی محفل میں جمع ہو کر مسلسل ایک چنڈوخانہ بن جاتا ہے تو گھر میں کیا کیا ہنگامہ رہتا ہے۔ ماشاء اللہ سے ایک کمرے میں ریڈیو دھاڑ رہا ہے دوسرے میں چھوٹی بھائی صاحبہ پیانو سے شغل فرما رہی ہیں۔ گیلری میں ''چوبے دوڑ کی آئی'' کھیلا جا رہا ہے برآمدے میں باضابطہ کرکٹ میچ ہو رہا ہے۔ تو ادھر فون کی گھنٹی بج رہی ہے اور کوئی نہیں سنتا۔ سب ایک دوسرے پر حکم چلا رہے ہیں۔ ہماری بڑی بھائی صاحبہ اللہ کے فضل و کرم سے ڈاکٹر ہیں اور میڈیکل فلائٹ لیفٹننٹ کے عہدے پر فائز ہیں۔ مگر ان کا یہ عالم ہے کہ ان کو ڈاکٹری کے علاوہ دنیا بھر کی فضولیات اور خرافات سے سخت دلچسپی ہے۔ جدید انگریزی ادب جاپانی آرٹ، ہندوستانی فنون لطیفہ سے شدید الفت ہے اور کوئی کہے تو آپ عاشق ہیں۔ مکی ماؤس، ٹام اینڈ جیری اور ڈونلڈ ڈک آپ کے پسندیدہ کردار ہیں۔ جب بھی کوئی ان سے ڈاکٹری کی باتیں کرتا ہے تو خیال آتا ہے کہ ارے یہ تو ڈاکٹر بھی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مجھے اپنا احوال رقم کرنے سے پہلے اپنے سارے گھرانے کا احوال رقم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ میں ان سب سے علیحدہ کوئی انوکھی ہستی قطعی نہیں ہوں۔ فنکار، ادیب وغیرہ ابن سعید نے جو سخت عالمانہ الفاظ استعمال کیے ہیں، وہ سب گپ بازی ہے۔ ایک روز ہم حسب معمول گھاس پر بیٹھے رات کے بارہ کا عمل رہا ہوگا۔ نہایت اطمینان سے فکر کو کیڈرا میں منتقل کرنے میں مشغول تھے کہ ایک چھوٹے بھائی نے جو اب مستقلاً کینیڈا میں رہتا ہے اچانک یہ انکشاف کیا (جس طرح ایک انگریز مصنف نے یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ ساری عمر نثر بولتا رہا) کہ ساری عمر ہم لوگوں کی اسی Pitch پر گزری ہے کرکٹ کا Pitch نہیں، بلکہ یہ کہ ہماری زندگیوں میں تقسیم ہند کے کارن زبردست انقلاب آ چکا ہے اور بہر صورت اب اس تبدیلی کی عادت بھی ہو گئی ہے۔ ایک چیز ہم دوسروں میں ہمیشہ تلاش کرتے رہتے ہیں شدید ذہانت اور شدید مزاحی حس۔ فی الحال یہاں دونوں چیزوں کا تقریباً فقدان ہے۔ غالباً ہماری اپنی خصوصیات بھی زیادہ لوگوں کے پلے نہیں پڑتیں (یہ انکشاف بھی کینیڈا والے بھائی نے کیا تھا اور اسی لیے وہ دوسرے لمحے گھاس سے اٹھ کر کینیڈا چلا گیا۔)

میری تین عزیز ترین سہیلیاں جو مجھے سگی بہنوں کی طرح عزیز ہیں اور جن کے ساتھ میں نے بہت بچپنے سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ایک ایک لمحہ اکٹھے بتایا تھا.... ہندوستان میں ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری سہیلیوں کی ایک بہت بڑی فوج بھی تقریباً ساری کی ساری وطن مرحوم ہی میں رہ گئی۔

سہیلیوں سے قطع نظر ہم سب ماشاءاللہ سے اٹھارہ انیس فرسٹ کزن ہیں۔ سیکنڈ تھرڈ فورتھ ففتھ (سلسلہ چینیوں کی طرح آٹھویں کزن تک پہنچا ہے۔ ان کے علاوہ ہمدرد نظر بد سے بچائے ان سب میں ہمارا اپنا ینگ گروپ ہے وہ اللہ کے فضل سے ایک ہی مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ الموڑے میں ہمارے منجھلے چچا جان کا مکان "ٹیکٹ ہاؤس" تھا۔ گرمیوں کے زمانے میں اس میں مستقل اودھم کی وجہ سے ایک زلزلہ سا آیا رہتا۔ شاہجہاں پور میں چھوٹے چچا جان کی کوٹھی کے باغ کے پیچھے سے ٹرین گزرتی تھی۔ ہم لوگ ٹرین آنے سے چند منٹ پہلے پٹڑی پر جا کر پتھر رکھ آتے اور پھر درختوں میں چھپ کر انتظار کرتے کہ اب ٹرین پٹڑی سے اترے گی۔ بالکل دہشت پسندوں کا گروہ تھا۔ اب خیال آتا ہے کہ اگر واقعی کبھی ایسا ہو گیا ہوتا تو کیا ہوتا غالباً سب کو جیل خانے بھیجا جاتا۔

یہ سب بڑے ہو کے تو اسے لیجیے ایک سے ایک عالم فاضل چلا آ رہا ہے..... دو بہنوں نے یونیورسٹی کے سارے ریکارڈ کھٹا کھٹ توڑ ڈالے۔ خیال میں جو بہن بھائی ہیں ان کا بھی یہی سلسلہ ہے۔ ایک نوجوان خاتون نے مانچسٹر یونیورسٹی میں ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی کی ڈگری لی۔ ایک بزرگوار بہت بڑے سیاست داں بن گئے۔

بہت کم کنبوں میں اتنا زیادہ قبیلے کا احساس ہوتا ہے اس کی وجہ غالباً وہی تربیت اور وہ مخصوص تہذیبی پس منظر ہے جس کا ذکر میں نے یلدرم کے متعلق مضمون میں کیا ہے۔ ہمارا کنبہ اب بہت دور دور بکھر گیا ہے۔ کچھ افراد سان فرانسسکو میں ہیں۔ کچھ لندن میں بہت سے اپنے آبائی وطن ہندوستان ہی میں رہتے ہیں۔

بعض دفعہ مجھے خیال آتا ہے بھانت بھانت کی جگہوں پر رہے بھانت بھانت کے انسانوں سے ملے بھانت بھانت کی عمر کھپتی رہی۔ بچپن رومانٹک ماحول سے پر رہا۔ اتر پردیش کے ہرے بھرے ضلع ترائی کے جنگل، ہمالیہ کی چوٹیوں پر بسنے والی معروف اور غیر معروف بستیاں، سب سے پہلی یاد جو ہے وہ جہاز کے سفر کی ہے کہ بس تیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ بمبئی کلکتہ جنوبی ہند کی بندرگاہیں، برما ان کے ساحل، گویا بچپن کا بیشتر حصہ مستقل ادھر سے ادھر گھومتے رہے ہیں۔

پہلی کہانی عمر چھ سال لکھی۔ (ہاں صاحب! کیا بات ہے ہونہار بروا) کہانی کچھ یوں تھی کہ کاٹھ گودام کا اسٹیشن تھا۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ قلی لالٹین لیے ادھر اُدھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ جگنوؤں کی قطاروں کی طرح ٹرین آتی دکھلائی پڑی"..... وغیرہ وغیرہ۔ ماشاءاللہ کس قدر شاعرانہ تخیل تھا...... یعنی غور کیجیے کہ جگنوؤں کی قطاریں۔

پھر مدتوں تک گڑیوں کا بہت سخت سلسلہ رہا۔ گڑیاں ہی گڑیاں ان کے لیے باقاعدہ اسکول کھلوا گیا تھا۔ ایک جرمن ٹیچر نے سمجھا بجھا کر آمادہ کیا کہ "لیڈی ہیلڈا" سے اس کے گڈے کا بیاہ کر دیا جائے۔ آئیڈیا کچھ جچا نہیں۔ مگر اس کی دل شکنی کے خیال سے مان گئے۔ عین برات کے وقت جرمن لڑکی جو تھی اس نے کسی بات پر بگڑ کر کہہ دیا کہ بہرحال میرا گڈا خالص جرمن ہے۔ سید عابد حسن سے آ رہا ہے۔ تمہاری "لیڈی ہیلڈا" گولڈ ہے۔ مگر تمہاری گڑیا ہے تو ہندوستانی ہے۔ اس قدر غصہ آیا کہ فوراً برات واپس لوٹا دی گئی۔ عرصے تک شدید اینٹی جرمن جذبات دل میں موجزن رہے۔

اسپورٹس اور ریاضی سے جان نکلتی تھی۔ اسکول اور کالج میں کبھی جو باسکٹ بال کھیل کر دیا ہو...... فساد کرانے میں بڑا لطف آتا تھا۔ بیک وقت دونوں پارٹیوں میں شامل ہیں اور فساد کرا رہے ہیں۔ بعد میں خود ہی صلح کرا دی۔ اس وجہ سے کالج کی سیاسیات میں ہم کو بہت ہی اہم مقام حاصل تھا۔

اب یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ سب سے بڑی ٹریجڈی جو ہوئی وہ یہ تھی کہ اسی مستقل ہنگامے کے چکر میں بغیر سوچے سمجھے جو کہانیاں وغیرہ کالج کے رسالوں کے لیے لکھتے تھے وہ ادبی رسالوں میں چھپوا دیں۔ یہ ایسی ایکٹوٹی ہوئی جسے آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔ کسی عقلمند آدمی نے انگریزی میں کہا ہے:

LITERARY SINS HAVE VERY LONG SHADOWS

یہ بہت ہی حسب حال مقولہ ہے۔ یعنی یہ کہ اب بیٹھے اس قسم کا روح افزا تبصرہ سن رہے ہیں۔

ایک خاتون ہماری کتاب کی ورق گردانی کر کے نہایت اطمینان سے بولیں..... "آپ انگریزی بہت اچھی لکھتی ہیں"...... اور اس روز تو مجھے بہت ہی کوفت ہوئی جب میں نے کرشن چندر صاحب کی (جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے) یہ رائے پڑھی کہ..... میرے بھی صنم خانے میں سوائے پارٹیوں کے تذکرے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اسے لیجیے یہاں ہم نے تو اپنی طرف سے ایک عظیم انسانی ٹریجڈی کی داستان قلمبند کی تھی۔ کرشن چندر صاحب نے لے کے ایک جملے میں نہایت خوش اسلوبی سے قصہ مختصر کر دیا..... اب آپ ہی بتلائیے کہ کیا کیا جائے۔

اپنے اور اپنے قبیلے کے متعلق اس "فٹ نوٹ" کا اضافہ کرنے کے ساتھ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ واضح رہے کہ ہم لوگ بہ خود غلط نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں اکثر و بیشتر لوگوں کو اپنے متعلق بڑی غلط قسم کی اہمیت کا احساس ہے..... ہمارا جو معاشرہ ہے، جس طرح ہمارے ذہنوں کی تشکیل کی جاتی ہے اور جو ہمارے یہاں کے موجودہ حالات ہیں ان کی وجہ سے لوگ یا تو احساس برتری کا شکار ہیں اور یا احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ ہر فرد کسی نہ کسی طرح کے complex میں گھرا ہوا ہے۔ normal کوئی بھی نہیں رہنا چاہتا اور میں ان لوگوں کو بہت قابل قدر سمجھتی ہوں جو ہر ماحول اور ہر موقع پر نارمل رہتے ہیں۔

رہی ہماری "شخصیت" تو بھئی یہ تو ایک بڑی وحشت قسم کا خوفناک لفظ ہے۔ شخصیت تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور بیگم رعنا لیاقت علی خاں کی ہوتی ہے۔ ہم اور ہماری "شخصیت"...... یہ کیا تک ہوئی بھلا

براہِ راست

محترمہ قرۃ العین حیدر کا نام اردو ادب کے اعتبار اور وقار کا معتبر نام ہے جس قدر وسعت اور تنوع خیالی آپ نے اردو ادب کو بخشی ہے اس کی دوسری مثال ملنا شاید اب میں ایک مرکز ادب کی کامیابی تھی نہ ہے.....! زیر نظر انٹرویو مارچ 2005ء کے سفر دہلی کے دوران محترم حضرت محمود دہلوی جناب تحسین سرور اور ملک زادہ جاوید صاحب کی مرہونِ منت وساطت میں کیا گیا ہے جس کے لیے ہم محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ کے ساتھ تینوں محترم احباب کے صدق دل سے ممنون ہیں...... !!! یہ انٹرویو ایک اتفاقی اور اتفاقی ملاقات تھی جس کا ثمر قارئین "چہارسُو" کے لیے تحفۂ اتفاقیہ اور یہ لذت کا مال ہوا چاہیے.....!!!

گلزار جاوید

☆ آج کل آپ کے روز و شب کس طرح صرف ہوتے ہیں؟

☆☆ ہم نے تو زندگی کے قیمتی ماہ و سال لکھنے پڑھنے میں صرف کر دیئے۔ اس کے علاوہ آتا ہی کیا ہے کہیں۔ آج کل بھی حسب توفیق لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔

☆ کس زبان کا ادب زیر مطالعہ رہا کرتا ہے؟

☆☆ جہاں بھی اچھا ادب دستیاب ہو ضرور پڑھتی ہوں۔ اس میں زبان یا علاقے کی قید ہرگز نہیں ہے۔ ادب سے ہٹ کر بھی میری دلچسپی کے مضامین جہاں دستیاب ہوں وہ بھی ضرور پڑھتی ہوں۔

☆ آپ کے خیال میں اردو زبان اپنی عمر کے کس مرحلے میں ہے؟

☆☆ ہندوستان، پاکستان کے علاوہ جہاں جہاں اردو بولنے والے ہیں وہاں وہاں اردو کا چلن فطری بات ہے مگر یہ کہنا کہ فرانس، برطانیہ یا امریکہ میں اردو پھل پھول رہی ہے بالکل غلط ہے۔

☆ اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ آپ اردو کی نئی بستیوں میں اردو کے مستقبل سے پُر اُمید نہیں ہیں؟

☆☆ دنیا فانی ہے ہر کسی کو ایک نہ ایک دن رخصت ہونا ہے۔ پھر جو لوگ ریٹائر ہو کر اپنے اپنے ملکوں میں واپس آ جائیں گے اُن کی آل اولاد اردو سے کس طرح رشتہ و تعلق برقرار رکھ سکے گی؟

☆ ایک طرف یہ صورت حال ہے جب کہ بہت سے پُر جوش حلقے اردو کو دنیا کی تیسری بڑی زبان گردانتے نہیں تھکتے؟

☆☆ ہر کسی کو اختیار ہے جو چاہے رائے قائم کرے۔ میں نے البتہ کبھی یہ رائے قائم نہیں کی کہ "اردو" دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ میرے خیال میں چائنیز اور انگلش کے بعد اسپینش، جرمن، سپینش کے بعد اردو کا نمبر رکھا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔

☆ بھارت میں اردو کے مستقبل کی بابت آپ کا حسن ظن کیا ہے؟

☆☆ خوبصورت اصطلاحوں اور رنگین محاوروں سے اردو کا مستقبل ہرگز روشن نہیں ہوگا۔ جب تک ہم اردو بولتے رہیں گے تب تک تو ٹھیک ہے مگر موجودہ نسل یعنی ہماری نسل کے لوگ اپنے بچوں کو اردو نہیں سکھائیں گے تو یہ کیسے آگے چلے گی؟ عربوں کی نئی نسل کو اس قدر عربی نہیں آتی جس قدر اُن کی پرانی نسل کو آتی ہے۔ میرے خیال میں کم از کم دو نسلوں تک تو ہندوستان میں اردو کو برقرار رہنا چاہیے۔

☆ آپ کو کبھی اردو کی ادیبہ اور فنکار ہونے پر تنگ دامنی یا ملال کا احساس نہیں ہوا؟

☆☆ اللہ میاں نے مجھے جاپان میں پیدا کیا نہ برطانیہ میں، جہاں پیدا ہوئی، جس زبان میں آنکھ کھولی، جس میں لوری سنی اسی زبان میں لکھتی ہوں اور لکھتی رہوں گی۔ کسی طرح کا احساس کمتری میرے نزدیک کبھی نہیں پھٹکا۔

☆ ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مغربی مصنفین کے مقابل شہرت، نام و نمود کے حوالے سے کسی طرح کا قلق کبھی دل میں جاگزیں نہیں ہوا؟

☆☆ نہیں مجھے کبھی ایسا خیال نہیں آیا، میں جہاں، جس حال میں ہوں خوش ہوں۔ ادب کی ترقی میں ادیب کی ترقی پنہاں ہوتی ہے۔ ملک کے حالات کے ساتھ زبان بھی بدلتی ہے۔ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟ آپ کے بچوں کو اردو آتی ہے کیا؟ نئی زبان ترقی یافتہ ہونے کی نشانی انگریزی بولنا ہے۔ آپ بھی اس روش پہ چل رہے ہیں اور ہم بھی اس سے چھٹکارا نہیں کر سکتے۔

☆ ترقی پسندی کا لیبل بھی آپ کی ذات سے مدت تک منسوب رہا ہے؟

☆☆ میرے خیال میں یہ بہت پرانی بات ہے کوئی نئی بات کیجئے۔

☆ ہم یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ آج اس نظریے کی بابت آپ کے خیالات کیا ہیں؟

☆☆ ابن انشا نے اچھی بات کہی تھی کہ صاحب اگر یہ کہا جائے کہ سب انسانوں کو برابری کی سطح پر روٹی، روزی، دولت یا خوشحالی ملنی چاہیے تو اس میں ترقی پسندی کی کونسی بات ہے یا کسی سے کچھ دریافت کرنے کی ضرورت کیا ہے؟

☆ آپ کے خیال میں اس نظریے کو شکست ہوئی ہے کہ نہیں؟

☆☆ کمیونزم کے عروج و زوال سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ 1969ء میں روس کے حالات مجھے اچھے لگے تھے۔ 1974ء میں بھی وہی حالات تھے اگر یہ کہا جائے کہ آزادی اظہار رائے نہیں تھی تو یہ اُن کا مسئلہ ہے میں نے کبھی کسی سے دریافت نہیں کیا۔

☆ بہت سے قارئین اور ناقدین آپ کی تخلیقات پر مغربی ادب کے چربے کا الزام دھرتے ہیں؟

☆☆ جس کا جو دل چاہے کہے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ آپ جو چاہیں رائے قائم کریں یہ آپ کی مرضی ہے کسی چیز کو اصل ماننے پر آپ لوگ تیار کب ہوتے ہیں۔ چربے کا الزام آپ نے کس پر نہیں لگایا؟ پریم چند منٹو پر بھی چربے کا

الزام لگتا رہا۔ بڑی سادہ سی بات ہے کہ آپ جو سوچ رہے ہیں وہی لکھتے جائے
ہیں۔ میں بھی جو سوچتی گئی لکھتی گئی۔ آپ کی مرضی ہے اُسے سراہئے یا تلف سے ملا
دیجئے یا کسی اور سے ریجیکٹ کر دیجئے۔ ایک آدمی روس میں بیٹھا ہے ایک چین
میں ایک امریکہ میں بیٹھا ہے ان کی سوچ میں تھوڑی بہت مماثلت تو ہو سکتی ہے
ہو بہو نہیں ہو سکتی۔

☆ یقیناً آپ کا استدلال درست ہے اردو ادب کے بہت سے حصے
پر مغربی ادب کے چربہ کا الزام بھی لگتا رہا ہے؟

☆☆ یہ 1936ء کے قریب کی بات ہے جب ترقی پسندی کے حامل
پڑھے لکھے لوگوں نے انگریزی ادب کا مطالعہ شروع کیا تھا میرے خیال میں یہ
الزام اُسی وقت کے لوگوں سے منسوب تھا جو بنیادی طور پر ثابت نہ ہوا۔

☆ انسان ایک وقت میں ایک سمت میں دو مختلف عمل کا مرتکب ہو تو
یقیناً ایک درست اور ایک غلط تصور ہوگا۔ آپ کا پاکستان جانا اور پھر لوٹ آنا کس
امر کا غماز ہے؟

☆☆ یہ میرا خالص ذاتی معاملہ ہے میں آپ سے دریافت نہیں کرتی
ہوں کہ آپ کہاں رہتے ہیں اور کیوں رہتے ہیں؟

☆ فنکار جب پبلک پراپرٹی ٹھہرتا ہے تو اُس کا کوئی عمل کیونکر ذاتی ہو
سکتا ہے؟

☆☆ بھئی جب میں پاکستان گئی ہوں اُس وقت ہم سب لوگ ہنگاموں
میں پھنسے ہوئے تھے اس لئے پاکستان جانا پڑا۔ میں پاکستان سے پہلے انگلینڈ گئی
بعد میں انڈیا آ گئی۔ معاملہ سارا یہ ہے کہ میں ایک خاتون ہوں۔ ہمارے
معاشرے میں کوئی خاتون اپنی مرضی سے کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی اگر میں نے اٹھا
لیا تو قیامت برپا ہو گئی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ لوگ اس حوالے سے
میرے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں تو دونوں ملکوں میں کوئی
فرق نہیں سوائے ہندوستان میں آزادیٔ اظہار کے۔

☆ ایک خیال یہ بھی ہے کہ آپ ڈکٹیٹر ضیاء کے کنٹوپ سے خوفزدہ ہو کر
پاکستان سے واپس چلی آئیں؟

☆☆ جانے یہ بھی دنیا والے کیوں گڑے مردے اکھاڑتے ہو! ہماری تو خیر
ہے تمہیں واپس پاکستان بھی جانا ہے کیوں اپنے پنکھ اڑوانے پر تلے ہوئے
ہو۔

☆ تقسیم ہند کی بابت آپ کی اُس وقت کیا رائے تھی اور آج کیا ہے؟

☆☆ تقسیم کے بارے میں کیا رائے دوں، لاکھوں کتابیں لکھی گئی ہیں
اس موضوع پر یہ بات پرانی ہو چکی ہے جو لوگ ہندوستان سے پاکستان چلے گئے
یا پاکستان سے امریکہ، برطانیہ وغیرہ چلے گئے اُن سے اب کیا دریافت کریں کہ وہ
وہاں کی شہریت کے لئے ائیرپورٹ پر کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ ہمارا کمپلیکس اور
اُن کا رعب ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتا۔ میرے خیال میں تو پورا خطہ ہمارے
بزرگوں کی وراثت ہے جس کا کوئی جہاں چاہے ہے۔

☆ انڈو پاک کے کچھ ادبی لوگ اپنے اپنے ادب کی بابت بہت سی
خوش فہمیوں بلکہ غلط فہمیوں میں بھی گرفتار ہیں؟

☆☆ اس طرح کی بیوقوفانہ باتوں میں آپ نہ پڑیے۔ یہ تو بچوں والی
بات ہے۔ ادب ہے بھی دیکھئے!! جہاں افسانہ اچھا لکھا جا رہا ہے وہ اچھا ہوگا۔
جہاں شاعری اچھی کی جا رہی ہے وہ اچھی ہو گی۔ روشنی اور خوشبو کہیں کی بھی ہو
اچھی ہوا کرتی ہے یہ چھپائے نہ چھپتی ہے نہ دبانے سے دبتی ہے۔

☆ برصغیر کے چند ایسے نام جو آپ کے خیال میں اُمید افزا ادب تخلیق
کر رہے ہیں؟

☆☆ آپ کیوں مجھے پھنسوانے کی باتیں کر رہے ہیں! بہت سے لوگ
اچھا ادب لکھ رہے ہیں۔ نام لے کر سب کی نشاندہی میرے لئے ممکن نہیں۔

☆ اپنی تخلیقات کی نسبت ناقدین کی بابت آپ کے احساسات کیا
ہیں؟

☆☆ بھئی میں کیا کروں! ہار پھول پہناؤں ناقدین کو؟

☆ آپ نے جس قدر لکھا اور جس معنویت سے لکھا آپ کے دور
کے ناقدین نے اُسے اُسی طرح سمجھا ہے کہ نہیں؟

☆☆ جن لوگوں نے سمجھا۔ جن لوگوں نے نہیں سمجھا اُن کی اپنی مرضی اور
بصیرت پر منحصر ہے۔ میں اس بحث میں نہیں پڑتی۔ ہم اپنا کام کر رہے ہیں نقاد
اپنا کام کرتے رہیں گے۔ بات ساری کمیونیکیشن کی ہوتی ہے اگر آپ کا رابطہ
اپنی سطح پر درست نہیں تو وہ بات اُس تک نہیں پہنچے گی جن تک آپ پہنچانا چاہتے
ہیں ویسے بھی آج کل پڑھے لوگوں کا طبقہ کم ہوتا جا رہا ہے۔

☆ بہت سے احباب آپ کی تنک مزاجی کو غرور و نخوت سے تعبیر کیا
کرتے ہیں اُن کے خیال میں آپ مدِ مقابل کو بڑی چابک دستی سے
Demoralize کر دیتی ہیں؟

☆ اس طرح کے لوگوں کی بابت اظہار خیال کر کے میں آپ کا اور اپنا
وقت برباد نہیں کرنا چاہتی۔ بہرحال اطلاع ہے کہ آپ کی آمد اور اس گفتگو میں آپ
کے سوال کا جواب پنہاں ہے۔

☆ ایک سوال یہ بھی بحث طلب ہے کہ قاری کو رائٹر کی سطح تک جانے
کے بجائے رائٹر کو قاری کی سطح پر آ کر لکھنا چاہئے تا کہ اردو ادب کی قبولیت میں
اضافہ ہو سکے۔

☆☆ جس کا دل جو چاہے وہ کیے مگر کوئی یہ بھی تو بتلائے کہ رائٹر عوامی سطح
پر کیسے آئے اور کیونکر آئے؟ جو افسانہ عوامی رسالہ میں چھپ رہا ہے اُس کو تو وہی
لوگ پڑھیں گے جو اُن کی اپج ہے۔ گلشن نندہ کا کس کس کے لئے لکھتا تھا۔ کاغذ
ختم ہو گیا تھا مگر اُس کی کتاب فروخت ہونا بند نہ ہوئی تھی۔ کیا اُس ادب کا سنجیدہ
ادب میں کوئی مقام ہے؟

گل فشانی

تحریک اشتیاق — مصطفےٰ ملک

نظر نہ آئی اور آگ نے اس بے زور پکڑا کہ محمود کے ختم کرنے کے بعد جو چیلا نے اپنا کام چلانے کے لئے سارے کا سارا فرنیچر تو شک بری کے کمرے میں رکھوا دیے تھے اور گھر میں کاغذات "نیوز پرنٹ" کے گٹھے اور کتابیں رسالوں کے انبار موجود تھے۔ گیس سلنڈر بھی جو چیلا نے شوقیہ کچن بنوا کر اس میں لگایا تھا۔ واقعات کی اس زنجیر کو علت و معلول بھی کہا جا سکتا ہے اور مقدرات بھی۔

اسی سوختہ زمین پر کہانی آگے بڑھتی ہے لیکن ناقدین اور بہت پڑھے لکھے قارئین شاکی ہیں کہ ہیروئن کو شروع میں مار ڈالا تو کہانی وہیں ختم کر دینی چاہئے تھی۔

جس طرح ہندوستانی عوام کا ڈرامہ وفلم پسند کرتے ہیں ہمارے اہلِ دانش بھی کیا ڈرامہ ناول پڑھنا چاہتے ہیں؟ یعنی اگر ہیروئن شروع ہی میں چل بسی تو کہانی آخر تک کیسے چلے گی؟ لیکن سینما کے ناظرین مطمئن بیٹھے رہتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ موت غلط فہمی ہے ہیروئن پھر نمودار ہو جائے گی۔

تو اگر چاندنی بیگم آخر تک زندہ نہیں رہتی تو وہ ہیروئن نہیں ہے اور اگر مرکزی کردار نہیں ہے تو ناول کا نام چاندنی بیگم کیوں؟

اور ایک ہیروئن نہیں تو کیا پانچ ہیں؟ یا کوئی ان میں سے اپنی ہیروئن ہے؟

(ایوانِ اردو اکتوبر ۱۹۹۱ء)

★

میرے لیے "نوابی طبقے کی نوحہ خوانی" کا جو لیبل یہی حضرت اس تیکھی نوک سے لگا گئے ہوں وہ حقائق کی بیہودگی اور بیہودہ سر فکر کو منتقل ہوتا گیا.... چنانچہ چاندنی بیگم کی خالص عصری مسائل کی کہانی بھی ان کو ماضی کی نوحہ خوانی معلوم ہوئی کیونکہ وہ ماضی کو حال سے مربوط دیکھنا نہیں چاہتے۔

(ایوانِ اردو اکتوبر ۱۹۹۱ء)

★

ایک اور کہانی "دریں گرد سوارے باشد" ۱۹۸۰ء کے مراد آباد کے فسادات کے متعلق تھی۔ امروہے کے ایک فرضی کردار کلو خاں رکشے والے کے اجداد نواب محمد رضا خاں نائب ناظم بنگال بہار اڑیسہ کے غلام تھے۔ دو سو سال بعد بھی کلو خاں خستہ حال ہی رہے۔ وہ نواب محمد رضا خاں کی گھڑ پوتی کو اپنی سائیکل رکشہ پر بٹھا کر ایک گھر میں امام زین العابدینؑ کے تبرکات کی زیارت کے لئے لے جاتے ہیں ان تبرکات میں سے ایک تلوار کے لئے مشہور ہے کہ جب کوئی بہت بڑی آفت آنے والی ہو اس کی سطح پر دھبے سے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد شہر مراد آباد میں خوں ریزی ہوتی ہے اس میں خاکروبوں کے رول کا تذکرہ اخباروں میں بھی آتا ہے جب خاکروبوں کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے تو چند بے انتہا تیز دست فرقہ پرست کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ کلو خاں جن کو تپ خون پیدا ہو چکی ہے اور رکشا نہیں چلا سکتے امروہے سے مراد آباد آ کر "کلو حلال خور" بن جاتے ہیں۔

"دریں گرد سوارے باشد" میں مراد آباد کی ظروف سازی اور

دھرے سارے اشارے بہت ہی صاف صاف موجود ہیں۔

(ایوانِ اردو اکتوبر ۹۰ء)

★

ایک مشہور ناقد نے مجھ سے اعتراضاً کہا تھا کہ "آخر شب کے ہم سفر" جیسا ناول نہیں ہے آگ کا دریا کو ڈاکیومنٹری ناول نہیں کہا گیا کیونکہ یہ اصطلاح اس وقت یہاں تک پہنچی نہیں تھی۔ کار جہاں دراز ہے کو بھی مغربی تنقید کے بہت سے نظریوں کی کسوٹی پر کسا گیا۔ پورا نہ اترا کیونکہ نت نئی جیسا اس وقت تک ناول بھی شاید کسی نے نہیں سنا تھا۔ بالآخر فیصلہ یہ کیا گیا کہ Non-Fiction اسے Roots نے انسپائر کیا ہے۔ حالانکہ وہ Roots کی اشاعت سے پہلے لکھا گیا تھا۔ اس کہانی کی داغ بیل میں نے والدہ کی وفات کے چند روز بعد ہی ڈال دی تھی اور مدتوں بعد اس پر باقاعدہ کام شروع کیا۔ یہ میری والدہ کی ادبی روایت تھی جنہوں نے ۱۹۳۲ء میں اپنے حالات زندگی بڑے دلچسپ انداز میں ۱۹۰۷ء سے بطور روزنامچہ لکھنے شروع کیے تھے .....

اسے بھی ایک سوانح عمری انتہائی غیر دلچسپ انداز میں لکھی جا سکتی ہے اور ناول کے پیرائے میں بھی۔ اس میں کون سی ناقابل فہم یا قابل اعتراض یا بحث طلب بات تھی....؟

چونکہ ناقدین کے سفر پورا نہ لے نہ سوانحی ناول کا فن تکنیک دیا نہ خود نوشت سوانح حیات کا۔ چند سوانح عمریوں پر پی ایچ ڈی کرنے والے کا بیڑ اس کے مطالعہ کی ضرورت نہیں سمجھے۔

(ایوانِ اردو اکتوبر ۹۰ء)

★

زمین اور اس کی ملکیت اس پہلو دار ناول کا بنیادی استعارہ ہے جو پہلے باب کے تعارفی پیراگراف سے لے کر آخری صفحے تک موجود ہے اس کے ساتھ ہی ارتقا کا عمل، تیز تغیر، تبدیلی، تخریب و تجدید و تعمیر اور فطرت سے انسان کے اٹوٹ سمبندھ کی اشاریت خاصی واضح ہے۔

(ایوانِ اردو اکتوبر ۹۰ء)

★

میں نے تو یہ "مونولوگ"، دروں ذات کا انعکاس، شعور کی رو اور تجریدی خیال آرائی وغیرہ سے ان دنوں استفادہ کیا تھا جب ۱۹۴۰ء میں میری کم عمری کا زمانہ تھا۔ اس طرح دیکھئے تو ان رجحانات کی ابتدا مجھ سے ہوتی ہے تاہم اب تک کسی نے بھی اس حقیقت کو بیان نہیں کیا ہے۔ "ستاروں سے آگے" میں میری کہانیاں اسی نئے پن کا عکس پیش کرتی ہیں ان میں ایسے تمام خیالات ملتے ہیں جو اردو میں دوسری نسل کا موضوع بنے۔ میرے لئے تو اب یہ سب کچھ قصہ پارینہ ہے میں بہت پہلے ہی ان مراحل سے گزر چکی ہوں اور یہ سب کچھ میں نے لاشعوری طور پر کیا تھا۔ فیشن کے طور پر نہیں۔

(انٹرویو "سکریتا پال" (علم و فنکار کراچی))

★

میں تنہائی پسند نہیں ہوں اور نہ تنہائی کا واویلا میرا مسئلہ ہے۔

میرے لئے اہم مسئلہ یہ ہے کہ میری تخلیقات فعال اور زندہ اور یقین دہانی کے معاملے میں نمایاں کردار ادا نہیں کر سکیں ان کی طرف سے عموماً ایک طرح کی لاپرواہی برتی گئی ہے۔ اس سے یہ متعوم نہ لیجئے کہ مجھے نقادوں کی ضرورت ہے

(انٹرویو سکریتا پال (علم و فکار کراچی) ۱۹۸۸)

☆

جب ہم لکھنے بیٹھتے ہیں تو تکنیک خود بخود وارد ہوتی ہے اس کے لئے ضروری نہیں کہ لکھنے والا اس پر پہلے سے سوچے۔ ایک موسیقار کے ساتھ تو یہ مشکل ہے کہ ایک راگ کے لئے خواہ وہ تکنیک میں کوئی بھی تبدیلی کرے بنیادی اصولوں سے انحراف ممکن نہیں لیکن میرے لئے یہ مشکل نہیں ہے کوئی بھی مختصر سا منظر یا کوئی امیج جو میری یادوں میں موجود ہو مجھے تحریک دیتا ہے اور میں لکھنا شروع کر دیتی ہوں تکنیک خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ میرا ناول گردش رنگ چمن اس کی مثال ہے میرے ذہن میں ایک منظر تھا میری والدہ تعلیم کے فروغ کی حامی تھیں اور ان خواتین سے جو تعلیم یافتہ ہوں خصوصاً وہ جو باہر سے پڑھ کر آئی ہوں مل کر بہت خوش ہوتی تھیں۔ ایک زمانے میں کوئی خاتون انسپکٹر آف اسکول بن کر لکھنؤ آئی تھیں میری ماں مجھے ساتھ لے کر ان سے ملنے گئیں ان کا گھر پر ہجوم درختوں کے اندر چھپا ہوا تھا۔ یہاں دو خواتین اور وہ درمیانی عمروں والی غیر شادی شدہ بہنیں تھیں ان میں سے کم عمر بہن بہت جاذب نظر تھی انسپکٹر تھی اور انگلستان میں رہ چکی تھی اور ظاہر ہے کہ اس دور کے لئے یہ سب کچھ ایک عجوبہ تھا یہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے گھر کے اندر جنگلے ہیں پر مٹی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے برتن رکھے تھے۔ بزرگ خاتون نے بتایا کہ یہ برتن اس نے ان دنوں بنائے تھے جب انگلستان میں' جب وہ آرٹس اسکول سے وابستہ تھیں۔ یہ سارا منظر میرے ذہن میں محفوظ ہو گیا اس کے بعد ان لوگوں سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی کافی عرصہ بیت گیا اور جب میں نے گردش رنگ چمن پر کام شروع کیا تو اس کی ابتداء لکھنؤ کے ایک گھر کی دو خواتین سے ہوئی مگر یہاں وہ ماں بیٹی کے کردار میں تھیں وہ انگلستان میں رہ چکی تھیں لڑکی ڈاکٹر ہے جس کے بارے میں ماں بتاتی ہے کہ جس زمانے میں وہ تعلیم حاصل کر رہی تھی میں نے یعنی ماں نے یہ تصویریں بنائی تھیں۔ اب آپ دیکھئے کہ کس طرح ادیب کے لئے یہ واقعہ یا اس قسم کا کوئی واقعہ ابتداء کا محرک بن جاتا ہے تھیم اور تکنیک کے بارے میں بیٹھ کر سوچنے کی کوئی ضرورت مجھے نہیں محسوس ہوتی۔ میں نے فوراً لکھنا شروع کر دیا اور پلاٹ خود بخود بنتا چلا گیا۔ اس ناول میں چونکہ میں نے کئی حقیقی لوگوں کو شامل کر لیا ہے اس لئے میرے نزدیک یہ نیم دستاویزی ناول ہو گیا ہے۔

(انٹرویو سکریتا پال (علم و فکار کراچی) ۱۹۸۸)

☆

تقسیم ہند کے صدمے نے ۱۹۴۷ء کے آخر میں مجھ سے 'میرے صنم خانے' لکھوائی جو آج بھی اردو کی چند اچھی ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ذہنی

جلاوطنی نے مجھے بہت پریشان کیا ہے انیسویں صدی کے ادیبوں کے لئے یہ مسئلہ جمالیاتی تھا۔ آج کے ادیبوں کے لئے یہ مسئلہ سیاسی بن چکا ہے۔ سارتر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ادیب اس لئے لکھتا ہے کہ تخلیق میں ایک چیز کا رشتہ دوسری چیز سے قائم کر سکے لیکن آج کے دور میں ادیب اور دنیا کے درمیان بہت سی چیزیں دیوار بنا دی گئی ہیں..... کارل مارکس کا یہ نقطہ نظر ہے کہ انسان سماج کی ایک اکائی ہے اور وہ اس سے علیحدہ نہیں رہ سکتا...... کافکا کا کہنا ہے کہ انسان بنیادی طور پر اکیلا ہے........ ان دونوں متضاد نقطہ ہائے نظر نے سارے جدید ادب کو متاثر کیا ہے

(مضمون سے اقتباس)

☆

جہاں تک انسان کی بات ہے میں زیادہ نہیں سمجھ پائی ہوں۔ اس کا ذہنی تجزیہ میرے لئے ناقابل حصول ثابت ہوا ہے۔ ہم سب لوگ ذاتی طور پر ادھورے سلسلے ہیں۔ ہر انسان کی شخصیت کے اندر کتنی تہہ در تہہ شخصیتیں ہیں' کتنے پہلو ہیں' کتنے ان دیکھے اور اجنبی راز ہیں۔

میں نے زندگی کی لامحدود وسعتوں کو لی پر جی بھر کے قہقہے بھی لگائے ہیں اور جی بھر کے روئی بھی ہوں۔ مجھے بہت سی خوشیاں بھی ملی ہیں اور بہت سے غم بھی۔ میں خوش ہوتی ہوں تو ساری دنیا کی خوشی میں اپنے آپ کو شامل کرتی ہوں لیکن دکھ موت کی طرح ایسا تجربہ ہے جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ ہم اپنی لاشوں کو کاندھوں پر اٹھائے گھوم رہے ہیں۔ ہمارے سامنے اپنی اپنی صلیبیں الگ الگ گڑی ہیں اور ہم ان سے برابر کرب پاتے رہتے ہیں۔

(انٹرویو سے اقتباس)

☆

میرے سامنے مسئلہ Communication کا تھا۔ میں نے محبت' نفرت' مذہبی کٹر پن اور بے رخی کے بارے میں بہت غور کیا۔ انسان کی انسان کی جانب بے رخی انفرادی اور اجتماعی طور پر۔ بے رخی کے ساتھ تقسیم کا مسئلہ پھر سامنے آ گیا کہ ملک تقسیم کیوں ہوا.....؟ اس سوال نے مجھے فلسفہ اور تاریخ کی طرف کھینچا۔ اس کا جواب دینے کی کوشش میں میں نے ناول "آگ کا دریا" لکھا....

(تقریر سے اقتباس)

ابرِ کرم

علیمہ بگٹی...... وقار جاوید

نواب صاحب الماری کھول کر کتابوں کا جائزہ لینے لگے۔ دیپالی نے دریچے سے باہر جھانکا۔ ریحان نے کہا تھا (یوسف کج نے کہا تھا) آج سے دو سو برس قبل تک بہت سے بنگالی صوفی کور کھدے جیسا سوں کی کتابیں لکھتے تھے اور شنوپد گاتے تھے۔ بہت سے صوفیوں کے سلسلے تنترک یوگ تک کے ہم شکل تھے۔ بنگالی خانقاہوں میں ایک اچھا خاصا "مسلم یوگ سادھنا" تخلیق ہو چکا تھا۔ مدار شاہ کے فقیر اور ہندو یوگی تقریباً ایک جیسے تھے۔ اور سیداری فقیر اور ہندو سنیاسی ۱۷۷۰ء کے بھیانک قحط کے بعد کمپنی کی افواج سے لڑتے بھڑتے پھرے تھے۔ اور ریحان نے بتایا تھا کہ ایک مرشدی شاہی فقیر کا سلسلہ تھا۔ جن کے گرو سید مرتضیٰ آنند نے یوگ قلندر اور شنوبھجوں کی ایک کتاب لکھی تھی۔ ایک شادی شدہ برہمن زادی ان پر عاشق ہو کر ان کی چیلی بن گئی تھی۔ اس کا نام آنند مالا دیوی تھا۔ اسی لئے وہ مرتضیٰ آنند کہلاتے تھے۔ مثال کے طور پر ریحان نے کنکار کر اضافہ کیا تھا۔ جس طرح اس خاکسار کو باؤل فقیر سید ریحان دیپالی کہا جائے گا۔ دریچے میں کھڑے کھڑے دیپالی کو یہ بات یاد کر کے ہنسی آ گئی۔ ریحان نے کہا تھا اب سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے سارے باؤل منشی عشق مجازی اور عشق حقیقی اور انسانیت کے عشق کے متعلق کیا گاتے پھرتے تھے؟ شیخ مدن باؤل، شتولن شاہ، حسن رضا، لالن شاہ، پھر ٹیگور کا رونیش جس کی شاعری اور موسیقی نے اتنی شدت سے گرودیو کی شاعری اور موسیقی کو متاثر کیا۔ کیا یہ مشترک ورثہ نہیں؟ اور دیپالی نے خود اپنے گاؤں میمن سنگھ میں دیکھا تھا کہ پیر صاحب فقیر جو مسلمان تھے۔ منتر پڑھ کر اور گھنٹیاں بجا بجا کر مسلمان کسان کی مرادیں پوری کرنے کا جتن کرتے تھے۔ اور مسلمان کسانوں کے یہاں شادی کے موقع پر منگل چنڈی دیوی کی رسم ادا کی جاتی تھی۔ خود ریحان کا نام صرف دونو میاں تھا۔ دونو ہندوؤں کا نام بھی تھا۔ کیا یہ سب تہذیبی مماثلت یا اتحاد کے بے حد سطحی مظاہر ہیں یا ان کے پیچھے کوئی ایسی گمبھیر تاریخی، نسلی اور نفسیاتی معنویت بھی پنہاں ہے جو سیاسی تبدیلیوں سے بلند تر اور ماورا رہے گی؟ دیپالی بہت زیادہ الجھ کر دریچے سے مڑی۔ نواب صاحب الماری بند کر کے لکھنے کی میز کی طرف جا رہے تھے۔

(آخرِ شب کے ہم سفر)

☆

ہمارے دماغ خالی ہیں، ہماری روحیں خالی ہیں، ہم کچھ سوچنا نہیں چاہتے کچھ سمجھنا نہیں چاہتے ہماری آواز میں اپنی آوازیں نہیں ہیں، ہماری آوازیں کہیں گم ہو گئی ہیں، ہم سرگوشیوں میں بھی کچھ نہیں سن سکتے، ہم اپنے دلوں سے بھی باتیں نہیں کرتے، وہ جو اسی طرح آنکھیں کھولے کھولے اندھیرے کے اس پار دیکھتے گئے، ان کی پلکوں میں ہماری تصویریں اسی طرح رہ گئی ہیں، جس طرح اب ہم تمہارے سامنے کھڑے ہیں، لیکن تمہاری آنکھوں میں کاجل ہے اور مسکراہٹ ہے اور تم یہاں سے جا کر یہاں کی خاک اور گرد اپنے سفید چینی کے ٹائلوں والے غسل خانوں میں دھو ڈالو گی، اور شام کو چائے کی میز پر بیٹھ کر اگلے روز کا پروگرام بناؤ گی۔

(میرے بھی صنم خانے)

☆

..... خدا حافظ ..... انہوں نے کہنا چاہا..... خدا حافظ برطانیہ کی کرسٹابل اور بن ..... ہم تمہارے آگے بہت شرمندہ ہیں۔ ہم تمہارے جلانے کے لئے لالہ رخ اور عفران منزل کے صوفوں پر بیٹھے بیٹھے جی بھر کے تمہاری قوم کو گالیاں دیا کرتے تھے، اب تم جا رہی ہو، اس لئے کہ ہم نے تمہیں نظر انداز کر کے خود ہی ایک دوسرے کو گالیاں دینی شروع کر دی ہیں، لیکن کرسٹابل اور بن ..... انہوں نے کہنا چاہا..... جب تم اپنی ہری وادیوں اور کینٹ کے مرغزاروں میں حفاظت سے واپس پہنچ جاؤ تو ہمیں بیٹھ کر اس کی امداد بھیجتے ہوئے (اور یہ امداد مل رہی ہے بفضلہ تعالیٰ..... عدیم) ہمارے لئے اپنے خدا سے دعا کرنا کہ اے خدا انہیں معاف کر یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں..... لیکن کرسٹابل اور بن! بڑا افسوس یہ ہے کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں، پچھلے کئی برسوں سے یہ جانتے چلے آئے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا......

(میرے بھی صنم خانے)

☆

کہتے ہیں اس مٹی پر بیٹھ کر، اس برہم پتری ندی کے کنارے اس قدیم امام باڑے کے سائے میں جب کہ سورج آہستہ آہستہ ڈوبتا جا رہا ہے اپنا اپنے آبا و اجداد کا مرثیہ لکھوں گی؟ کیونکہ ہم بے عمل ثابت ہوئے۔ ہماری نسل اس بار کو نہ اٹھا سکی جو بلاسیاں تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے ہمیں سونپا تھا۔ ہم تمہارے معیاروں پر جو انسانیت اور شرافت اور تہذیب کے معیار تھے پورے نہیں اتر سکے اور اس لیے اب ہم جا رہے ہیں۔

(سفینۂ غمِ دل)

☆

یہ پاکستان کی عجیب ترین مخلوق ہے، اور ہندوستان سے آئی ہے اور ملک کے ہر شہر قصبے اور قریے میں پائی جاتی ہے۔ کراچی اس کا ہیڈکوارٹر ہے اس جماعت کا خاص ریکٹ کلچر ہے..... یہ قوم مہاجر بن کر پاکستان آئی۔ یہاں انکشاف ہوا کہ ہندو سے تو چھٹکارا ملا مگر ایک اور مصیبت کا سامنا درپیش تھا۔ لاہور میں پنجابی تھا، ڈھاکہ میں بنگالی..... یہ لوگ "جنگ"، "انجام" اور ڈان

بڑھتے ہیں۔ کشمیر حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ سال میں ایک مرتبہ ویزا ہوا کر خاندان کے بچے کچھ افراد سے ملنے ہندوستان جاتے رہتے ہیں۔ جس کو اب تک یہ "گھر" کہتے ہیں۔ یعنی گھر دراصل سندیلہ یا مراد آباد ہے ملک پاکستان ہے۔

(آگ کا دریا)

☆

پاکستان میں جو نفسا نفسی کا عالم ہے اور حب وطن کی کمی نظر آتی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ مسلمان کو اس سرزمین سے کوئی بے اختیار جذباتی یا روحانی لگاؤ نہیں۔ وہ موقع اور سیکورٹی کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔

(آگ کا دریا)

☆

ہند پر اب مغل شہنشاہوں کا راج ہے پرانا قصہ ہو چکا ہے گوڑ اور لکھنوتی اور پنڈوا اب خواب و خیال ہوئے ترکوں کی دلی کا بھی خاتمہ ہوا۔ دلی اب مغلوں کی ہے۔ لیکن وہ کسان موجود ہے۔ وہ جو گھٹنوں تک پانی میں جھکا دھان کی فصل بو رہا ہے۔ وہ جو بیلوں کی جوڑی ہانکتا ندی کے کنارے کنارے جا رہا ہے۔ وہ بھاگرتی کی سطح پر کشتی کھیتا اور گیت گاتا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کی سمت رواں ہے۔ وہ مرشدوں اور بھکشوں کے قدموں میں بیٹھا کیرتن اور حرف الاپ رہا ہے۔
بنگال کا کسان ابو المنصور کمال الدین زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

(آگ کا دریا)

☆

"کشمیر؟" ایک انگریز تماشائی نے پوچھا۔
"کشمیر۔ یہ ہمارے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے" روشن نے کہا۔
"یہ لوگ جو گا رہے ہیں کون سے کشمیر سے آئے ہیں۔ مقبوضہ یا آزاد؟" تماشائی نے سوال کیا۔
"دونوں طرف کا کشمیر ایک دوسرے کے لیے آزاد اور مقبوضہ ہے" گلشن نے کہا۔
تل خاموشی سے پائپ پیتا رہا۔
پھر بنگالی گاتے ہوئے آئے۔
"یہ اتنے جوش و خروش سے گا رہے ہیں۔ کیا یہ دہشت پسندوں کا گروہ ہے؟" ایک نوری اخبار کے نمائندے نے پوچھا۔
"یہ .....؟ دونوں بنگال کے رہنے والے ہیں" طلعت نے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔
اب ڈھولک بج رہی ہے۔
"پنجاب؟" ایک اور اخبار نویس نے پوچھا۔
"ہاں۔ پنجاب بھی دو ہیں" قریب بیٹھے ہوئے سر ریکھا کے میاں گلشن آہوجہ نے اسے تلخی سے جواب دیا۔ "اور سوال کرو۔ میں تمہاری معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کروں گا۔"

(آگ کا دریا)

☆

ایک سیاسی پارٹی کا کہنا تھا کہ مسلمان علیحدہ قوم ہیں۔ ان کی روایات کے ڈانڈے شرق وسطیٰ سے ملے ہیں۔ ہندوستان سے انہیں کوئی مطلب نہیں۔ دوسری سیاسی پارٹی کا کہنا تھا کہ اس ملک کی اصلی قوم ہندو ہیں۔ مسلمان غیر ملکی ہیں۔ "گلستاں" کے شاگرد پچھم میں رہنے والی مرزا پور کی قمرن اور رام دیا سے اس مسئلے پر کسی نے رائے نہ لی کہ ہندوستان کے اصلی باشندے تم لوگ ہو۔ اس مسئلہ پر تمہاری کیا رائے ہے۔

(آگ کا دریا)

☆

ایک پرانی کتاب میرے ہاتھ آ گئی جس میں انیسویں صدی کے مولویوں کے جہاد کا تذکرہ تھا..... لکھا ہے مغل بادشاہوں اور صوبیداروں نے رام گھاٹ اور دوسری جگہوں پر مسجد بنوائیں۔ جب مندر گرے تب بھی ایک ہندو جوگی اس کے درخت کے نیچے جھنڈی گاڑے بیٹھا رہا۔ واجد علی شاہ کے عہد میں ہندوؤں نے پھر اس جگہ پر ٹھاکر دوارا بنانے کی کوشش کی۔ بڑا فساد ہوا فوج کشی ہوئی۔ فرنگی محل کے علماء نے جہاد کا فتویٰ دیا۔ مجاہدوں کے لشکر پہنچے۔ بڑا خون خرابہ ہوا۔ مولویوں نے لشکر کشی سے پہلے سلطان عالم کو عرضی بھیجی۔ جو نظم کی صورت میں تھی (یہاں ناول کی وہ نظم نقل کی گئی ہے جس میں مولویوں نے لکھا تھا کہ اگر مندر کی تعمیر نہ رکی تو سنیچر کو لشکر اسلام برائے غارت کا راج شہر لچھمن و رام روانہ ہوگا) یہ ایک عجیب بات ہے کہ سلطان عالم واجد علی شاہ نے بجائے اس کے کہ وہ عرضی داشت پر کان دھرتے انہوں نے الٹا مجاہدین کی سرکوبی کے لیے شاہی فوج فیض آباد بھیجی اور مجاہدین لڑتے ہوئے سرکاری سپاہیوں کے ہاتھوں مارے گئے یا شہید ہوئے اور اودھیا میں امن قائم ہوا۔ یہ واقعہ ۱۸۵۵ء کا ہے..... یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ سلطان عالم کو انگریزوں نے تخت سے اس لیے اتارا کہ وہ سلطنت کا انتظام اچھی طرح نہیں کر رہے تھے۔ پروفیسر میں کس سے نفرت کروں۔ انگریزوں سے جنہوں نے میرے لیے بے قصور بادشاہ کو معزول کیا یا اس کلر کو بادشاہ سے نفرت کروں جو ہندو دیو مالا کا عاشق تھا۔ کرشن اور راجہ اندر کا سوانگ بھرتا تھا اور مسلمان مجاہدین کو قتل کرواتا تھا۔ ان مجاہدین سے متنفر ہوں جو لچھمن اور رام کے پُرامن خوبصورت شہر کا راج

کرنے جا رہے تھے یا ان ہندو جوگیوں کو دور دراز ٹھہراؤں جو گھاٹ پر دھیان
ہو ان کا منتر رٹنا چاہ رہے تھے اور میں کس کو حق بجانب ٹھہراؤں۔

(آگ کا دریا)

☆

اے معزز انسانوں میری بہترین معلومات کے مطابق تم نے
انسانی ترقیوں کا پورا دفتر اعداد و شمار کے واسطوں اور سیاسی سماجی فارمولوں سے
حاصل کیا ہے ..... تمہاری ترقیاں ہیں' خوشحالی' دولت' آزادی' امن اور وغیرہ
وغیرہ...... اب اگر کوئی شخص جو مثال کے طور پر تمہارے اس علم کے خلاف
جائے یا اس کی مخالفت کرے تو وہ یا تو ظلمات پسند کہلائے گا یا دیوانہ.... لیکن تم
جانتے ہو کہ سب سے خطرناک امر کیا ہے ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب یہ تمام
ماہرین اعداد و شمار اولیا اور عاشقان انسانیت انسانی ترقیوں کے دفتر کھولتے ہیں
تو عام طور سے ایک کو چھوڑ دیتے ہیں؟ معزز دوستو حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز
ضرور موجود ہے جو ہر آدمی کو اپنے عظیم ترین فوائد سے بھی زیادہ عزیز ہے.... اس
کی اہمیت اس میں ہے کہ وہ تمام وجہ بندیوں کو توڑتی ہے عاشقان انسانیت کے
بنائے ہوئے نظاموں کو بکھیر دیتی ہے نوع انسان کے فائدے کے لیے..... یہ
ایک شخص کے آزادانہ بھلا انتخاب کرنے کا حق.... آدمی جو چاہتا ہے وہ محض
آزادانہ انتخاب ہے' اس کی قیمت اُسے کچھ بھی دینی پڑے اور نتائج کچھ بھی
نکلیں.... البتہ انتخاب کی آزادی صرف شیطان ہی جانتا ہے کہ کیا ہے.....

(آگ کا دریا)

☆

ہمارا اور تاریخ کا آخر آپس میں رشتہ کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے۔ ہم
مسلسل جرم و سزا کے مسئلے کا سامنا کرتے رہتے ہیں۔ ماضی کی پرچھائیں ہم کو کیا
پڑتی ہے میری قوم نے جو جرم کیے ہیں یا کر رہی ہے بحیثیت فرد کے مجھے ان کی
سزا بھگتنا ہوگی۔ بحیثیت فرد میں جو جرم کروں گی اس کا خمیازہ میری قوم کو اٹھانا ہو
گا۔ کیونکہ خیال میں بڑی طاقت ہے اور میں پروپیگنڈے کی مشینری کے ذریعے
اپنے خیالات کا پرچار کر کے بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ جو کچھ آج اس لمحے تک ہوا
اس کا اثر مجھ پر پڑا ہے۔ جو کچھ میں سوچ رہی ہوں اس کا کفارہ آنے والی نسلیں
ادا کریں گی۔ میری وجہ سے یہ دنیا تباہ ہوگی یا پر مسرت۔

(آگ کا دریا)

☆

اگر جناح صاحب نے پاکستان نہ بنایا ہوتا تو آج بنگلہ دیش بھی نہ
ہوتا۔

مدر انڈیا کا تصور بھی بالآخر ہندوستان کے قوم پرستوں کو دہشت پسند
ہندو بنگالیوں نے دیا تھا جو تحریک پسند کالی کے روپ میں دھرتی کی پوجا کرتے تھے
اور دیس ماں کے قدیم دراوڑی تصور کے پرستار تھے۔ اور ان ولیمن دہشت
پسندوں میں جن کو انگریزوں نے ٹریٹ کیا اور ہندوستانیوں نے انقلابی کا فی
اچھی مسلم بھی تھے اور بنکم چندر کا آنند مٹھ ان کا آدرش تھا اور 'بھدرا لوگ' کی
سیاست اور 'مسلم اشراف' کی سیاست کے Cross currents نے
پاکستان بنایا اور پاکستان کی سیاست نے بنگلہ دیش اور انفرادی طور پر مختلف لوگوں
کی شخصیتوں اور کرداروں اور مزاجوں اور اعمال و افعال Cross
currents کے اثر سے افراد اور قوموں کی زندگیاں بنتی اور بگڑتی رہیں۔

(آخر شب کے ہمسفر)

☆

یہ جو بعض احباب کا قول ہے کہ مذہب اسلام میں قطع علائق ممنوع
ہے اکابر صوفیا رہبانیت مسیحی و ویدانت ہنود سے متاثر ہوئے۔ ہمارے نزدیک یہ
نظریہ چنداں صحیح نہیں۔ کس واسطے کہ جب اُمتِ رسولؐ کے حاکموں نے طور
طریق شاہانِ عجم کے اختیار کیے۔ خود کو ہمسرِ خسرو و دارا کیکاؤس و فغفور کے
حاشیہ بردار مظالم غربا پر کرتے تھے تب آخر اولیاء نے اقتدار پرستی کے خلاف
ایک تحریک کیا شروع کی اور ہم جو نسل سے آخر صوفیا کی ہیں ارکان دولت میں
شامل ہو کر داخل طبقہ امرا ہوئے لبادے کار چوبی طلا سے مغرق زیب تن
کرتے تھے۔ ہاتھیوں پر سوار ہوتے تھے شیخین اور اولیاء کی ترقی اور اعجاز روحانی
کو بھولے تھے اور سراسر فراموش کر چکے تھے کہ ملوکیت و شہنشاہیت کے معاملات
عبرتناک ہیں۔

(کارِ جہاں دراز ہے)

☆

اللہ کے بندوں نے حمد و مناجات' عبادت و خدمتِ خلق میں
زندگیاں تمام کر دیں۔ نہ دنیا کے دو جوڑی نہ سلسلۂ علت و معلول' اور فرشتے ہیں
کہ لکھے چلے جاتے ہیں' ناحق پکڑواتے ہیں۔ پلٹ کر بندۂ خدا کسی سے نہیں پوچھتے
کہ میاں تم اشعریہ تھے یا معتزلہ' یا لاادری' جبریہ ہو یا قدریہ' مومن ہو یا ملحد'
کیونکہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک ہوونگ تھر ہے جو کھلا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

(کارِ جہاں دراز ہے)

☆

اماں مجھے گوٹے کے بچے والا فراک پہنا کر لے جاتیں۔ تقریبوں میں
پہننے کے لئے میرے پاس وہ ایک ہی فراک تھا۔ سر پر گوٹے کی ٹوپی اوڑھا دیتیں'
آنکھوں میں خوب سا کاجل لگاتیں۔ ہم لوگ ہمیشہ دروازے کے پاس جوتیوں
کے ڈھیر کے نزدیک بیٹھتے تھے۔ اماں مجھے گانے کے لئے کھڑا کر دیتیں۔ بیچاری
کبھی مجھے شوق سے گواتیں کبھی بری طرح جھڑکتیں اور چپ ہو جاتی۔ بات
کرنے دے اور میں سہم کر اماں کی گود میں جا بیٹھتی۔ ہم نوکروں کے ساتھ کھانا

کھاتے اہلِ ہوا نی دوپٹے میں شیر مال اور کباب باندھ کر گھر بھی لے آتیں یا
باہر مردانے میں نقلیں کرتے کبھی جانوروں کی بولیاں بولتے۔

(چاندنی بیگم)

☆

آزادی کے بعد دونوں ملکوں میں نیا دولت مند طبقہ ابھرا حصولِ زر
جس کا واحد آدرش تھا اور جو ہر قسم کی تہذیبی و اخلاقی اقدار سے بے بہرہ اور بے
تعلق تھا۔ شراب نوشی، فیشن ایبل عیاشی اور ریاکاری کے اس عظیم الشان ہور نے
اُن کی روایات کو ختم کیا۔ جس کے آگے بے چاری راحت کا شائی بھی ماند پڑ گئی۔
اب راحت اور فرحت کا ٹائپ انوکھا نہیں رہا تھا۔

(چائے کے باغ)

☆

اس سوال کا جواب مجھے نہ ملا کہ آخر اس ذاتِ مطلق نے دنیا بنائی
ہی کیوں۔ یہ پلا کس لئے رچائی آخر؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ مہاتما بدھ بھی دراصل
ایک مرتبہ افیم کھا گئے تھے، نروان وغیرہ سب اسی کا نتیجہ تھا اور اگر پانچ منٹ کے
لئے فرض کر لو کہ آپ سے آپ ارتقا ہو گیا.... تو ارتقا بھی کیوں ہو جائے....؟
کوئی تک تھی؟ وجہ تھی....؟

(چائے کے باغ)

☆

تمہارے مذاہب، فلسفے، اخلاقیات، نفسیات..... وہسکی کا گلاس
میز پر پٹخ کر زور سے ہنسا "تمہاری دیومالائیں، نظریۂ تثلیث، روحانیت، یہ وہ
سب محض ناسائنٹفک ہیں۔ تمہاری جنگیں ہیومنزم پر مبنی ہیں۔ تمہارا اینٹی کلیرزم بھی
خالص انسان دوستی ہے...... ہنسا؟.... تمہاری روشنی کی رفتار واقعی تیز ہے؟

(روشنی کی رفتار)

☆

میں اس عجیب روشنی میں سفر کرتا ہوں جو زمین کی روشنی ہے نہ
آسمانوں کی، جو انوارِ الٰہی کی سات روشنیوں سے مل کر بنی ہے۔ سفر کر زندہ بھی
سے مر چکے ہیں اور مردے زندہ ہیں۔
اور یہ کہ...... "سوالے کا کاتب شاہ نجف نے فرمایا ہے جو کچھ
لکھا گیا ہے ہو کر رہے گا۔

(قلندر)

☆

چھوٹی بٹیا! برسوں رات میں نے بہت سے پوشیدہ ڈھانچے اپنی
الماری میں سے نکالے، ان کو جھاڑا پونچھا اور انہیں الماری میں دوبارہ مقفل کر
دیا۔ میں نے اپنی لاش کا خود پوسٹ مارٹم کیا اور اسے زندگی کے مردہ خانے میں
برف کی سلوں کے دبا دیا۔

(ہاؤسنگ سوسائٹی)

☆

اور میں نے سوچا کہ یہ بات ہے...... کہ ہر جگہ..... مندروں
اور تیرتھ استھانوں میں، درگاہوں اور مزاروں کے سامنے گرجاؤں اور تمام
باڑوں اور تیرتھ گرجا گھروں اور آتش کدوں کے اندر..... یہ عورتیں ہی ہیں جو رو
رو کر خدا سے فریاد کرتی ہیں اور دعائیں مانگتی ہیں۔ ساری دنیا کے معبدوں کے
سرد بے حس پتھر عورتوں کے آنسوؤں سے دھلتے رہتے ہیں۔ عورتوں نے ہمیشہ
اپنے اپنے دیوتاؤں کے چرنوں پر سر رکھا اور کبھی یہ نہ جاننا چاہا کہ اکثر یہ پاؤں
مٹی کے بھی ہوتے ہیں.....
..... عورتیں اتنی پرستار، اتنی پجارنیں کیوں ہیں؟ اس لئے کہ وہ
کمزور ہیں؟ اور سہارے کی حاجت مند ہیں؟ اس لئے کہ وہ اس مختصر سی زندگی
میں بہت سے لوگوں سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں.....
..... آخر عورتیں خدا کی اس قدر ضرورت مند کیوں ہیں۔

(یاد کی اِک دھنک جلے)

☆

وسط شہر میں مہاجنوں، ساہوکاروں اور زمین داروں کی اونچی
حویلیاں تھیں۔ یہ لوگ سرکاری خزانوں میں ہزاروں روپیہ چندہ دیتے، اسکول
کھلواتے، مجرے، مشاعرے اور دنگل کرواتے۔ جلسے جلوس اور سیر پھول بھی انہی
کی زیرِ سرپرستی منعقد ہوتے۔ ہندو مسلمانوں کا معاشرہ بالکل ایک تھا۔ وہی رنگ
تیوہار، میلے ٹھیلے، محرم، بالے میاں کی بارات۔

(جلاوطن)

☆

"ہم بیکتاشی محض دعا نہیں کرتے۔ خانم تم نماز پڑھتی ہو؟...
سیدھی سادی نماز؟ ہم نماز پڑھنے کو دار منصور پر چڑھنا کہتے ہیں۔ میں روز دار
منصور پر چڑھتا ہوں اور مرتا ہوں۔ اور زندہ ہوتا ہوں۔ چونکہ تم ایسا کبھی نہ کرو
گی تمہیں کچھ معلوم نہ ہوگا۔ میں روزانہ خواہشات کو باندھتا ہوں اور قناعت کو
کھولتا ہوں۔ خدا امام ہے کیونکہ جو قوم ہے تب میں نے ذرا بے ادبی سے
کہا آخر ہم آپ کو سپاہیہ کے حاجی یوسف بیکتاشی کا نام یاد ہے۔ پندرھویں صدی
عیسوی میں وہ علیہ الرحمۃ اناطولیہ میں موجود تھے۔ جب مسلمانوں پر تیمور ٹوٹا ان کا
اور ان کے مریدوں کا صبر و رضا کسی کام نہ آیا۔ حاجی سلیم نے میری بات کا مطلق
نوٹس نہ لیا اور کہتے رہے میں انوارِ الٰہی کی روشنی میں سفر کرتا ہوں۔ میں ننانوے
اسمائے الٰہی کی روشنی میں چلتا ہوں۔ خوشبو، رنگ، سرخ ہے، اور سبز اور جو
سیاہ ہے اور وہ وجود جس کی ذات میں روشنی نہیں۔" حاجی سلیم بیکتاشی کی گفتگو ختم
ہوئی۔

(حاجی گل بابا بیکتاشی)

سفینۂ غمِ دل

وارث علوی

زیرِ نظر مضمون پروفیسر وارث علوی صاحب نے ۱۹۵۲ء میں تحریر فرمایا تھا۔ "قرطاسِ اعزاز" میں اس مضمون کی شمولیت کا مقصد ابتدائی سفر میں محترمہ قرۃ العین پر لکھی گئی تنقید سے قارئین کو متعارف کرانا ہے۔

ادارہ

قرۃ العین حیدر ایک عرصے تک اردو میں بحیثیت افسانہ نگار مقبول رہیں ان کے افسانوں میں ہمیں پہلی بار تلازمِ خیال کی تکنیک کا کامیاب استعمال ملتا ہے لیکن یہ تکنیک اور وہ منفرد اسلوب جو قرۃ العین کے افسانوں کے ساتھ مخصوص ہے ماحول اور فضا کا طائرانہ نظر سے جائزہ لینے میں مدد دے سکا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے مطالعے سے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تمام تر صناعانہ چابکدستی فنی مہارت اور تکنیکی صلاحیت کے اظہار کا بہترین ذریعہ مختصر افسانہ ہی ہے اور ان کا اسلوب اور تلازمِ خیال کی تکنیک اس سے زیادہ وسیع میدان میں شاید اتنی کامیاب نہ ہو۔ لیکن یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ قرۃ العین کے ناول ان کے افسانوں سے بھی زیادہ کامیاب ہیں اور آج وہ اردو کے ممتاز ناول نگاروں میں شمار کی جاتی ہیں۔ اس وقت تک ان کے دو ناول نکل چکے ہیں 'میرے بھی صنم خانے' اور 'سفینۂ غمِ دل'۔

یہ بھی ہمارے ادب کی کچھ کم ستم ظریفی نہیں کہ جس ادیب سے ہم کچھ توقعات وابستہ کرتے ہیں وہ بڑے اطمینان سے اسے کچل دے جاتا ہے قرۃ العین کا دوسرا ناول 'سفینۂ غمِ دل' ہماری ان توقعات کو پورا نہیں کرتا جو ان کے پہلے ناول کی بنا پر ہم نے ان سے وابستہ کی تھیں۔

ناول میں جس زمانہ کی مصوری قرۃ العین نے کی ہے اس کا وقار عظیم نے ان الفاظ میں اجمالی جائزہ لیا ہے "وہ (زمانہ) ہندوستان کی سیاست اور معیشت کے لئے بڑے انتشار اور بڑی تباہی کا زمانہ تھا۔ گول میز کانفرنس، عدم تعاون، بائیکاٹ۔ انگریز کے اقبال کا زوال، معاشرے کی طبقاتی سیڑھیوں کا شدید احساس، اچانک بے روزگاری۔ عوامی محاذوں کا قیام، جدوجہد بلند عزم۔ جوان ارادے اور مستقبل کے سہانے خواب۔ اس سیاسی خلفشار میں ہندو اور مسلمان گھرانوں میں لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کا چرچا۔ اس حد تک لڑکیاں امتحانوں میں اول آنے لگیں۔ پھر شعر کہنے پیانو بجانے کے ذوق کی پرورش.... یہ تو عام انداز زندگی تھا۔ لیکن اس عام انداز نے تہذیب و تمدن کے ان گہواروں پر بھی اپنا سایہ ڈالنا شروع کر دیا تھا جہاں صدیوں سے صرف روایت کی پاسبانی کو زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھا جاتا تھا۔ تہذیب و تمدن کا یہ گہوارہ لکھنؤ تھا جس میں ایک طرف بدلے ہوئے نظامِ زندگی نے نوجوانوں میں "انگارے" اور "لندن کی ایک رات" کو محبوب بنایا تھا۔ اور ان علمی مشاغل سے ہٹ کر سلکی ہنگامے، دعوتیں، پارٹیاں، ڈنکی کے پیک، پیانوؤں کی گتیں، فاکس ٹراٹ اور سول میرج کے اسکینڈل ایک طبقہ کی یہ زندگی تھی۔ اور دوسرا طبقہ اب بھی ناسخ اور غالب کے ایک ایک شعر پر بحث کرتا تھا اور سر دھنتا تھا فسانۂ آزاد اور اودھ پنچ کو اپنی لائبریریوں کی زینت بناتا۔ افیون کی پینک میں چین جاپان کے معرکوں کا ذکر چھیڑتا بٹیروں اور کنکووں کے معرکے لڑاتا اور بی ماچھے کا فرض ادا کرنے کے لئے نیلم کے دانوں اور فرشی پاجاموں کا سلسلہ کھٹ بھٹی کے ہاتھ بیچتا تھا۔"

تھوڑے بہت فرق کے ساتھ یہی ماحول 'میرے بھی صنم خانے' کا ہے لیکن سفینۂ غمِ دل میں اس ماحول کی عکاسی میں جو کمی نظر آتی ہے وہ جیسا کہ وقار عظیم آگے چل کر بتاتے ہیں صرف اس گہرائی کی ہے جو ادب اور صحافت اور اس لئے ناول اور کسی ہلکی پھلکی تخلیق میں امتیاز پیدا کرتی ہے، اس ماحول کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کرنے میں قرۃ العین بری طرح ناکام رہی ہیں مختلف طبقوں اور خاندانوں کی جھلکیاں محض سطحی ہیں اور وہ کسی سطحی مطالعہ کا سوا کچھ نہیں پہنچاتیں مثلاً کاظم رضا کے قدامت پسند خاندان کی ترجمانی ان کی جاگیر اور ان کی حویلیوں کا ذکر کسی حیات آمیز اور بصیرت افروز مرقع کو ترتیب نہیں دیتا بلکہ ادنیٰ درجے کے صحافتی تقاضوں ہی کو پورا کرتا ہے یہی حال قرۃ العین کے اپنے خاندان کی ترجمانی کا ہے یہ ترجمانی بھی محض ایک مجرد اور جزوی شکل رکھتی ہے اور ناول کی مجموعی ہیئت کا لاینفک عنصر نہیں بن پاتی۔ ناول کے اکثر واقعات مجرد حیثیت رکھتے ہیں اور باہم منسلک ہو کر کسی مسلسل اور مربوط کل کی تشکیل نہیں کرتے۔ ناول میں بعض بہت ہی اونچے طبقے کے لوگوں کا ذکر ہے، مہاراجاؤں، راجاؤں اور اونچے عہدوں پر فائز سامراج کے نمائندے انگریزوں کا طبقہ، لیکن اس طبقے کے ذکر میں قرۃ العین کی نظر خاموش ہے اس طبقہ کی مکاریوں کا پردہ چاک کرنے میں ان کا قلم پس و پیش کر رہا ہے۔ اور اگر کسی جگہ ان کی سطحیت زوال اور ارتقا جیسی کی سرگرمیوں کا ذکر آ بھی جاتا ہے تو اس پر ابہام کا ایسا غبار چھایا ملتا ہے کہ ہر چیز دھندلی، ناقابلِ شناخت اور مہمل ہو جاتی ہے ہم ان کے اس نظر کے منتظر رہتے ہیں جو ان کے افسانوں میں اکثر سامراج اور اپنے طبقہ کی روبائی اور اخلاقی تہی مائیگی پر ملتا ہے۔ اس ناول میں اپنے طبقہ کی آئینہ داری میں وہ سچائی اور صداقت بھی نہیں جس کی بنا پر ہم ان کے سطحی نظریات سے قطع نظر اس تصنیف کے متعلق تھوڑے بہت فرق کے ساتھ وہ رائے قائم کر سکتے جو

مارکس نے بالزاک، لینن نے ٹالسٹائی اور گورکی نے دوستووسکی کے متعلق قائم کی تھی۔

ناول کے واحد متکلم کے بارے میں یہ شبہ بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ چند کردہ ہے نہیں ہے۔ جیسے کرسٹوفر کی ایکری تھی اور گریز کے تھیم کے بارے میں ہوسکتا ہے اس طرح ناول خود نوشت سوانح حیات کی ایک جھلک بن گیا ہے یہ بات بذات خود اتنی معیوب معلوم نہ ہوتی اگر اس میں عام انسانی دلچسپی کے تجربات، مشاہدات اور عناصر سموئے جاتے۔ ان اجزا کا فقدان ناول کو ایک خاندان کا روزنامچہ بنا دیتا ہے۔ قرۃ العین نے اپنے شخصی تجربات اور ذاتی مشاہدات میں کوئی عمومیت پیدا نہیں کی۔ اس کو میں ایک مثال سے واضح کروں گا۔ ناول میں سجاد حیدر یلدرم کا ذکر اور ان کی غیر متوقع موت کا بیان بہت پُرخلوص اور صداقت پسند ہے اور اس کے ایک ایک لفظ سے محبت اور عقیدت کے جذبات ہویدا ہیں۔ لیکن اُن کا یہ بیان ایک بیان واقعہ کی حدود سے آگے نہیں بڑھتا اور کسی ایسے انسانی تجربہ کو نمایاں نہیں کرتا جس سے اُس میں آفاقی قدروں کی روح تڑپنے لگے۔ یلدرم کا کردار خاندان اور ذاتی تعلقات کے دائرہ میں محدود رہتا ہے اور ناول کا ایسا ضروری اور لازمی جزو نہیں بن پاتا۔ جس کا ہونا یا نہ ہونا ناول کے مجموعی ارتقاء کو متاثر کر سکے۔ یلدرم کی موت ایک کردار کی موت سے زیادہ ایک باپ کی موت ہی رہتی ہے۔ اور اس سانحہ سے قاری میں وہ جذباتی تموج پیدا نہیں ہوتا جس سے خود قرۃ العین دوچار ہوتی ہیں اس کے برعکس ہم سامرسٹ ماہم کے ناول Bondage of Human جو ناول ہی کے فارم میں مصنف کی سوانح عمری ہے کہ ہیرو فلپ کی داستان میں فلپ کی ماں سل کے مرض میں مبتلا ہے وہ قریب المرگ ہے اسے اس بات کی سخت فکر ہے کہ مرنے کے بعد اس کے بچے اس کی شکل و شباہت سے بھی واقف نہ ہوں گے۔ چنانچہ وہ کپڑے پہنتی ہے۔ کنگھی کرتی ہے اور اس بیماری کی سخت حالت میں بھی جب کہ ڈاکٹر نے اسے چلنے پھرنے سے منع کیا ہے فوٹوگرافر کے یہاں جاتی ہے اور تصویریں کھنچاتی ہے۔ ماہم کی کتاب Summingup سے پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعہ خود اس کی ماں سے تعلق رکھتا ہے لیکن ماہم (اور ان معنوں میں ہر بڑے مصنف) نے اس واقعہ کو اور دوسرے ٹکڑوں واقعات کو جوڑ کے اور دوسرے مختلف افراد کو پیش آئے ایک غیر شخصی اور عمومی رنگ دے کر انہیں غیر فانی خصوصیات کا حامل بنا دیا۔ فلپ کی ماں اپنی شدید انسانیت اور اپنے بچے کے لئے اپنی بے لوث محبت کے لحاظ سے ایک زندہ اور متحرک کردار کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

پھر اس ناول کا تخیلی فلسفہ واقعات اور زود و داد سے نہیں ابھرتا بلکہ اوپر سے مسلط کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ناول کی عام تخیلی فضا اور واقعات میں کوئی ایسا نفسیاتی ربط نہیں جھلکتا جس سے کرداروں کے ذہنی انتشار اور اعصابی تشنج کا جواز انہیں خارجی واقعات میں مل سکے۔ "میرے بھی صنم خانے" میں کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ موجود ہوتا تھا جو کرداروں کے اندر فکر کو واقعہ کی مناسبت سے قنوطیت یا رجائیت کی طرف موڑ دیتا۔ پھر میرے بھی صنم خانے کے کردار زندگی کی ناکامیوں اور نامرادیوں سے مایوس اور دل گرفتہ ضرور ہو جاتے تھے لیکن علی نواز اور والٹر ریکس کی طرح اعصابی توازن کھو کر Neurotic نہیں بن جاتے تھے۔ کرن انجینک اعصابی طور پر متشدد رہتا ہے اور کشمیر کے محاذ پر مارا جاتا ہے اور رخشندہ سب کچھ لٹ جانے کے باوجود خود کو سنبھالے رکھتی ہے لیکن صفیہ نجم دل کے کرداروں پر تو ایک عجیب Neurasthentic کیفیت چھائی رہتی ہے۔ قرۃ العین کے نزدیک ان سب لوگوں کی ٹریجڈی یہ ہے کہ یہ سب لوگ سوچتے بہت ہیں۔ میرا تو کہتی بھی ہے کہ وہ اب سوچنا بند کر دے گی اور لیٹے بکری کی طرح جس میں غور و فکر کی صلاحیت نسبتاً کم ہے اور پُرسکون بھی ہے زندگی میں ایک خوش گوار ترتیب و سلیقہ پیدا کرنے کی کوشش کرے گی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ سوچنا ان کی ذہنی پریشانی کا واحد سبب نہیں۔ دراصل یہ سب کارستانیاں اس انداز فکر کی نہیں، جو عمل اور جدوجہد سے علاحدہ ہو کر Intellectual Revesic میں کھو جاتا ہے۔ وہ رخشندہ اور کرن کی طرح المیہ کردار تو کیا بنتے ان میں تو اتنی بھی توانائی نہیں کہ ان کے مصائب رقت تک طاری کر سکیں۔

ارون اور والٹر ریکس ایک رجعت پسند اور ظالم حکومت کے ہاتھوں بک کر کس طرح اپنے ضمیر کی آواز کچل دیتے ہیں اور ضمیر کو کچلنے کے اس عمل سے وہ کیسے روحانی کرب سے دوچار ہوتے ہیں اس کا ذکر قرۃ العین نے اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔ پھر بھی وہ اس دارو گیر اور کشمکش کو بھرپور طریقہ پر پیش نہیں کر سکیں اور ارون کا کردار اخیر اخیر میں مبہم اور بے معنی ہو گیا ہے۔ والٹر ریکس کی شاعری اور لطافت طبع تو محض ایک فریب معلوم ہوتی ہے اس کے کردار کے ایسے نازک پہلو نہیں ابھرتے جن سے پتہ چلے کہ وہ واقعی برطانوی سامراج کی جابر ہندوستانی حکومت کا آلۂ کار بن کر خود کو مظلوم اور ملعون خیال کرتا تھا۔ برطانوی سلطنت کو اپنا فرض سمجھتا ہے جس کی نمائندگی وہ ہندوستان میں بحیثیت سول سرونٹ کے کر رہا ہے۔ اس کا تمام تر اعصابی انتشار اور ذہنی کرب کسی ایسی روحانی کشمکش کو ظاہر نہیں کرتا جو اس کے ضمیر اور ادائیگی فرض کے درمیان جاری ہو۔ میرا سے اس کی محبت اس کے کردار کو اور متشکک خیز بنا دیتی ہے۔ علی کا اسے طمانچہ مارنا اس کے کردار کی مظلومیت کو ابھارتا ہے لیکن یہ مظلومیت بھی نجانے کیوں ایک Docile کردار کی مظلومیت معلوم ہوتی ہے۔

قرۃ العین کی زبان کی مٹھاس اور اسلوب کی حلاوت اس ناول میں بدستور موجود ہے۔ لیکن زبان اور اسلوب حقائق تک پہنچنے کا ایک دلآویز ذریعہ ہیں مقصود بالذات نہیں۔ اسلوب اور تکنیک کا کام مواد کو خوبصورتی اور

مثالی سے پیش کرتا ہے اور حقائق اور واقعات میں ترتیب سے تناسب اور توازن قائم رکھتا ہے۔ اس ناول میں قرۃ العین کا اسلوب حقائق تک پہنچنے اور واقعات کا ادراک کرنے میں ہماری مدد کرنے کی بجائے رکاوٹ پیدا کرتا ہے اسلوب میں جگہ جگہ جھنکار اور ژولیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی جادو بیانی کا تمام تر کمال محض خیالی پیکر تراشنے میں صرف ہو گیا ہے۔ طلسمی فضائیں جو ہمیں مسحور کیا کرتی تھیں طلسمات کے ایسے کارخانے میں بدل گئی ہیں۔ جہاں قاری کا ذہن مختلف پیکروں اور خیالی تصویروں سے الجھتا رہتا ہے لیکن کوئی تصویر کوئی مرقع اسے متاثر نہیں کرتا۔ ناول کی تمام فضا پر صرف سائے رینگتے ہوئے ملتے ہیں۔ سائے جو کرداروں کی کسی نفسیاتی یا احساساتی کیفیت کی آئینہ داری نہیں کرتے وہ صرف تخیل کے بلند آسمانوں پر منڈلاتے رہتے ہیں اور انسانوں کے جذبات کا عکس نہیں بن پاتے۔ ان کا Imagism ابہام کا شکار ہو گیا ہے اور اس میں کوئی جان نہیں رہی جو اسلوب اور جو تکنیک ان کے افسانوں میں لطف دے جاتی تھی وہ اس ناول میں آنکھوں سے گر جاتی ہے۔ ناول کا کینواس وسیع ہوتا ہے اس میں ماحول کردار اور واقعات کا جائزہ افسانوں کی نسبت زیادہ گہرائی اور گیرائی سے لیا جاتا ہے۔ تلازم خیال کی وہ تکنیک جو قرۃ العین کے افسانوں میں ایک خاص حسن اور جاذبیت پیدا کرتی ہے اس ناول میں محض انتشار کو جنم دیتی ہے۔ "میرے بھی صنم خانے" کی تعمیر ایک خاص پلان کے تحت ہوئی ہے جس سے ناول ارتقاء کی مختلف منزلیں طے کرتا ہوا ایک خاص نکتۂ عروج پر پہنچ کر ختم ہوتا ہے لیکن "سفینۂ غم دل" میں عمل بہت ہی سست اور کہانی کا عنصر اس قدر معمولی ہے کہ بقول وقار عظیم "جہاں ناول ختم ہوا ہے اس سے پہلے بھی ختم ہو جاتا یا اس سے بہت آگے بڑھ کر جو تصویریں نظر کے سامنے آتی ہیں اُن کے نقوش میں کوئی کمی یا زیادتی نہ ہوتی۔"

بہر حال قرۃ العین کا یہ ناول جتنی حوصلہ شکن ہے اتنا ہی ان کا پہلا ناول امید افزا تھا۔ اردو ادب نے پہلے بھی ان سے امیدیں وابستہ کی تھیں اور آج بھی وہ اُن سے مایوس نہیں ہوا ہے۔ ہر ادیب کے آرٹ میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ کسی ایک تخلیق کی ناکامیابی فنکار کے زوال کی دلیل نہیں ہوتی۔ اردو ادب آج بھی قرۃ العین سے بہت سی توقعات وابستہ کئے ہوئے ہے اور چاہتا ہے کہ قرۃ العین کا ارتقاء عصمت کے اس خیال کو صحیح ثابت نہ ہونے دے کہ آسمان ادب پر جو ستارہ بڑی آب و تاب سے آفتاب بن جانے کے آثار لے کر چکا تھا وہ ایک ہی جگہ چمک چمک کر اپنی روشنی کم کر بیٹھا۔

جدید افسانے کا نقطۂ آغاز

محمود ہاشمی

قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری کا آغاز اس عہد میں ہوا جب بیسویں صدی کی دنیا' کئی ذہنی اور سیاسی انقلاب سے گزر چکی تھی' پرانی بنیادوں پر قائم حقیقتیں بکھر رہی تھیں۔ تخلیقی ذہن' نئے سوالات اور نئی حیثیت سے روشناس ہو رہا تھا..... ماضی ایک ایسے ویرانے کا لینڈ اسکیپ بن چکا تھا جس میں سنسان ہوائیں اور عہد گذشتہ کی عظمتوں کے کھنڈرات موجود تھے ..... حال' ایک اضطراب تھا' جو نہ ماضی سے کسب مسرت کر سکتا تھا اور نہ مستقبل کے خوش آئند تصورات کا محور بن سکتا تھا..... عام انسانی معاشرہ' بدلتی ہوئی حقیقتوں سے بے نیاز' اپنے ماحول کی یکسانیت کو برقرار رکھنے کے لئے بے مصرف اور بے معنی دل بستگی کے کھلونے تلاش کرنے میں مصروف تھا۔

دو عظیم جنگوں' ملکی اور بین الاقوامی سیاست نے انسانی زندگی کی تمام بنیادیں منتشر کر دی تھیں..... انسان کا انفرادی وجود ریزہ ریزہ ہو کر عدم کے اس افق سے قریب ہوتا جا رہا تھا' جہاں موت کا سناٹا تھا..... یا زندگی سے متعلق انتہائی اضطراب زدہ سوالات.....

قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں کو ان سوالات کا محور بنایا اور اس تخلیقی رویے کی تشکیل کی جو حقائق کے اثبات کی بجائے باطنی صداقتوں کی جستجو کا سرچشمہ ہے۔ نئے سوالات اور نیا تخلیقی رویہ' اظہار کی نئی جہتوں کا باعث بنا..... وہ اسالیب وجود میں آئے جو جدید افسانے کی سب سے پہلی شناخت کہے جا سکتے ہیں۔

قرۃ العین کے ان ابتدائی افسانوی مجموعوں کے باوجود یہ سوال کئی بار پوچھا گیا کہ اردو میں فکشن کو حقائق کے یک رخے منطقی بیان کی بجائے ایک داخلی تخلیقی تجربے میں منتقل کرنے کی کوششوں کا آغاز کب ہوا؟ اس سلسلے میں اکثر و بیشتر منٹو کے افسانے "پھندنے" کا حوالہ دیا جاتا رہا ہے۔

"پھندنے" منٹو کے آخری زمانے کی تخلیق ہے۔ اس افسانے کے سلسلے میں ایک عرصے تک کوئی ادبی نظریہ سازی نہ ہو سکی..... لیکن افتخار جالب نے اپنے ایک تجرباتی اور تجزیاتی مضمون میں "پھندنے" کو نئی لسانی تشکیل کا نمونہ قرار دیا' اس وقت تک افتخار جالب ہمارے Dandy نقادوں میں تھے۔ انہوں نے یہ نقطۂ نظر پیش کیا کہ ادب پارے میں نئے اور عظیم موضوعات صرف اسی صورت میں نمایاں ہو سکتے ہیں جبکہ نئی علامتی زبان کو شکست دی جائے کیونکہ نئی علامتی زبان کو محض برقرار رکھتے ہوئے نئے اور عظیم موضوعات کے لئے استعمال کرنا' ہلاکت کے عمل سے زندگی کے جنم کی توقع رکھنے کے مترادف ہے۔ افتخار جالب کا یہ نظریہ مغرب کی نئی لسانی تنقید سے مستعار تھا۔ اس مکتب فکر کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ الفاظ کو اشیا کی دنیا سے نکال کر محض نمائندگی اشیا کے فرائض سپرد کر دینے سے ادب پارہ نیا نہیں بن سکتا..... جدید تخلیق کے لئے ضروری ہے کہ الفاظ کو اشیا کا درجہ دیا جائے..... افتخار جالب کا کہنا تھا "پھندنے" اردو کا وہ پہلا افسانہ ہے' جس میں منٹو نے تمام عمل کا راستہ ترسیل کے عمل الفاظ کو اشیا میں منتقل کر دیا ہے۔

منٹو کی سفاکانہ تخلیقی سرشت کا جدید افسانے کی آزادہ روی سے بہت گہرا تعلق ہے..... لیکن "پھندنے" منٹو کے نمائندہ افسانوں اور منٹو کے مقررہ اسلوب کی نمائندگی نہیں کرتا..... اس لئے منٹو کے صرف ایک افسانے "پھندنے" کو جدید افسانے کا نقطۂ آغاز قرار دینے میں تامل کیا جا سکتا ہے۔ منٹو بہت بڑا افسانہ نگار ہے' نئی لسانی تنقید' ہمارے زمانے کا فیشن ہے۔ یہ دونوں عناصر ہمیں اسی طرح مرعوب کر سکتے ہیں' جس طرح قرۃ العین حیدر کے ناول..... جن کا دبدبہ اور جلال ہمیں اس فن کار کے ان افسانوں کی جانب متوجہ نہیں ہونے دیتا' جو پہلے مجموعے "ستاروں سے آگے" اور "شیشے کا گھر" میں شامل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ الفاظ اور اشیا کے درمیان ایک علامتی وحدت کو تخلیق کرنے کا رویہ' قرۃ العین حیدر نے بہت پہلے اختیار کیا۔ ان کے پہلے مجموعے "ستاروں سے آگے" میں افسانہ "رقص شرر" شامل ہے' جس میں الفاظ اور اشیا کے درمیان کی ثنویت کو ختم کرنے کا لسانی تجربہ موجود ہے۔

قرۃ العین حیدر کے اس مجموعے کو ہم جدید افسانے کا نقطۂ آغاز تصور کر سکتے ہیں۔ اس مجموعے کے افسانے' اردو میں پہلی بار اس بیانیاتی یا Cartesian منطق کو توڑتے ہیں جو واقعات اور کرداروں کو خط مستقیم میں سفر کرنے پر مجبور کرتی تھی..... اور جس کا مقصد بیانیہ طرز کا حصول تھا..... ان افسانوں میں نثر کے تخلیقی استعمال کے ابتدائی نقوش نمایاں ہوئے ہیں' اور ایسے کردار تخلیق کیے گئے ہیں' جو اپنی شخصیت کے جھروکے سے دنیا پر نظر ڈالتے ہیں اور ان اشیا کو ذہن اور تخلیق کا استعارہ بنا لیتے ہیں' جن میں الفاظ اور اشیا کے درمیان کوئی فاصلہ یا خلا موجود نہیں ہے۔ الفاظ اور اشیا ایسے استعارے ہیں' جن کے مناظر کی خاموشی میں باطنی احساس کی آواز موجود ہے' مثلاً اس مجموعے کا ایک افسانہ' جس کا عنوان ہے..... جہاں کارواں ٹھہرا تھا' اس طرح شروع ہوتا ہے

..... اس سنسان' اکیلی روش پر نرگس کی پتیوں کا سایہ جھک گیا..... بیکراں رات کی خاموشی میں چھوٹے چھوٹے خداؤں کی سرگوشیاں منڈلا رہی تھیں..... چاند آہستہ آہستہ بڑھ رہا اور اسے ایسا لگا جیسے ساری کائنات ایک ذرے کے برابر بھی نہیں ہے اور اس وسیع خلا میں صرف اس کا خیال' اس کی یاد' اس کا تصور لرزاں ہے اور اس وقت اس نے محسوس کیا کہ رات' مرغزاروں کی ہوا اور اس کی یاد ایک بار پھر جمع ہو گئے تھے۔ لیکن اسی

وقت ڈھلنے ستاروں کی مدھم چیخیں آسمان پر گونج اٹھیں، اور ان چیخوں نے ساتھیوں کو منتشر کرتی ہوئی پہاڑیوں کی دوسری طرف جا کر ڈوب گئیں..... اور وہ خیالوں کے دھندلکے میں سے کہنا سنائی دیا..... لیڈی ویرونیکا..... عشق۔ چاندنی سے لگا۔ بھول جاگ اٹھیں گے اپنے ساز اور روس نے کروٹ نیندوں کی بستی کے راستوں پر سے خوابوں کا، پھولوں کا، گیتوں کا کارواں آہستہ آہستہ گزر رہا ہے.....

فسانوی منظرنامے اور داخلی احساس کی یہ یکجائی بظاہر ایک رومانی اسلوب کی حامل نظر آتی ہے لیکن ایسا نہیں ہے..... افسانہ انتہائی غیر رومانی مفہوم رکھتا ہے، اس افسانے کے کردار ازلی تحیر، وہموں کی شکست کے کرب سے دوچار ہیں۔ افسانہ نگار نے اس کرب کے اظہار کے لئے افسانے میں استعاراتی فضا کو تخلیق کیا ہے۔ مثلاً

.....زندگی عجیب ہے..... بہت ہی خوفناک اور اکتائی ہوئی زندگی اپنے آپ سے اکتا گئی ہے۔ زندگی کبھی ہاتھ نہ آنے والی اور دور سے نظر آ کر پھر کھو جانے والی فردوس کے لئے روتے روتے تھک چکی ہے.....

ایک اور اقتباس:

.....وقت، کسی پرانے دیوتا کا پرانا خواب بن کر اپنی جگہ ٹھہر گیا ہے..... وہاں پر صرف رات کی چیخیں تھیں..... اور خوابیدہ کائنات کی سسکیاں اور چاندنی کی ٹھنڈی آگ.....

اس افسانے کا اختتامی حصہ رومانی طرز کے ابتدائی منظرنامے کو اور بھی زیادہ معنی خیز بنا دیتا ہے، کیوں کہ افسانے کے کرداروں میں، خود قرۃ العین حیدر کا اپنا کردار بھی شامل نظر آتا ہے، اور افسانہ سوانحی قلب ماہیت کے عمل سے گزر کر وہموں کی شکست کے موضوع کو اور زیادہ موثر اور حقیقی سطح پر لے آتا ہے۔ اس اختتامی حصہ کا ایک حوالہ:

.....اور میں نے تصویروں کے کینوس تہہ کر کے افسانے جو لکھنے شروع کئے تو سب گھر والوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ خواہ ذرا سوچو تو سہی، بی بی، گھر سے باہر کی دنیا میں افسانہ نگار مشہور ہیں..... اور کھانے کی میز پر اس قدر شور مچا..... میں بیچاری سب سے لڑتی کہ بھائی قسم خدا کی میں اتنے اچھے افسانے لکھتی ہوں۔ ابھی یہ دیکھئے، ادب لطیف اور ساقی کے ایڈیٹروں کے خط آئے ہیں کہ سالنامے کے لئے مضمون بھیجئے اور وہ قہقہہ پڑتا کہ رونا آ جاتا..... ایک روز میں نے بے حد خوش ہو کر چائے کے وقت سب کو خبر سنائی کہ جی ہمارا مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔ کسی کو یقین ہی نہ آئے..... بھائی جان کے ایک دوست نے انتہائی سنجیدگی سے فرمایا کہ کتاب کے ساتھ ساتھ ایک شرح بھی چھپوا لیجئے تا کہ پڑھنے والوں کی سمجھ میں آ جائے کہ آپ نے کیا لکھا ہے.....

اس ایک ہی افسانے میں دو مختلف اسالیب موجود ہیں، افسانہ اختتام پر پہنچ کر ایک بار پھر رومانی منظرنامے میں گم ہو جاتا ہے اور پڑھنے والے پر داخلی اور خارجی استعاروں کی یگانگت کا مفہوم آشکار ہوتا ہے، جس میں کردار اور منظر، الفاظ اور خاموشیاں، سب ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہیں اور جو افسانے کے اختتام پر افسانے کے ابتدائی حصہ کی فضا اور منظرنامے کو استعاراتی کلیت عطا کر دیتے ہیں۔

"ستاروں سے آگے" جدید افسانے کے طرز و اسلوب کی نشاندہی تو ضرور کرتا ہے لیکن اس افسانوی مجموعہ کی کائنات بہت محدود ہے۔ عنوان عہد کی رقابتیں، واہمے اور خواب، اس مجموعہ کے افسانوں کی گم شدہ لیکن مرغوب اور محبوب منزلیں ہیں۔ یہ گمشدگی بھی خود اپنی سرشت میں ایک خوابناک احساس ہے۔ اس احساس کے باعث ان افسانوں میں مسرت کی تلاش، اور خوف و تحیر کا جذبہ مسلسل موجود رہتا ہے جو اکتا دینے والی یکسانیت کو جنم دیتا ہے۔ بیشتر کردار ایسے نوجوان ہیں، جو فرار پسندی سے اکتا کر حقائق کی جانب متوجہ ہونا چاہتے ہیں یا تنہائی کے شدید احساس سے خود کو مضمحل بنا لیتے ہیں۔ گویا یہ مجموعہ جدید فکشن کا عنوانی استعارہ ہے۔ اس کے بعد "شیشے کے گھر" کے افسانے ہیں..... جس میں بلوغت ہے، تصادم ہے، تاریخ اور تاریخیت Historicity اور عہد نو کی ژولیدہ اور پیچیدہ دنیا ہے..... جلاوطنی اور ہجرتوں کا احوال ہے..... انسانی رشتوں کے انہدام کا مرثیہ ہے..... بیسویں صدی میں زوال آدم اور گم شدہ جنتوں کا دکھ سہتے ہوئے مرد اور عورتیں ہیں، ایک نئی زمین ہے جس پر گذشتہ تہذیب کی کٹی ہوئی فصل کا ویرانہ ہے۔ ایک نیا آسمان ہے، جو ماضی کی دنیا پر روشنی نچھاور کرنے والے آفتاب و ماہتاب سے محروم ہے..... اس وژن کی تلاش ہے جو عرفان ذات کے لئے ضروری ہے۔

"شیشے کے گھر" میں شامل بیشتر افسانے طبعی اور مابعد الطبعی تصورات کے آئینہ خانے ہیں، جن میں الفاظ استعارے، علامتیں اور کردار زندگی کے کائناتی اور ابدی سوالات سے نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ افسانہ نگار کا لسانی رویہ بیان یا وضاحت کا نہیں بلکہ ماورائی سحرکاری کا ہے یا Evoke کرنے والا یہ رویہ ہر افسانے کو شاعری، مصوری اور موسیقی کے اظہار کے ہم آہنگ بنا دیتا ہے۔

مجموعہ کا پہلا افسانہ مصوری کے ایک ایسے کینوس کی مثال پیش کرتا ہے جس کے رنگوں میں تحیر کی وہ کائنات ہے، جو کبھی مذہب اور مابعد الطبیعات کی قیادت میں "اعلیٰ ترین شکل" تصور کی جاتی تھی۔

تحیر کی تصویر کشی سے اس افسانے کا آغاز ہوتا ہے جس کا عنوان ہے..... جب طوفان گذر چکا:

..... تو کبوتر آسمان سے نیچے اترا اور اس کی چونچ میں زیتون کی ایک سبز ڈالی تھی، اور اس ڈالی کو دیکھ کر وہ سب زمین کی اس وادی میں پہنچے اور خداوند خدا کی بزرگی کا نشان قائم کرنے کے لئے آس پاس کی پہاڑیوں کے نیلے بھورے پتھر جمع کر کے انہوں نے ایک عبادت گاہ بنائی اور اس میں وہ آسمانوں کے بادشاہ کی حمد کرنے لگے جس نے انہیں طوفان سے بچایا، اور تب خداوند

امرائیل کے خدا کا جلال زیادہ ہوا اور کائنات نور سے معمور ہو گئی اور وادی میں رنگ برنگے پھول کھل گئے اور خانقاہ کے چاروں طرف انگور کی بیلیں اور زیتون اور انجیر کے درخت اُگ آئے.....

کبوتر جس کی چونچ میں زیتون کی سبز ڈالی ہے اور نیلے بھورے پتھروں سے تعمیر کی جانے والی عبادت گاہ، انگور کی بیلیں، زیتون اور انجیر کے درخت..... یہ تمام Images ہیں جن سے افسانے کا ایک انتہائی با معنی اور علامتی کینوس تخلیق ہوتا ہے۔ پھر افسانے میں ازابلا اور راحیل دو کردار نمایاں ہوتے ہیں جن کا وجود پورے کینوس کو ایک زندہ اور متحرک لینڈ اسکیپ میں تبدیل کر دیتا ہے..... ازابلا اور راحیل دو راہبات ہیں۔ مابعد الطبیعی علامتوں کے سحر میں زندگی کا مفہوم تلاش کرتی ہوئی..... ازابلا کے لئے زندگی اور موت کا روحانی لینڈ اسکیپ صرف خانقاہ اور خداوند خدا کے حضور کا روحانی تعامل ہے۔ راحیل اس لینڈ اسکیپ سے نکل کر انسانی رشتوں کے درمیان زندگی کا مفہوم تلاش کرنا چاہتی ہے۔ دونوں کردار ''نامعلوم'' کے لئے جریصانہ تلاش و تجسس میں مصروف ہیں..... اس افسانے میں جس رات کا تذکرہ ہے وہ ایک رمز ہے جو زندگی کے تجسس سے عاری انسانوں کو میٹھی نیند سلاتا ہے اور مقدس خوابوں کے جہانوں کی سیر کراتا ہے..... اور یہی رات جو رمز ہے زندگی کے اضطراب اور ذائقہ کی جستجو کرنے والوں کو جگاتی ہے..... دونوں کرداروں کے لئے رات اپنا انفرادی مفہوم رکھتی ہے۔ راحیل رمز کے دھندلکوں میں زندگی کو بہت جلد تلاش کر لیتی ہے..... اور ازابلا اپنی ذات سے ایک طویل کشمکش کے بعد ایک رات زندگی کی پہلی جسمانی حرارت کا ذائقہ محسوس کرتی ہے:

.....اور یک لخت اس نے محسوس کیا، نیندوں کی بستی کی ساری شمعیں ماند پڑتی جا رہی ہیں اور پھر خوابگاہ کے خوبصورت نیلے ایرانی قالین پر سے اُسے بازوؤں کی مضبوط گرفت میں اوپر اٹھالیا گیا..... اور دریچے سے باہر چاندنی رات کی ہوائیں چلنا بند ہو گئیں اور فضا میں گرمی بڑھ گئی.....

افسانے کا نقطۂ عروج ازابلا کے لئے اپنے وجود کی بازیافت بھی ہے اور اس نیچر کی شکست بھی جسے ایک زمانے میں اعلیٰ ترین شکل تصور کیا جاتا تھا۔

''شیشے کے گھر'' میں جس قدر افسانے شامل ہیں ان کا بنیادی تخیل شعری تخیل کا ہم قدر ہے۔ یہ افسانے ان مفاہیم کا انکشاف کرتے ہیں جن کے وجود کا ہمیں گمان بھی نہیں ہوتا۔ یعنی یہ افسانے ایسے Familiar افسانوں سے مختلف ہیں جو جانی پہچانی اشیا اور واردات کو بیان کرتے ہیں۔

اس مجموعے کے دیگر تین افسانوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ یہ ہیں:

(۱) برف باری سے پہلے

(۲) کیکٹس لینڈ

اور (۳) جلاوطن۔

''برف باری سے پہلے'' کی داستان تقسیم کے فوراً بعد کوئٹہ (پاکستان) پہنچنے والے ہولی امتاز کی داستان ہے..... افسانے کا آغاز اس کمرے کے منظرنامے سے ہوتا ہے جہاں ہولی امتاز موجود ہے:

..... آج رات تو یقیناً برف پڑے گی..... صاحب خانہ نے کہا..... سب آتش دان کے اوپر قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ آتش دان پر رکھی ہوئی گھڑی اپنی متوازن یکسانیت کے ساتھ ٹک ٹک کرتی رہی۔ بکیاں کھٹوں میں منہ دیے اونگھ رہی تھیں اور کبھی کبھی کسی آواز پر کان کھڑے کر کے کھانے کے کمرے کے دروازے کی طرف ایک آنکھ تھوڑی سی کھول کر دیکھ لیتی تھیں۔ صاحب خانہ کی دونوں لڑکیاں شطرنج میں مشغول تھیں۔ گھر کے سارے بچے کمرے کے ایک کونے میں پرانے اخبارات اور رسالوں کے ڈھیر پر چڑھے کیرم میں مصروف تھے.....

دھیمے سُروں میں بجنے والی اداس موسیقی جیسا تاثر کوپیش کرنے والا یہ منظرنامہ ہولی امتاز کے باطنی احساس کا علامیہ ہے..... اور ''برف باری'' کا تذکرہ وہ علامتی خیال ہے جو ہولی امتاز کو سرگوشیوں کی فضا سے نکال کر اچانک لکھنؤ کی یادوں سے وابستہ کر دیتا ہے جہاں عین اسی وقت لکھنؤ ریڈیو سے کوئی موسم کی رپورٹ سنائی تھی۔

ہولی امتاز کی اس کیفیت کو ماضی پرستی یا یادوں کی جانب مراجعت نہیں کہا جا سکتا بلکہ حال کے لمحوں میں ماضی کے وزن کی شمولیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ وزن ایک مابعد الطبیعی تجربہ ہے۔

عینی کے افسانوں میں ''منظرنامہ'' کی اہمیت کرداروں سے بھی زیادہ ہے، بلکہ میرے نزدیک تو یہ منظرنامے ایسے کینوس ہیں جن کی حیثیت کسی کردار سے زیادہ ہے..... ایسے فن کار جن کے لئے تخلیق ایک داخلی حقیقت کے درمیان ایک ہم آہنگی کو تشکیل دیتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا تخلیقی رویہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ کلاسیکی کی طرح وہ بھی کہہ سکتی ہیں کہ ہولی امتاز میں، خود میں اور افسانے کی تمام فضا میں ایک داخلی احساس کی فضا ہے۔

''برف باری سے پہلے'' کے ابتدائی منظرنامے کا جو اقتباس اوپر مذکور ہے..... اُسے آسانی کے ساتھ فن کار کے احساس کا داخلی Persona کہا جا سکتا ہے کہ مابعد الطبیعی فکر اسی نہج پر اپنا اظہار کرتی ہے..... مثال کے طور پر سارتر اور البیر کامیو کے افسانوی منظرنامے اس کی وضاحت کر سکتے ہیں۔ سارتر کے ناول نوسیا (Nausea) کے کردار روکوئنٹن Roquentin کو خود سارتر کے اپنے کردار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سارتر اپنی تحریروں میں مابعد الطبیعی فکر سے وابستہ رہتا ہے۔ نوسیا میں ایک ایسے ہی ''منظرنامے'' کو تخلیق کیا گیا ہے جو قرۃ العین حیدر کے مذکورہ بالا منظرنامے سے مماثلت رکھتا ہے:

.....ایک لمحہ رک کر میں نے اپنے حواس کو مجتمع کیا اور کمرے میں داخل ہو کر دریچے کے پاس ایک کاغذ سورج اٹھا۔ کھڑکیوں سے اندر آتی ہوئی زرد

پژمردہ روشنی' کمرے دیواروں پر آویزاں تصویروں کو داغ دار بنا رہی تھی۔ اس عظیم کمرے کی کسی چیز میں زندگی کا تحریک نہ تھا صرف ایک بلی تھی جس میں زندگی نے انگڑائی لی' اور وہ میرے کمرے میں پہنچنے پر خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلی۔ لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ بڑے صوفے یہ بے جان اور تنہا کمرے میں میری جانب نگراں ہیں.....

یہ سارتر کا منظر نامہ تھا' جس میں بے جان اشیا بھی' جاندار کردار بن کر سامنے آتی ہیں۔ اب راب گری یے کے "منظر نامے" پر غور کیجئے..... جو اپنی تخلیق میں اشیا اور داخلی احساس کے درمیان کسی ہم آہنگی کو ضروری نہیں سمجھتا۔ یہ راب گری یے کے ناول Labyrinth کی ایک جھلکی کا منظر نامہ ہے

.....اب ایک دروازہ چوکور کمرے میں کھلتا ہے اس میں ایک بستر لگا ہوا ہے۔ ایک گول میز ہے اس کی سطح سنگ مرمر کی ہے۔ میز پر سرخ و سفید رنگ کے چارخانے کا آئل کلاتھ بچھا ہوا ہے۔ مرکزی دیوار کے وسطی حصہ میں نیچے کی جانب آتش دان ہے۔ جس میں ہیر دوا کھوجود ہے آتش دان کے دائیں جانب ایک دروازہ ہے' جو عقبی کمرے کی جانب کھلتا ہے.....

قرۃ العین حیدر اور سارتر کے افسانوی منظر ناموں کا اپنا تخلیقی رویہ ہے' جبکہ راب گری یے جسے مابعد الطبیعات سے دلچسپی نہیں' محض اشیا کی جزئیات کے بیان کو کافی سمجھتا ہے..... یہ وہ مختلف تخلیقی رویے ہیں' لیکن داخلی احساس کی منظر کشی' ان معروضات میں ضروری معلوم ہوتی ہے' جو شیشے کے گھر کے افسانوں کا محور ہیں' جو ایک ہی جست میں داخلی خودکلامی بن کر جولی امتاز پر ماضی اور حال کے بے رنگ ہم آہنگی منکشف کرتا ہے

..... آخر کار وہ خوبصورت وژن دکھائی پڑتا ہے..... ارے تم کدھر نکل آئے..... زندگی کی طرف واپس جاؤ۔ انقلاب اور موت کی تند و تیز آندھیوں کے سامنے زرد' کمزور پتوں کی طرح بھاگتے ہوئے انسان! ہماری طرف لوٹو..... اس وژن کی طرف.....

جولی امتاز کی خودکلامی میں یہ گونج کی آواز ہے یا پھر خود اس کا اپنا وژن' جو ماضی اور حال کی پرچھائیوں کو جوڑ کر ایک نئے لمحے کو تخلیق کر رہا ہے

دراصل جولی وقت کے اس لمحہ کا اسیر ہے' جس کے ایک جانب تنہائی اور اجنبیت ہے' اور دوسری جانب ماضی میں بکھر آنے والی رفاقتوں اور محبت کے نعم البدل کی جستجو..... اس لمحہ کے دونوں افق بے معنویت کی تعبیر ہیں' حقیقت صرف یہ ہے کہ جلاوطنی اور ہجرت جولی امتاز کا سب سے بڑا المیہ ہے اور اس حقیقت کو ذہنی اور جذباتی طور پر قبول نہ کر سکنے کے باعث وہ زندگی کی تمام تر بے معنویت میں سے اپنے "وژن" کے کھو جانے کو بچانے کی ہر دھنگ میں مصروف ہے..... کیوں کہ وژن کا خاتمہ وجود کا خاتمہ ہے

جولی امتاز کی خودکلامی' اپنے وجود اور اپنے وژن کی تلاش میں ہجرت سے پہلے کی زندگی سے ہم کلام ہوتی ہے..... لیکن ظاہری مسرتوں' رفاقتوں اور آسودہ حالیوں کا یہ عہد بھی اُسے' زندگی اور موت کے درمیان کسی لاموت' کسی وجود اور کسی معدوم کی تلاش کا عہد معلوم ہوتا ہے..... اس عہد کے کچھ مناظر اس افسانے میں ایسے سوالات کی صورت موجود ہیں' جن کا تعلق زندگی کے اسرار اور مفاہیم سے ہے۔ مثلاً

..... کائنات اتنی بشاش ہے..... یہ معصوم سپید پھول' بلوریں جھرنے' کنوارے مقدس برفیلے پہاڑ..... اس بڑی لڑکی شاہدہ نے اس سے کہا تھا..... دیکھو یہ کھلا نیلا آسمان' اونچے درخت' قرمزی بادل' ہمارے چاروں طرف ہر چیز اتنی عظیم ہے' اتنی بلند ہے' اتنی فراخ دل ہے..... ایسے میں کیا تم زندگی سے مایوس ہو سکتے ہو۔

..... اور اس وقت اُن سب کے دل میں ایک ساتھ ایک عجیب خیال آیا..... دنیا جو کچھ ہم چاہتے ہیں' ہمیں کبھی نہیں دیتی۔ ہم احمقوں کی طرح منہ کھولے' سامنے مستقبل کے اندھیرے کی طرف دیکھتے رہتے ہیں اور آخر کار ایک روز اس اندھیرے میں سے موت نکل کر آتی ہے اور ہمیں ہڑپ کر لیتی ہے۔ اور سارے نظام کائنات پر ہماری غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا.....!

..... جولی نے محسوس کیا..... میں بھی..... یعنی یہ انسان..... جولی امتاز..... جو اس وقت "واٹلڈ روڈ" کے دریچے میں کھڑا ہے' ان چنگھاڑتے ہوئے عناصر کا ایک اس قدر بے بس اور کمزور حصہ ہے' روح کا کرب' زندگی کی تڑپ' دل کی بے چینی' عناصر کی اس قیامت خیز گھن گرج میں گھل مل کر کیسی ایک بے آواز دھڑکن بن گئی ہے۔ یہ پہاڑ' یہ طوفانی ہائے' یہ اونچے' بے پرواہ درخت' ان سب پر میرے وجود کے ہونے یا نہ ہونے کا کوئی اثر نہیں پڑتا!.....

جولی امتاز کے یہ سوالات ہیں' جو کائنات کی وسعتوں میں انسانی وجود کا مفہوم تلاش کر رہے ہیں۔ اور یہ وضاحت بھی کر رہے ہیں کہ عناصر اور مظاہر کی بے کرانی میں' انسانی زندگی' مستقبل کی جانب نگراں رہتی ہے لیکن خالص طبعی زندگی باطنی رشتوں کے بغیر اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکتی' خارجی زندگی کی طرف یہ ایک جست ایک ہجرت ہے' جو زندگی کو ایسی بے معنویت کے ویرانوں میں پہنچا دیتی ہے..... زمین' آسمان اور انسانی وجود کے درمیان ایک داخلی شناسائی اور ہم آہنگی ضروری ہے کسی نہ کسی صاحب خانہ کی بیگم منتظر ہے' اور اپنی بیٹی کے لئے مستقبل کی غیر یقینی روشنی کے حصول کی خاطر کسی امتاز انسان کو پکار رہی ہے

.... امتاز صاحب؟

اس نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا' اس کے میزبان کی بیگم صاحبہ برآمدے کی سیڑھیوں پر ہاتھ میں ناشتہ تھامے کھڑی تھیں۔

..... امتاز صاحب..... واہ' آپ بھی خوب ہیں۔ ہم اتنا آپ کو روکتے رہے..... اور آپ بغیر کھانا کھائے ہی بھاگ آئے' آج تو میری سعیدہ

نے خود سویاں پکائی ہیں بڑے شوق سے۔ سب کے کھانا پکانے کا اس کے ابا جی کھیلنے کلب آ رہے تھے۔ میں نے سوچا سویوں کی ایک پلیٹ اُن کے ہاتھ بھیج دوں..... پھر میں خود ہی چلی آئی.....

یہ اقتباس افسانے کا اختتام بھی ہے اور عہدِ رواں کی انسانی گم شدگی کا استعارہ بھی۔ "کیکٹس لینڈ کے گھر" کا سب سے اہم افسانہ ہے۔ جدید اردو افسانے کی تاریخ میں اس افسانے کو وہی اہمیت دی جا سکتی ہے جو جدید انگریزی شاعری میں ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ کو حاصل ہے۔

ویسٹ لینڈ پہلی جنگِ عظیم کے بعد کی ذہنی ویرانی اور انتشار کی علامت ہے اور کیکٹس لینڈ تقسیم کے بعد کا وہ تہذیبی خرابہ جس میں اقدار اور انسانی رشتوں کے زوال، زمین سے بے تعلقی، جلاوطنی اور اضطراب کے بجھے ہوئے شعلوں سے دھواں اٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

یہ محض ایک اتفاق ہے کہ ویسٹ لینڈ اور کیکٹس لینڈ کی تقسیم میں ایک مماثلت موجود ہے..... ویسٹ لینڈ پانچ حصوں پر مشتمل ہے اور "کیکٹس لینڈ" بھی پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

ویسٹ لینڈ کا پہلا حصہ (The Burial of the Dead) موسمِ بہار کی آمد اور خزاں کے خاتمے سے شروع ہوتا ہے۔ کیکٹس لینڈ کا آغاز بھی موسمِ بہار کی آمد کے ایسے ہی منظرنامے سے ہوا ہے:

..... اب خزاں بھی واپس جا رہی ہے اور سفیدے کے جنگل پر ہریالی اتر رہی ہے اور جھیل کے پورے کنارے تک پھیل آئے ہیں اور جب سبز بالوں کا جھنڈ پانی کی سطح پر جھک کر ہوا میں ڈولتا ہے تو چپکے سے رونے لگتی چاہتا ہے۔ سفیدے کا چھوٹا سا جنگل اس طرح چپ چاپ کھڑا ہے اور کبھی کبھی کوئی راہ گیر چپوں کو روندتا سفیدے کے جھنڈ سے گزر جاتا ہے.....

قرۃ العین حیدر کا یہ افسانہ جدید عہد کی زندگی کے اس افتراق اور انتشار کا اظہار ہے جس میں زندگی، موت، شخصیت اور وجود سب اپنے اپنے تضادات سے متصادم ہیں۔ اس افسانے کے کردار وہ انسان ہیں جو کبھی اپنی دنیا اور اپنی تاریخ اور اپنی تہذیب کا محور تھے..... ان بنیادوں سے بچھڑ کر ان کرداروں کا وجود لامحدود خلاؤں میں بکھر جاتا ہے..... ہر ایک کردار منقسم ہے اور خود کو عدم کے محور سے قریب ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ان کرداروں کے اطراف کی کائنات، دھندوں اور خوابیدہ پیکروں کی سنسان اور خاموش کائنات ہے۔

افسانے کے تمام کردار خود کلامی کے ذریعہ اپنی تلاش میں مصروف ہیں اور اس تہذیبی احساس سے وابستہ ہونے کے لئے بے قرار ہیں۔ جس کا عدم وجود زندگی کو یکسر بے معنی بنا رہا ہے۔

جدید عہد کی زندگی نے ان کرداروں سے "گھر" کی اس علامت کو چھین لیا ہے، جس سے اپنے وجود کا احساس میسر آتا ہے۔ ان کرداروں میں کلاسیز، ظلعت، جمیل اور علیہ وہ نسوانی کردار ہیں جو ماضی کے اختلاف کے باوجود ایک ہی علامت کی جستجو میں مصروف ہیں اور یہ کردار ایک Visionary کردار، میری کیسل بن کر اسی علامت کو پلٹ کرنا چاہتے ہیں۔

..... میری کیسل کیا تم اس بارش کی تصویر بناؤ گی.....

..... یہ اسی کا گھر ہے اسی گھر میں وہ برسوں سے رہتی آئی ہے۔

اس زمین پر وہ سب صدیوں سے جیتے اور مرتے رہے ہیں۔ یہ گھر، یہ باغ، یہ سمر ہاؤس جھیل کے پار حدِ نظر تک پھیلے ہوئے کھیت اور چراگاہیں اور ایک بار ایسا ہوا کہ وہ ان سب چیزوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ بہت دور چلے گئے اور کبھی ان جگہوں کی خاموشی اپنا بیت ان کی چپ چاپ پکار سننے کے لئے واپس نہ آئیں گے.....

اس افسانے کے کرداروں نے ماضی میں اجتماعی تہذیبی زندگی کے اس درخشاں عہد کو جیا ہے، جس میں دو نسلوں کے درمیان اختلاف تو موجود تھا، لیکن یہ اختلاف تخریبی نہیں تھا بلکہ تخلیقی تھا۔ یہ اختلاف نئے تجربات اور نئی زندگی کے خوابوں اور نئے جہانوں کی تلاش کے لئے محرک بن جاتا تھا..... چنانچہ کیکٹس لینڈ کی ظلعت، جمیل اور بیگی اشرف بھی نئے جہانوں کی تلاش میں نکلتے ہیں..... دوسری جنگِ عظیم کے بعد کی دنیا میں ان کرداروں نے اس عہد کو بھی دیکھا جب جنگ کا پردہ کائنات کی بیکراں تاریکی کے اوپر مریخ کی مدھم، سرخ، گرم روشنی میں آہستہ آہستہ پرواز کر رہا تھا..... اور مشرقِ وسطیٰ، افریقہ اور ایشیا کی زمینوں پر اپنے وجود کا استحقاق چاہنے والوں کو مشکوک خبر مسرتوں کے ساتھ قتل کیا جا رہا تھا۔

کیکٹس لینڈ میں یہ مختلف حوالے اور حادثے وقت کی اساس کو بیان کرتے ہیں۔ ان واقعات میں ۱۹۴۳ بھی ہے، ۱۹۴۵ بھی اور پھر ۱۹۴۷ بھی.....

..... جب وہ اپنے گھر، اپنے کھنڈر، اپنے کھیت چھوڑ کر لوگ کھڑا کے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔ اپنے کھیت چھوڑ کر جہاں وہ شہر سے لاچ کے ساتھ بھوک بوتے تھے اور کاٹتے تھے.....

یہ اقتباس ایک زمانی حوالہ ہے، جس میں صرف تقسیم کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ افسانے کے کرداروں کا قلبِ ماہیت بھی ہے، جس میں وہ افراد کی بجائے انسانوں کی ایک جماعت میں تبدیل ہو گئے ہیں اور اپنے عہد کی تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔

یہ تاریخ ایک حقیقی عمل سے گزرتی ہوئی افسانے کے تناظر میں ایک بار پھر فرد میں ڈھل جاتی ہے..... فرد جو اس افسانے کے کردار ہیں جن میں بیگی اشرف بھی ہے جو کہ تاریخی حیثیت میں اپنے وجود کو تلاش کرنے کے لئے خود کلامی کے ذریعہ اپنا اظہار کرتا ہے۔ اور تاریخ کی حیثیت، خاموشی کی زبان بن کر اس سے مخاطب ہوتی ہے:

..... یہ میں، جو میں ہوں خاموشیوں کی دیوی نے آہستہ سے

کہا..... تم جس راستے پر چل رہے تھے آخر مجھ تک پہنچو گے..... جس راگ کو سنو گے اس میں میری آواز ہوگی، جس خوشبو کو محسوس کرو گے اس میں میری مہک پاؤ گے..... پھولوں کے جو رنگ دیکھو گے ان میں میری جھلک موجود ہوگی.....

میں تمہاری روح میں بکھری ہوئی ہوں..... میں تمہارے وجود کا سایہ ہوں۔ سایہ جو کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ جو ہمیشہ آگے آگے چلتا ہے، لیکن مل نہیں سکتا اور مستقبل کی صدیوں کے اندھیرے میں کھو جاتا ہے.....

بیگم اشرف اور طلعت جمیل اور گیلکسی لینڈ میں اپنے منتشر وجود کو نامیاتی وحدت میں ڈھالنے کے خواہش مند، دوسرے تمام کردار، صرف ہندوستان اور پاکستان کے افسانوں کی جدید زندگی اور جدید تاریخ کے نمائندہ نہیں ہیں، بلکہ ان کا تناظر بیسویں صدی کی وہ تمام کائنات ہے، جس میں تمام جذباتی، ثقافتی اور روحانی بنیادیں ختم ہو چکی ہیں..... گیلکسی لینڈ کے بیگم اشرف اور طلعت جمیل اس عہد کی زندگی کے جہنم کا سفر کرتے ہوئے ایک لمحے کے افق پر ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اپنے اپنے سفر کے تجربات کا اظہار ان جملوں میں کرتے ہیں:

.....ہاں ہم بہت برے زمانے میں ملے ہیں اور اداسی کے گھنٹے ہمارے پیچھے بجتے جا رہے ہیں۔ ہماری زندگی کو چوہے کتر رہے ہیں اور ہمارا خدا پہاڑوں پر پیدا ہونے سے پہلے ہی مر چکا ہے اور اس کی تجہیز و تکفین سے فراغت پا کر میں تمہارے پاس آئی ہوں.....

.....تم نے غلطی کی ہے۔ جب یہ سفید بیمار چوہے اپنے بلوں کو واپس بھاگ جائیں، تب تم بھی بوڑھی ہو چکی ہوگی۔ اسی طرح مرنے کا انتظار کرو، جیسے اور سب مرتے ہیں.....

مادی کامیابیوں کی خواہشات کے سفید چوہوں سے پریشان، بیسویں صدی کے یہ کردار جدید فکشن کا سب سے اہم موضوع ہیں۔ وجودی فلسفے کے اثر سے تخلیق ہونے والے دنیا کے بیشتر فکشن میں اسی انسانی situation کو پیش کیا گیا ہے۔

"جلاوطن" کے کرداروں کا بھی یہی المیہ ہے کہ وہ اپنے عہد کی بیکراں تنہائی اور زندگی کے ازلی اور ابدی بکھراؤ کے ویرانے میں جلاوطنی کی زندگی کا جبر سہتے ہیں اور اپنی پہچان کے لیے صرف یہ عنوان تجویز کرتے ہیں۔

.....ہم اپنے بدقسمت ملک کی وہ نوجوان نسل ہیں، جو یورپ کی جنگ اور اپنے سیاسی انتشار کے زمانے میں پروان چڑھی۔

جلاوطن.....

بیسویں صدی کے انسانی المیہ کا یہ موثر ترین اظہار ہے، جس میں تخلیق کا آغاز التباس (ILLUSION) کی فضا سے ہوتا ہے..... اور افسانہ نگار کا مخصوص اسلوبی تخلیقی رویہ اس التباس کو ایک ناگزیر، ہمہ گیر اور زندہ حقیقت اور اس کے عرفان میں تبدیل کر دیتا ہے۔

قوموں کا تہذیبی تشخص

ڈاکٹر قمر رئیس

عصمت چغتائی نے قرۃ العین حیدر کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک جگہ کہا تھا کہ آسمان ادب پر جو ستارہ بڑی آب و تاب سے آفتاب بن جانے کے آثار لے کر چمکا تھا وہ ایک ہی جگہ چمک کر اپنی روشنی گم کر بیٹھا لیکن ۱۹۵۴ء سے پہلے کی بات ہے جب قرۃ العین حیدر کے پہلے کامیاب ناول "میرے بھی صنم خانے" کی اشاعت اور مقبولیت کے بعد کم و بیش اسی موضوع پر ان کا نسبتاً کمزور ناول "سفینۂ غم دل" شائع ہوا تھا۔ گزشتہ ۲۵ سال کے عرصے میں قرۃ العین حیدر کی تخلیقی جودت نے اردو ادب میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ اگر آفتاب نہیں تو ایک درخشاں مہتاب کا درجہ انھیں ضرور بخشتا ہے۔ جس کی روشنی میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا...... آج افسانوی ادب کے میدان میں ہندو پاکستان میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ تکرار، یکسانیت اور ایسی ہی دوسری کمزوریوں سے ان کی تخلیقات یکسر پاک ہو گئی ہوں۔ لیکن وہ جو کہا جاتا ہے کہ بڑے فن کاروں (فنانوں) کی کمزوریاں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ ان کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ ان کی اکثر کمزوریاں فنی خوبیوں کے جمال آفریں پردوں میں کہیں گم ہو گئی ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ تخلیقی زندگی کے طویل سفر میں انہوں نے اپنی بعض کمزوریوں پر قابو پایا ہے اور تخلیقی فکر اور تکمیل فن کے ایسے منطقوں میں رسائی حاصل کی ہے۔ جہاں اردو کا کوئی دوسرا ادیب نہیں پہنچ سکا۔

کہانی کہنے کا آرٹ انھیں اپنے والدین سے ملا تھا۔ ان کے والد سید سجاد حیدر یلدرم بھی افسانہ طرازی میں امتیاز خاص رکھتے تھے۔ وہ اپنے پیش رو اور معاصر ادیبوں کی تقلید اور پیروی سے گریزاں رہے۔ اس کے برعکس جدید ترکی اور انگریزی ادبیات سے استفادہ و ترجمہ کر کے انہوں نے اردو افسانہ کو فکر و اسلوب اور اظہار و معنی کے نئے عناصر سے باثروت بنایا۔ اصلاحی، آدرشی اور تنقیدی حقیقت نگاری کے جو رجحانات نذیر احمد سے پریم چند تک اردو میں روایت کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ سجاد حیدر یلدرم نے ان سے گریز کیا اور اپنے لئے ایک منفرد راہ نکالی۔ ان کی بیٹی قرۃ العین نے بھی ان کے اسی مسلک کی پیروی کی۔ کم و بیش ہر دور میں ان کو تنقید اور نکتہ چینی کا ہدف بنایا گیا۔ روایت پرستوں سے قطع نظر ترقی پسندی اور جدیدیت جیسی ادبی تحریکوں کے علمبرداروں نے ان کی تجاوزی اور تخلیقی تجربات کی معنویت پر شک کیا۔ لیکن وہ اس شور و شر سے بے نیاز پورے اعتماد اور انہماک سے لکھتی رہیں۔

اس میں شک نہیں ہیں بائیس سال کی عمر تک قرۃ العین نے جس ماحول میں زندگی بسر کی اور جس سے وہ مانوس ہوئیں وہ اودھ کے جاگیرداروں اور اعلیٰ طبقے کی پُرآسائش، پُرتکلف اور خوبصورت دنیا تھی اپنے پہلے مجموعہ "ستاروں سے آگے" کے افسانوں اور ابتدائی دو ناولوں میں وہ اسی دنیا کی رنگینیوں، اس کی سچائیوں، مشغلوں اور سوز و ساز کو دریافت کرتی ہیں اور کوشش کرتی ہیں کہ ذرا فاصلہ رکھ کر معروضی انداز سے اس زندگی کو دیکھیں اور دکھائیں لیکن جذباتی رشتے انھیں ایسا کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ ابھی ان کا مشاہدہ محدود ہے اور وہ اپنی ہر تخلیق میں موجود رہنے پر اصرار کرتی ہیں اظہار و بیان کا علامتی پیرایہ جو وہ اختیار کرتی ہیں وہ اکثر ژولیدگی اور تصنع کا شکار ہو جاتا ہے۔

عہد شباب کے ان خوابگوں اور گلکدوں محلات سے ۱۹۵۰ء کے بعد جب وہ باہر نکلتی ہیں۔ تقسیم وطن، فسادات اور ہجرت کے المناک سانحے جب انھیں زندگی کی تلخ اور سنگین حقیقتوں کے روبرو لاتے ہیں اور جب ایک کی بنی خوبصورت تہذیب کا تصور چکنا چور ہو جاتا ہے اور اودھ کی شام پر اندھیرے پڑاؤ ڈالتے ہیں تو قرۃ العین حیدر انسانی حیات اور اجتماعی حقیقتوں کے تئیں ایک سنجیدہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اب وہ زندگی کے تغیرات کا رخ کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی سعی کرتی ہیں۔ اس گریز کی نشاندہی ان کے پاکستان میں لکھے ہوئے طویل افسانے "ہاؤسنگ سوسائٹی" اور ناول "آگ کا دریا" سے ہوتی ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی سادہ بیانیہ اسلوب کی کہانی ہے اس کا موضوع پاکستان میں جاگیرداروں اور نو دولتیوں کے ہاتھوں بننے والے ایک نئے استحصالی معاشرے کے تضادات ہیں۔ اس معاشرے کی بے رحمیوں اور کھوکھلی قدروں پر سلمان اور ثریا جیسے انقلابی نوجوان طنز کرتے ہیں۔ اسی طرح اپنے ناولٹ "چائے کے باغ" میں وہ نہایت سادہ اور موثر ڈھنگ سے محنت کش عوام کے استحصال اور مشرقی پاکستان کے نام نہاد اسلامی معاشرے کو طنز کا ہدف بناتی ہیں۔ "اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو" میں قرۃ العین حیدر نے پہلی بار نچلے طبقے کے معمولی کرداروں کو مرکزی حیثیت دی ہے۔ اور پاکستانی معاشرہ میں طبقہ نسواں کے استحصال کی کہانی سنائی ہے۔ کہنے کا مدعا یہ ہے کہ یہ گریز بڑا اہم اور معنی خیز تھا۔ ان کے والد سجاد حیدر اور والدہ نذر زہرا دونوں اپنے زمانے کے بہت روشن خیال اور ترقی پسند ادیب اور دانشور تھے۔ دونوں نے قدامت پسندی اور طبقۂ نسواں کے استحصال کی گھناؤنی رسموں کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ قرۃ العین حیدر نے اب اس صحت مند روایت سے اپنا رشتہ مستحکم کیا۔ لیکن اس طرح کہ ان کی انفرادیت پر آنچ نہ آئے۔

قرۃ العین حیدر ایک بلند قامت اور بڑی تخلیق کار ہیں۔ اردو ادب میں جہاں تک انکی عطائے امتیاز کا تعلق ہے۔ ایک مختصر مضمون میں اس کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کی تخلیقات (ناول اور افسانے دونوں) نفس موضوع، فنی اسلوب اور تکنیک کے لحاظ سے خاصے پیچیدہ اور پہلودار ہیں۔ ان

کی حقیقت شعاری پر تخلیق میں زندگی کو کچھ نئے زاویوں سے دیکھتی ہے اور کچھ نئی جہتیں دریافت کرتی ہے۔ وہ اپنی تخلیقی ذہانت سے ناول کی اندرونی ساخت کو شگفتہ خوش آہنگ اور فکر انگیز بناتی ہیں۔ اظہار و بیان پر قدرت کے سہارے وہ ایسے جان دار مرقعے سجاتی ہیں، جن کی دلکشا فضا قاری کو بہالے جاتی ہے۔ وہ اپنے کرداروں کو تخیلی نزاکت اور مصورانہ چابک دستی سے تراشتی اور سنوارتی ہیں۔ لیکن یہ ایسے اوصاف ہیں، جن کے تفصیلی مطالعے کی ضرورت ہے۔

قرۃ العین حیدر اس حقیقت پر اصرار کرتی ہیں کہ قوموں کا تہذیبی تشخص ان کی تاریخ میں اور فرد کا تشخص ان کے ماضی میں پنہاں ہوتا ہے، اس لئے ان کے ناولوں میں ماضی اور حال دونوں کا تجربہ ایک ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے یہاں وقت ایک اکائی ہے۔ اور وہ حال کو ماضی کے اثرات و عوامل سے الگ نہیں کرتیں۔ "آگ کا دریا" "آخر شب کے ہمسفر" اور "گردش رنگ چمن" ان تینوں بڑے ناولوں میں ماضی کا سفر حال کو روشن تر بناتا ہے۔ تاریخی شعور انہیں ماضی پرستی سے بچاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ وقت کے بہاؤ کی بے رحمی کا گہرا احساس رکھتی ہیں اور اپنے کرداروں کے سلسلۂ عمل میں اس کا کرشمہ دکھاتی ہیں۔

قرۃ العین کے فن کی انفرادیت کا امتیازی پہلو جو ہر قاری کو متاثر کرتا ہے، ان کا خوبصورت رواں دواں اور شائستہ نثری اسلوب ہے، جس میں چستی ہی نہیں تہہ داری اور تنوع بھی ہے۔ اس اسلوب کا تعلق ان کی ذہنی افتاد اور نظریات سے بھی ہے۔ مثلاً وقت کے تسلسل اور انسان کی ازلی تنہائی کے بارے میں ان کے تصورات، اسی طرح داخلی خود کلامی اور شعور کی رو کی تکنیک کا جو محتاط استعمال وہ اپنے ناولوں میں کرتی ہیں اس سے بھی ان کے اسلوب کا تعین ہوتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناولوں اور کہانیوں میں انسانی وجود کے داخلی اضطراب، آشوب ذہنی اور احساس تنہائی کو نمایاں اہمیت حاصل رہی ہے۔ ان کی بیشتر تخلیقات میں ورجینیا وولف کے اس نظریے کا اثر بھی نظر آتی ہے کہ زندگی شعور کے آغاز سے انجام تک محیط روشنی کا ایک ہالہ ہے۔ ناول نگار کا کام یہ ہے کہ اس کی نازک خوب گونی، اجنبی اور پر اسرار کیفیتوں کو سچائی سے پیش کر دے۔ اس طرح کہ خارجی عناصر کم سے کم دخیل ہوں۔ اس تصور کے مطابق ناول میں زندگی اور واقعیت کی عکاسی کے تین طریقے ہیں۔ اول یہ کہ آزاد تلازمۂ خیال اور شعور کی رو سے کام لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ وجود کی تہہ داریوں کے انکشاف کے لئے علامتی اور ایمائی طرز بیان اختیار کیا جائے اور تیسرے یہ کہ مختلف کرداروں اور متعدد ذہنوں کو یکجائی اور وحدت کے روپ میں دکھایا جائے۔ قرۃ العین نے حسب ضرورت ان تینوں طریقوں سے کام لیا ہے۔ وہ اکثر خود کلامی اور تلازمۂ خیال کے ذریعے اپنے کرداروں کی روحانی زندگی کا انکشاف کرتی ہیں۔ ان کے جملے خیال کی روپ کی طرح رواں دواں اور آہنگ سے معمور ہوتے ہیں۔ وہ الفاظ کی ایمائی قوت سے ماحول کی تخلیق بھی کرتی ہیں۔ واقعیت کا رنگ بھی ابھارتی ہیں اور کہانی کے تانے بانے سے ماورا افسانوی حقائق کی طرف بھی قاری کی توجہ مبذول کراتی ہیں۔ لیکن اس عمل میں اظہار کی سطح پر ایک ایسی تازگی اور تشنگی اور ناقابل شکست تاثر قائم رہتی ہے جو محسوس ہو کر بھی غیر محسوس بنی رہتی ہے۔ "آگ کا دریا" سے صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔ یہ وہ منظر ہے جب گوتم نیلمبر عہد چندر گپت میں اپنے پہلے وجود کے ساحل پر پہنچ چکا ہے۔

......تب اس نے گھاٹ پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی سے پوچھا۔ اس لڑکی نے کیسری ساڑی پہن رکھی تھی اور اس کے بالوں میں چمپا کے پھول تھے۔ اس نے پوچھا "کچھ جانتی ہو۔ ندی کے اس پار کون رہتا ہے؟" "کچھ بھکشو لوگ رہتے ہیں۔" لڑکی نے بے پروائی سے جواب دیا اور پیر دھونے میں مصروف رہی۔ "وہ ان میں سے ایک ساتھ گھڑا تو ہے۔"

"تم اُسے جانتی ہو؟"

"میں اُسے جان کر کیا کروں گی۔" لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔

"اچھا میں ذرا مل سے مل آؤں۔"

"لیکن طوفانی ندی کو پار کرو گے؟ اس وقت تو یہاں کوئی ناؤ بھی نہیں ہے۔"

"کیا ہر ج ہے ندیاں پار کرنے کے لئے ہی تو ہیں۔"

موسم بے حد سہانا ہو چکا تھا۔ مور جھنکار رہے تھے۔ پپیہے چلا رہے تھے بھونرے گونج رہے تھے۔ کدم کے بہت سے پھول ڈال سے ٹوٹ کر اس کے قدموں میں آن گرے۔ اس نے جھک کر پھولوں کو اٹھایا اور ندی میں بہا دیا۔ پھر وہ پانی میں کود گیا اور دوسرے کنارے کی طرف تیرنے لگا۔

اتنے میں پانی کا ایک زوردار ریلا آیا جس کے تھپیڑوں سے وہ کنارے کے قریب پہنچ گیا۔ مگر اب پانی کی لہریں اونچی ہو چکی تھیں۔ اس نے پوری طاقت سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے مگر پانی میں اس سے زیادہ طاقت تھی۔ اسی کشمکش میں اسے ایک چٹان لٹکی نظر آئی، جو پانی کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ یہ چٹان کسی کے شکستہ مندر کا ایک حصہ تھا۔ جو ابھر کو جھک آیا تھا اس نے جلدی سے اس کی ایک نکڑ کو پکڑ لیا۔ اب وہ بہت ہی تھک چکا تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ پتھر کو پکڑ کر اس نے ذرا کی ذرا آنکھیں بند کیں۔ وقت کا ریلا پانی کو بہائے لئے جاتا تھا۔ چاروں اور وسعت تھی لیکن پتھر کو اپنی گرفت میں لے کر اس کو ایک لمحہ کے لئے اپنی حفاظت کا احساس ہوا لیکن اس کے ہاتھوں کی انگلیاں تھکی ہوئی تھیں اور وہ پل بھر سے زیادہ پتھر کو اپنی گرفت میں نہ رکھ سکا۔ سرجو کی موجیں گوتم نیلمبر کے اوپر سے گزرتی چلی گئیں.............."

اس پورے شہ پارے میں معنی کی کئی سطحیں ہیں۔ فضا آفریں لفظوں میں ایک منظر کا بیان بھی ہے اور ایک ایسے ماحول کی تخلیق بھی جہاں رنگوں اور آوازوں، سکوت اور تحرک کا عجیب و غریب امتزاج ہے۔ پھر یہی الفاظ ایمائی اور علامتی لباس پہن کر قاری کے ذہن میں دوسرے نقوش جگاتے ہیں۔ تخصیص سے تعمیم کی سمت لے جاتے ہیں۔ گوتم صرف گوتم نہیں رہتا۔ وہ کائنات کے آغوش میں پلنے والا ایک بیاحری انسان بھی ہے۔ جو طوفانی لہروں کو اس لئے پار کرتا ہے کہ وہ اس کی ہمت اور حوصلوں کو للکارتی ہیں۔ بہتے پانی میں پاؤں دھرتی ہوئی الھڑ لڑکی؛ دھرتی کا سہانا موسم؛ ڈال سے ٹوٹ کر اس کے قدموں میں گرنے والے کدم کے نازک پھول...... سب اس کا دامن کھینچتے ہیں۔ لیکن وہ وقت کے طوفانی دریا کی سمت بڑھتا ہی جاتا ہے۔ قاری سوچتا ہے کہ شکستہ مندر کی چٹان جو اسے کچھ دیر کو سکون بخشتی ہے کیا مذہب کا علامیہ ہے؟ یا کائنات کو بنانے والی کسی قادرہستی پر عقیدہ ہے؟ الغرض گوتم کے سفر کا یہ مرحلہ اور اس کا انجام دھرتی پر خود انسانی وجود کے سفر کی علامت بن جاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کی یکتائے روزگار شخصیت اور ان کے بے مثل ادبی شاہکار صرف عطیۂ فطرت یا الہام نہیں ہیں۔ اس کے پیچھے ان کی برسوں کی محنت، ریاضت، تلاش و تحقیق اور تفکر رہا ہے۔ اپنے ناولوں کے لئے مواد کی تلاش میں انہوں نے بیسیوں بلکہ برسوں کتب خانوں، پرانی حویلیوں اور قدیم دستاویزوں کی خاک چھانی ہے۔ دنیا کے بڑے ناول نگاروں ٹالسٹائی اور فلابیر کی طرح ایک ایک ناول کی تسوید میں انہوں نے کئی کئی سال کام کیا ہے۔ ''کار جہاں دراز ہے'' میں مصنفہ نے اُن گم شدہ زمانوں اور ان اُجڑ آبادیوں کو دریافت کیا ہے کہ جن کا تعلق اُن کے اجداد سے رہا ہے۔ اور جن کو وقت نے روند کر خرابہ بنا دیا ہے۔ یہ اردو میں اپنی نوعیت کی اچھوتی تخلیق ہے جو اردو میں وسیع معلومات فراہم کرتی ہے۔ لیکن جو افسانوی یا داستانوی طرز بیان کے باوجود ناول نہیں بن سکی ہے۔ اپنے دوسرے بڑے ناولوں ''آگ کا دریا'' اور ''گردش رنگ چمن'' میں انہوں نے سماجی اور تہذیبی تاریخ کے خزانوں سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا ہے اور اپنے زرخیز تخیل اور بے بہا تخلیقی ذکاوت سے تاریخی حقائق کو زندہ اور متحرک پیکروں میں ڈھال دیا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ایک ملی مشترکہ تہذیب کے گن گائے اور اپنے تہہ دار کرداروں میں ملی ہندوستانی شخصیت کو اجاگر کیا؛ جس کا خمیر کئی قوموں اور نسلوں کے تہذیبی اختلاط کا رہین منت ہے۔ وہ ہندوستانی تہذیب اور اس کے افکار و اقدار کو ایک ساحیاتی وحدت کے روپ میں دیکھتی ہیں اور اپنے ناولوں اور کہانیوں کے تار و پود میں ہنرمندی سے سمو دیتی ہیں۔

بلاشبہ ایسے عہد ساز اور باکمال تخلیق کار کئی صدیوں میں جنم لیتے ہیں۔

انتظار حسین

......پھر اس نے کہا اور اصل سیتا تم مجھے بے حد غیر جذباتی لگتی ہو مگر جلاوطنی کا مسئلہ مجھے بھی بہت پریشان کرتا ہے۔ مغربی برلن میں ہانگ کانگ میں ہر جگہ میں نے پناہ گزینوں کو دیکھا ہے۔ امریکن شہروں میں مشرقی یورپ سے بھاگے ہوئے لوگوں سے ملا ہوں۔ جارڈن میں فلسطین کے مہاجروں کی حالت دیکھی ہے اور میں جیا ستیا ست پر تم سے اکتا ہوں اور تمہاری ہر بات مذاق میں اڑانا چاہتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے ہم ایک ایسے دور میں زندہ ہیں جس میں چالیس کروڑ انسانوں کی نفسیات یکسر بدل گئی جہاں کے خیالات نظریے جذبات بدل گئے......

یہ قرۃ العین حیدر کی کہانی "سیتا ہرن" سے ایک مکالمہ ہے۔ کہنے والا عرفان ہے جو لاہور سے ہجرت کر کے کراچی جا بسا ہے جس سے کہا گیا ہے وہ سیتا میر چندانی ہے جو کراچی سے نقل وطن کر کے کراچی پہنچی۔ عرفان سیتا پر یہ جتا رہا ہے کہ تقسیم اور فسادات کے اثر سے اکھڑنے والی خلقت کے بارے میں وہ غیر جذباتی نہیں ہے مگر اس کا بیان کچھ اور غمازی کر رہا ہے۔ یہ کہ اس نے اپنی ذات اور اپنے گروہ کے حلقے سے نکل کر بھی دیکھا ہے اور دیس دیس بھٹکتے پناہ گزینوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس لئے اب اس قصے کے بارے میں اس کے یہاں ایک معروضی رویہ پیدا ہو گیا ہے۔ کچھ اسی قسم کی بات اس افسانے کی روشنی میں قرۃ العین حیدر کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔

ادب میں مسئلہ کسی واقعہ کو جذباتی شر انگیزی کے ساتھ بیان کر دینے کا نہیں ہوتا۔ یہ کام تو صحافت اور خطابت بھی بڑی خوبی سے انجام دیتی ہیں۔ ادب میں مسئلہ ایک تجربے کو اپنی تمام تہوں اور گہرائیوں سمیت گرفت میں لانے کا ہوتا ہے۔ تجربہ لکھنے والے کی گرفت سے کبھی اس وجہ سے نکل جاتا ہے کہ وہ تجربے سے اپنی ذات کو علیحدہ کر کے اسے نہیں دیکھ سکتا۔ اردو میں فسادات کے بارے میں افسانے، نظمیں اور غزلیں لکھی گئیں ان کے ساتھ بالعموم یہ دونوں طرح کے حادثے گزرے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کی کہانیوں اور ناولوں کا موضوع براہ راست فسادات نہیں بلکہ فسادات سے پیدا ہونے والی نقل مکانی کی ابتلا ہے جسے پاکستان میں آنے والوں نے ہجرت جانا اور اپنے آپ کو مہاجر کہا اور ہندوستان پہنچنے والے شرنارتھی کہلائے۔ قرۃ العین نے اس تجربے کو اپنی مختلف کہانیوں اور ناولوں میں اس گروہ کے واسطے سے دیکھا اور بیان کیا جس کا وہ خود حصہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا نقطہ نظر اس تجربے کے بارے میں اپنے گروہ کے عمومی نقطہ نظر سے مختلف تھا۔ بہر حال اس کہانی میں وہ اپنی ذات اور اپنے گروہ کے حلقے سے نکل کر غیر کے واسطے سے اس تجربے کو سمجھنے کی کوشش کرتی نظر آتی ہیں۔ اس واسطے سے ان کے لئے اس تجربے کو ایک معروضیت کے ساتھ دیکھنے اور بیان کرنے کی گنجائش نکل آئی ہے۔

سیتا میر چندانی سندھ کی ہندو لڑکی ہے جو اپنے ماں باپ کے ساتھ کراچی چھوڑ کر دلی پہنچی ہے۔ کراچی میں ان لوگوں کی کوٹھی تھی۔ جہاں اب مہاجر رہتے ہیں اور یہ گھرانا دلی میں قرول باغ میں ایک مسلمان کے چھوڑے ہوئے تنگ و تاریک مکان میں اس بے سروسامانی کے ساتھ پڑا ہے کہ سیتا اپنے جاننے والوں کو اس کا پتہ بتانے سے کتراتی ہے۔ اس گھر میں رامائن کا بہت چرچا ہے مگر اس روایتی ہندو گھرانے کی یہ بیٹی غیر روایتی روش پر چل نکلی ہے۔ اس نے ایک مسلمان نوجوان جمیل سے شادی کر لی ہے مگر جمیل اس کی محبت اور بے وفائی دیکھ چکنے کے بعد نیویارک میں پہنچ کر دوسری شادی کر لیتا ہے۔ جمیل کا تعلق اودھ کے ایسے گھرانے سے ہے جس کے زیادہ افراد ہجرت کر کے کراچی میں جا بسے ہیں اور جب ایک شادی کی تقریب سے سیتا کراچی اپنی سسرال جاتی ہے تو وہاں ایک مہاجر عرفان سے اس کا دل مل جاتا ہے مگر سیتا کو سکون نصیب نہیں ہے۔ کوئی ایک مرد اس کی ساری توجہ کا مرکز نہیں بن پاتا اور اب میں تلسی داس کی رامائن سے رجوع کرتا ہوں۔ شری سیتا جی نے جو بیابان میں سنہرا مرگ دیکھا جس کے انگ انگ کی کانت منوہر تھی تو شری رام چندر سے کہا کہ ستیہ سنکلپ سوامی اس مرگ کو مار کر اس کا چمڑا لے آئیے۔ اس ہرن پر ریجھ کر سیتا جی مصیبت میں گھر گئیں۔ ہرن قرۃ العین حیدر کی سیتا کی بھی کمزوری ہے۔ منوہر چھب والے ہرن اسے رجھاتے ہیں وہ ان کا تعاقب کرتے کرتے راون کے دیس لنکا میں جا پہنچتی ہے جہاں اس کے کئی پسندیدہ ہرن جمع ہو گئے۔ مگر ہر ہرن آخر میں راکشس نکلا ہے۔ سیتا میر چندانی بن باس میں ہے اور راکشسوں کے نرغے میں ہے۔ یہ بیسویں صدی کا بن باس ہے جب جنگل کٹتے جا رہے ہیں اور راکشس شہروں میں اکٹھے ہو رہے ہیں اور سیتا میر چندانی کے سر پر کسی رام کا سایہ نہیں ہے۔ ہرنوں کے تعاقب کی ایک توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ سیتا میر چندانی کو اصل میں رام کی تلاش ہے۔ وہ کتنے منوہر چھب والوں پر ریجھتی ہے ان میں کوئی ہندو ہے، کوئی مسلمان ہے، کوئی مصور ہے، کوئی ڈرامہ نگار ہے، کوئی روشن خیال دانشور ہے مگر کسی منوہر چھب میں رام کا روپ نظر نہیں آتا۔ تلسی داس کا ہم وطن روشن خیال جمیل سیتا میر چندانی سے شادی کرتا ہے، بیٹے کا نام راہل رکھتا ہے۔ جو مہاتما بدھ کے بیٹے کا نام تھا۔ پھر بیوی کو چھوڑ کر نیویارک چلا جاتا ہے۔ نروان کی تلاش میں نہیں عہدے کے چکر میں۔ ابوالقاسم، قمر الاسلام چودھری [illegible] اور آخر میں عرفان سب باری باری اپنی اصل ظاہر کرتے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں۔

سیتا میر چندانی کی ماتا جی ایک پاکباز عورت ہے۔ دنیا کے

جھگڑوں سے بے نیاز عقیدت کے نشے میں سرشار دن رات رامائن کا پاٹھ کرتی ہے مگر سیتا جی نے اپنے آپ کو دہرانے کے لئے سیتا میر چندانی کی ذات کو چنا ہے۔ سیتا میر چندانی کو ہم سیتا جی سے تضاد کی صورت میں پہچانتے ہیں۔ شاید یہ تضاد وقت کا تغیر ہے۔ شاید کہ عہد سے ستجگی عہد تک سفر کا نتیجہ ہے یا شاید یوں ہے کہ عورت کی تکمیل مرد سے ہے۔ رام سے وابستگی نے سیتا کو اس ابتلا میں مبتلا کیا ہے۔ رام میسر نہ آئے تو سیتا پھر سیتا میر چندانی بن کے رہ جاتی ہے مگر نذر چودھری نے یہ کہا کہ ہندو قوم کو اپنی تہذیب رامائن میں نہیں مہابھارت میں ملے گی۔ رامائن تو اس قوم کے ضعیف حافظہ کی یادگار ہے۔ آریاؤں کی تاریخ میں ایسا واقعہ ہندوستان میں آنے سے پہلے شاید مشرق وسطیٰ میں کہیں گزرا تھا کہ ایک آریائی سوما نے ایک شہر کا محاصرہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ ہندو قوم چونکہ یاد رکھنا نہیں چاہتی تھی کہ وہ ہندوستان سے پہلے کسی اور سرزمین میں ایک وقت گزار چکی ہے اس لئے اس نے اصل مقام کو فراموش کیا اور اس واقعہ کو ہندوستان کی سرزمین کے ساتھ اس طرح وابستہ کیا کہ وہ جنوبی ہند میں ان کی نو آبادیاتی مہمات کے ساتھ گڈمڈ ہو گیا۔

نذر چودھری کا یہ بیان میرے لئے قابل قبول نہیں ہے اور اس کی توجیہ خود نذر چودھری ہیں انہوں نے ہندو طرز عمل کا تجزیہ اس طور کیا ہے کہ یہ وہ آریائی ہیں کہ جنہیں اپنی جنم بھومی سے کہ مشرقی یورپ میں تھی نکلنا پڑا۔ صدیوں مشرق وسطیٰ میں بھٹکتے پھرے۔ ایران میں پہنچے مگر کسی زمین سے ان کی مفاہمت نہ ہو سکی۔ ہندوستان میں داخل ہوئے تو انہیں یہاں ویسے ہی دریا دکھائی دیئے اور ویسے ہی ہموار میدان نظر آئے جیسے ان کی جنم بھومی میں تھے۔ یہ نقشہ دیکھ کر وہ اس سرزمین پر ایسے ریجھے کہ اپنی جنم بھومی کو بالکل بھول گئے۔ مگر یہ زمین ان کی جنم بھومی کا بدل نہیں تھی۔ یہاں کی زمین نے رفتہ رفتہ ان کے لئے مسائل کھڑے کیے اور ان کا خوشی کا جذبہ سرد ہوتا چلا گیا۔ نئی زمین آسمان سے ان کی مفاہمت نہ ہو سکی اور پرانی زمین ان کے حافظے سے محو ہو چکی تھی اور نذر چودھری کہتے ہیں کہ جنت کے کھو جانے اور لٹنے کی کہانی ہندو دیومالا میں بار بار آتی ہے۔

اگر ہندو قوم کی داستان یہی ہے تو پھر تو مجھے لگتا ہے کہ رامائن ہی اس قوم کی بنیادی تحریر ہے یہ ان آریاؤں کی مہمائی داستان ہے جنہیں اپنی جنم بھومی سے نکل کر بن باس لینا پڑا۔ ایک مدت تک اپنی گمشدہ جنت کو یاد رکھا۔ رفتہ رفتہ وہ حافظے سے اتر گئی.... مگر کسی بات یا کسی تجربے کا حافظے سے اتر جانا اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ وہ تجربہ آدمی کی ذات سے خارج ہو گیا پھر تو وہ غیر شعور میں چھپ کر آدمی کے عمل کو متاثر کرتا ہے۔ شاید جنگل جنگل بھٹکتے ہوئے سیتا رام اور لچھمن انہیں بن باسی آریاؤں کی ترجمان ہیں اور شاید اجودھیا ان آریاؤں کی اسی گمشدہ جنت کا دوسرا نام ہے جو اپنے پہلے نام کے ساتھ ابتدائی حافظے سے محو ہو گئی۔ تلسی کی رامائن میں رام چندر جی یوں کہتے ہیں کہ اجودھیا جی کے سمان

مجھ کو بیکنٹھ بھی پیارا نہیں ہے۔ اس بات کو گیانی ہی جانتے ہیں کہ جتنے استھان پرتھوی پر ہیں۔ ان میں اجودھیا سب سے اول ہے اور تلسی داس نے بن باسیوں کی اپنے گھر میں واپسی اس رنگ سے بیان کی ہے کہ لگتا ہے کہ آریہ لوگ صدیوں کے دکھ درد کے بعد اپنی خوابوں کی سرزمین میں داخل ہو رہے ہیں۔

تو کیا بن باس آریہ نسل کا بنیادی طرز عمل ہے کہ ہر پھر کر یہ رخ کے کسی موڑ پر وہ نمودار ہوتا ہے اور اس نسل کے لوگوں کے عمل میں اپنے آپ کو دہراتا ہے اور ان کے سر بلاتا ہے کیا سیتا میر چندانی کے عمل میں اسی بنیادی طرز عمل کی کارفرمائی ہے تو پھر یوں کہیے کہ سیتا میر چندانی بے قرار آریائی روح کی تجسیم ہے ویسے سیتا میر چندانی کا جنسی رویہ بھی کسی قدر آریاؤں کے قدیم جنسی رویے کی چغلی کھاتا ہے۔ اس کے اندر قدیم آریائی عورت سانس لے رہی ہے جو اپنے جنسی جذبے پر بند باندھنا ضروری نہیں سمجھتی اپنے شوہر جمیل سے اسے بدستور محبت ہے مگر اسے جانے کیا ہو جاتا ہے کہ قمر الاسلام چودھری کی طرف ایسے کھنچتی چلی جاتی ہے "جیسے سانپ کی طرف اس کا شکار کھنچا چلا جاتا ہے" پھر وہ عرفان سے محبت کرنے لگتی ہے۔ اس محبت کی بھری بہار میں جمیل سے دوبارہ ملنے کی بھی کوشش کرتی ہے چندر ایک امریکی دوست کے ساتھ گزارتی ہے اور بڑی سادگی سے عرفان کو اس سے مطلع بھی کر دیتی ہے پھر دلی واپس آ کر وہ اس تصور میں مگن رہتی ہے کہ عرفان سے جب اس کی شادی ہو جائے گی تو وہ کراچی واپس جا سکے گی مگر اسی زمانے میں وہ عورتوں کے شکاری پروشتم بابو کے ساتھ کشمیر کے سیر سپاٹوں کے لئے نکل جاتی ہے۔ جب عرفان امریکہ سے اسے خط لکھ کر پوچھتا ہے کہ "تازہ ترین خبریں جو تمہارے متعلق سنی ہیں وہ صحیح ہیں؟" تو وہ کسی ریاکاری کسی تذبذب کے ساتھ نہیں بلکہ خلوص اور معصومیت کے ساتھ لکھ بھیجتی ہے "میں تمہیں اور صرف تمہیں چاہتی ہوں اور ابد تک چاہتی رہوں گی" اس سارے قصے میں سیتا کے یہاں کوئی احساس جرم پیدا نہیں ہوتا۔ نہ وہ کسی ذہنی الجھن کا شکار ہوتی ہے۔ نہ مکار اور بے وفا عورت کا روپ دکھاتی ہے۔ وہ ایک سیدھا سچا جنسی رویہ رکھتی ہے اور اس عہد کی یاد دلاتی ہے جب آریاؤں کی وہ جنسی توانائی جو وہ باہر سے لے کر آئے تھے برقرار تھی اور انہوں نے پاکبازی کا تصور عورت پر ابھی مسلط نہیں کیا تھا جو آگے چل کر گھٹتی ہوئی جنسی توانائی کے اثر میں آ کر مسلط کیا گیا اس کے باوجود اگر سیتا کی جنسی زندگی ایک حسی کیفیت کے ساتھ اس فسانے میں نہیں ابھرتی تو اس میں سیتا کا قصور نہیں، قصور قرۃ العین کی جھجک کا ہے۔

قرۃ العین حیدر سیتا کو مسٹر لیزلی کے ساتھ مسز لیزلی بن کر ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوتے تو دیکھتی ہیں۔ اس سے آگے انہیں تعاقب کرنے اور دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ پھر سیتا اس خاتون کو صبح ہی کو نظر آتی ہے۔ جب وہ سرخ پھولوں والا پردہ ہٹا کر دریچے سے باہر دیکھتی ہے۔ قرۃ العین کا اتنا دیکھ لینا

بھی بہت ہے۔ آگے تو ان کے کردار کسی جنسی جذبے کی چٹکی ہی نہیں کھاتے
تھے۔ بس ایک روحانی دھندلکے میں گم رہتے تھے۔

سیتا کا ذکر تمام ہوا۔ مگر کیا مضائقہ ہے کہ ایک نظر ان مہاجر
کرداروں پر بھی ڈال لی جائے جو اس افسانے میں ضمنی طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔
سیتا کے گھرانے کے مقابلے میں مہاجروں کے اس گھرانے کو دیکھیے تو عجب سا
احساس ہوتا ہے۔ یہ کہ اکھڑے ہوئے لوگ سیتا کے کنبے والے نہیں ہیں بلکہ یہ
لوگ ہیں۔ سیتا اور اس کے ماں باپ سندھ کی سرزمین سے ضرور اکھڑ گئے ہیں۔
مگر اپنی تاریخ اور دیومالا میں ان کی جڑیں برقرار ہیں۔ سیتا کی جیت یہی ہے کہ
وہ گھر سے بے گھر ضرور ہو گئی ہے لیکن اس بے گھر ہونے سے اسے ایک وسیع پس
منظر میسر آ گیا ہے اس پس منظر میں اس کا کردار تہہ دار بنتا ہے اور اس کے الم کو
ایک معنویت حاصل ہوتی ہے۔ مہاجروں کا کنبہ ایسے کسی پس منظر سے مالا مال
نظر نہیں آتا۔ اس کنبے کی کسی بوڑھی عورت کو ہجرت کی کوئی روایت یاد نہیں آتی۔
کسی جوان کے طرز عمل میں اس تجربے کی کارفرمائی دکھائی نہیں دیتی۔ یہ تحفہ
مہاجروں کے زوال احساس کے ساتھ قرۃ العین کے اس قدیم تجربے سے بے
اعتنائی کا غماز بھی ہے مگر میری دقت یہ ہے کہ میں نے بچپن میں رام لیلا بھی
دیکھی ہے اور ہجرت کی روایتیں بھی سنی ہیں اس لئے جب میں ہند اسلامی
تہذیب کے رنگ میں سوچتا اور محسوس کرتا ہوں تو ان دونوں تجربوں میں سے کسی کو
فراموش نہیں کر سکتا۔

اب میں آخر میں ان حضرات کو ایک خوشخبری دیتا ہوں جو ادب میں
افادیت تلاش کرتے ہیں۔ اس افسانے کا افادی پہلو یہ ہے کہ اس میں تاریخی
معلومات وافر مقدار میں فراہم کی گئی ہیں۔ سندھ کی تاریخ اور لنکا کے دیومالائی
ماضی کے متعلق مفصل بیانات اس افسانے میں موجود ہیں۔ یہ بیانات میرے لئے
تو مصری کی ڈلیاں ہیں جو تجربے میں تحلیل ہو جاتیں تو اچھا تھا اب بھی ان میں
لذت تو ہے مگر دانتوں میں آ کر کرکرا جاتی ہیں۔ رامائن کے اقتباسات بھی اس
افسانے کا زیور ہیں۔ مگر اس سلسلے میں بھی میری ایک مجبوری ہے۔ رامائن کو میں
معرب و مفرس زبان میں ہضم نہیں کر سکتا۔

کے یہ مختلف موڑ کہانی کے عمل کے لیے صرف ایک پس منظر کا حکم رکھتے ہیں۔ اور
اس لیے ناول کے واقعات اور تاریخ کے خارجی چوکھٹے میں سخت گیر مطابقت
ڈھونڈھنا یا قائم کرنا تنقیدی کاوشوں کو Distort کر سکتا ہے۔

ناول میں ایک جگہ یہ جملے ملتے ہیں:

.....وقت کے پیٹرن Pattern میں طلعت جہاں پہنچی تھی وہی
طلعت اسی پیٹرن میں ایک جگہ اور موجود تھی اور دونوں نقطوں کے درمیان برسوں
کا فاصلہ تھا۔ اور اس فاصلہ پر انسان صرف آگے کی طرف چل سکتا تھا آگے اور
آگے۔ پیچھے جانا ناممکن تھا۔ گو ہزاروں طلعتیں ان گنت ٹکڑوں میں منتشر ان
گنت جگہوں پر موجود تھیں جیسے آئینے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں ایک ہی
چہرے کے مختلف عکس آتے ہیں (ص ۳۶۶)

یہی جملے صفحہ ۱۵۳ پر دہرائے گئے ہیں۔ یہ جملے ناول کی ایک
نمایاں خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس ناول میں مرکزی کردار صرف چار
ہیں یعنی گوتم، ہری شنکر، چمپا اور کمال۔ اس طویل مدت میں جس پر یہ ناول پھیلا
ہوا ہے یہ کردار ناموں کے خفیف سے تفاوت کے ساتھ برابر ہمارے سامنے
آتے رہتے ہیں۔ اور ہر دور میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کرداروں کی بنیادی
خلقت ایک ہے صرف انہوں نے ہر نئی زندگی کی کینچلی کو اتار کر ایک نئی قبا زیب
تن کر لی ہے۔ وہی مانوس چہرے، وہی جانے پہچانے خد و خال، وہی حرکات اور
میلانات ہیں، جن سے ہم زندگی کی ہر شاہراہ پر دوچار ہوتے ہیں۔ تجربات کی
نوعیت ایک ہے، البتہ خارجی مظاہر جن میں وہ متشکل ہوتے ہیں بدل جاتے ہیں
"انسان چراغ کی طرح بجھ جاتا ہے" مگر واقعات اور احساسات کا دور تسلسل
قائم رہتا ہے" صفحات (۳۳ اور ۱۷) ایک نقطۂ نظر سے اس ناول میں ہیرو اور
ہیروئن کوئی نہیں ہیں۔ جن کی ابتدا اور ارتقا اور انتہا کو توازن اور تسلسل کے ساتھ پیش
کیا گیا ہو۔ یہاں صرف انسانوں کا جلوس رواں نظر آتا ہے۔ ایلیٹ کی نظم کے
اس ٹکڑے سے جو ناول کے شروع میں Epigraph کے طور پر دیا گیا ہے، یہ
ظاہر ہوتا ہے کہ ناول کا موضوع وقت کا وہ دھارا ہے جو انسان کی ارضی زندگی کی
وسعتوں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ انسان نے اب تک ارتقا کی
جتنی منزلیں طے کی ہیں ان میں سے چند روشن نقطوں کو ناول نگار نے چن لیا
ہے۔ اس مدت میں انسان نے خدا اور کائنات کے متعلق جس طرح سوچا ہے، خود
اور غیر خود میں، جس ہم آہنگی کی جستجو کی ہے، تہذیبوں اور سلطنتوں نے جس طرح
اپنے جھنڈے گاڑے ہیں۔ انسانی رشتوں میں محبت اور نفرت، ایثار اور خود
پسندی اور عقل و عشق کی آویزش نے جو پیچیدگیاں پیدا کی ہیں، تجربہ میں جو کرب
اور تلخی چھپی ہوئی ہے اور اس سے مجموعی طور پر شخصیت کے نشو و نما پر جو اثر پڑتا ہے،
مجرد فلسفہ اور مجرد تاریخ سے کہیں زیادہ یہی سب کچھ اس ناول کا موضوع ہے۔

"ساری چیزوں میں اے پروہت آگ لگ گئی ہے۔ آنکھیں
آگ میں جلتی ہیں اور اشکال اور بصارت" حیات، نفوذ، شوق، آوازیں، خوشبوئیں،
ذہن و دماغ، خیال، جسم، تصورات، سب دھڑ دھڑ اس آگ میں جل رہی ہیں اور
نفرت اور محبت اور پیدائش اور بڑھاپے اور موت اور رنج و الم اور دکھ اور گریہ
زاری اور مایوسی نے اے پروہت یہ الاؤ تیار کیا ہے" (صفحہ ۹)

اسے ہم ناول کا Interior Monologue کہہ سکتے ہیں
اور اس کے اجزا شروع سے آخر تک جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔

ان چار کرداروں کے علاوہ طلعت کا کردار ناول کے بیانیہ ڈھانچے میں
ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ گوتم، ہری شنکر اور چمپا کی طرح [illegible] اور سرل ایشلے بھی
جو برطانوی استعماریت کے آسیب کی حیثیت رکھتا ہے، ناول کی کئی منزلوں میں
ہمارے سامنے آتے ہیں۔ پیٹر (Peter) کو سرل کا ہمزاد کہا جا سکتا ہے۔ باقی
کردار جیسے تہمینہ، عامر رضا، ریکھا، شانتا، روشن آرا، اور مسز شیل ٹکر ناول کی
صرف بیرونی سطح (Periphry) پر نظر آتے ہیں۔ وہ کردار جن کا تعلق عوام
سے ہے، کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے اور ان کا ذکر بعد میں آئے گا۔ ناول کے
موضوع اور اس کے مرکزی اور نیم مرکزی کرداروں کی تخلیق کے اچھوتے پن کی
طرف سرسری اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس ناول کی اور خصوصیات جو قابل ذکر ہیں،
وہ ہیں پرزور بیانیہ قدرت، ڈرامائی تاثر، شدید کیفیات کی بازآفرینی، تکرار اور
اعادہ، کردار نگاری، خارجی فطرت کا دلنواز حسن اور عوام کے جذبات و احساسات
کی نقش گری۔

ناول کے ابتدائی حصہ میں ہم ہندوستان کی تاریخ میں ڈھائی ہزار
سال قبل کی فضا سے دوچار ہوتے ہیں۔ معاشرت، طرز فکر اور عقائد زندگی سب
وہی ہیں، جن سے اس دور کا انسان پہچانا جا سکتا ہے۔ مظاہر فطرت سے ہم آہنگی
انسان اور خدا کے رشتے کے متعلق ویدی اعتقاد، عمل میں سادگی، ریاضت اور
خلوص نیت سے گوتم کی شخصیت کے نقوش آشکار ہوتے ہیں۔ اس منزل ہی پر
یہ احساس ہوتا ہے کہ گوتم ایک مفکر کا ذہن، ایک فنکار کا وجدان اور ایک مخلص
انسان کا دل رکھتا ہے۔ اپنے اندرون میں بھی جھانک کر دیکھتا ہے اور عمل کو
ریاضت کی بھٹی میں تپا کر کندن بھی بنانا چاہتا ہے۔ ہری شنکر اس کے مقابلہ میں
سراسر حقیقت پسندانہ رویہ اور میلان رکھتا ہے۔ چمپک، جو بعد کی چمپا اور چمپا
باجی کا نقش اولین ہے، گوتم کی پرسکون کائنات میں تموج پیدا کرنے کا وسیلہ بنتی
ہے۔ گوتم، جو اب تک صرف روح کی عظمت اور تقدیس کا قائل تھا اور جس کی
تمام تر کوششیں اس کا تزکیہ حاصل کرنے پر مرکوز تھیں، تجربہ کی ایک نئی وسعت
(Dimension) سے آشنا ہوتا ہے۔

..... اس ایک رات میں وہ دفعتاً بڑا ہو گیا تھا۔ اس نے دل کی
کائنات کی سیاحت کی تھی۔ اس نے مایا کا تجربہ کیا تھا اور اس تجربے سے غیر
مطمئن نہیں تھا۔ لیکن یہ کیسا عجیب احساس تھا۔ جیسے تیر کی بجائے زندگی کا سارا

زہر ہلاہل اس نے خود پی لیا ہو' کیسا انوکھا تجربہ تھا' اس کی شرط تو اس نے کہیں سے نہیں لگائی تھی... (صفحہ ۱۰۲)

مگدھ کی لڑائی میں جو پہلے دور کے دوسرے حصے میں ہوتی ہے' گوتم اپنے ہاتھوں کی انگلیاں کھو بیٹھتا ہے' اور تصویر کشی کے مشغلے سے محروم ہو جاتا ہے:

..... تب اُسے ایک اٹل حقیقت کا اندازہ ہوا' ہاتھ انگلیاں جو حسن کی تخلیق کے لئے بنائی گئی ہیں خون میں نہلا دی جاتی ہیں۔ کسی خاموش وہار میں بیٹھ کر وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا..... تب اس نے اپنی کٹی ہوئی انگلیوں کو دیکھا اور سوچا کہ یہ اس کے کرم کا پھل ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ کرم کے فلسفے سے اسے بڑا سکون حاصل ہوا۔

(۱۱۸۔۱۱۹)

یہ ایک اہم تجربہ تھا جو گوتم کو حاصل ہوا۔ ان الفاظ میں جو کرب چھپا ہوا ہے اور اسے انگیز کرنے کا جو بے پایاں عزم ہے اس نے گوتم کے کردار کو ناقابل فراموش بنا دیا ہے۔

دوسرے دور میں ہم کمال کے تشخص ہوں' ابوالمنصور کمال الدین سے ملتے ہیں' جو حسین شرقی کے کتب خانے کا نگراں ہے۔ اور ہندوستان کی پرخلوص تہذیب میں ایک نئے عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ شروع ہی میں اس کی ملاقات چمپا سے ہوتی ہے جو پہلے دور کی چمپک کا ایک نیا روپ ہے۔ کمال الدین کی شخصیت کے ارتقاء میں جو چیزیں معاون ہوتی ہیں' وہ ہندی اور اسلامی فلسفہ کا ٹکراؤ اور فارسی شاعری اور محبت کے تصور میں تبدیلی ہے۔ اور دوسری طرف انسانی بے بسی کا وہ تاثر جو پیہم جنگوں کے تجربے نے اس کے دل و دماغ پر قائم کیا ہے۔ ان عناصر سے مل کر جو تخم ریزی اس کے دل میں کی تھی' وہ محبت اور آشتی کے ان نغموں کے زیر اثر برگ و بار لاتی ہے' جو کبیر نے اس سرزمین میں ہی بلند کئے تھے۔ شخصی اور انفرادی سطح پر اس کا نتیجہ کمال الدین کی شیلا سے شادی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے:

..... لیکن روح' جسم و دل کی کائناتوں کی ساری مسافتیں طے کرنے کے بعد اس نے اندازہ لگایا کہ زندگی میں اصل چیز سکون ہے۔ ایسا سکون جس میں پر خطر طوفانوں اور آندھیوں کی گنجائش ہی موجود نہ ہو۔ یہ سکون اسے اس سیدھی سادی ان پڑھ دیہاتی لڑکی سے شادی کر کے حاصل ہو گیا' گویا یہی اس کی منزل تھی... (۱۹۷)

تیسرے دور میں ہم پہلی بار سرل ایشلے سے دوچار ہوتے ہیں۔ جس کی اقدار زندگی' معاشی آسودگی' اقتدار اور اخلاق اور روحانی نزاع ہیں۔ برطانوی استعماریت کے جو نتائج ہندوستانیوں کی سیاسی اور معاشی ابتری کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ اس کی عکاسی اس دور میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ سرل کے سلسلے میں یہ بات قابل غور ہے کہ حکومت اور اقتدار کے نشے میں وہ اخلاقی غیر ذمہ داری کی حدوں کو چھو لیتا ہے اور عیش و نشاط کو اس نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے' مگر پایان کار ضمیر کی خلش ایک مرتبہ اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے اور جب وہ اپنی داشتہ شیلا سے جسے وہ عرصہ ہوا چھوڑ چکا تھا' شراب خانے میں یکبارگی مڈبھیڑ ہو جانے کے بعد پیچھا چھڑا کر بھاگتا ہے' تو گذشتہ یادوں کے تمام بھوت اس پر یک ساتھ حملہ کر دیتے ہیں' اور وہ اپنی تنہائی کے خوف سے مضطرب ہو جاتا ہے۔ یہاں ڈرامائی تاثر بہت واضح طور پر سامنے آتا ہے:

.... اس نے کیبارے کو دیکھا۔ زندگی کا سارا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گذرتا جا رہا تھا۔ یہ زندگی کا فانوس تھا اور وہ خود تنہا اس میں مقید تھا اور اس کے چاروں طرف [illegible] تصویریں بنی تھیں اور اسے ان تصویروں سے ڈر لگ رہا تھا۔ گورنمنٹ ہاؤس کے رقصائے کاز' کالج کے منشی اور شاذ ایشیاٹک سوسائٹی کے محقق' اودھ کے شعر اور فن کاری کہ لکھنؤ کی چمپا بائی' یہ سب مل کر اس کی روح کے گرد گھومنے لگے تھے..... (صفحہ ۲۳۳)

اس طرح کا ایک ڈرامائی حصہ ہمیں وہاں ملتا ہے جہاں گوتم کا دوسرا تشخص گوتم نیلمبر اپنے بیٹے منورنجن کے یہاں مقیم ہے اور رات کو جب سب سو جاتے ہیں تو وہ چپکے سے باہر نکل کر گومتی کے کنارے کنارے چل کھڑا ہوتا ہے اور ماضی کے بھوت سرل کی طرح اسے بھی آ دبوچتے ہیں "سارے شاہان اودھ..... ان..... بھوتوں کو بھی وہ خوب جانتا تھا..... آج کی رات جانے کون کون مرا ہوگا" (صفحہ ۲۸۰)

فنی نقطہ نظر سے دو اور مقامات بھی اہم ہیں۔ گوتم نیلمبر جس کا ذکر ابھی ہوا سرل ایشلے کا بنگالی کلرک ہے اور چمپک کا دوسرا تشخص لکھنؤ کی مشہور طوائف چمپا کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ پہلا قابل ذکر مقام وہ ہے' جب گوتم لکھنؤ سے کلکتہ واپسی کے دوران راجہ بنی پرساد کے بیٹے سے جو ایک جوگی ہے یہ الفاظ سنتا ہے:

..... سراب کی حقیقت تو میں نے جانی ہے۔ تم اس کی حقیقت کو کیا جانو۔ تم اسی چکر میں شامل رہو گے..... تم سمجھتے ہو کہ تم اس بھول بھلیاں سے نکل آئے ہو' مگر تم غلطی پر ہو۔

(۲۶۳۔۶۴)

اور دوسرا وہ جب نیلمبر کے کان میں ایک جانی پہچانی آواز سینکڑوں ہزاروں برس کا فاصلہ طے کر کے پہنچی تھی اور اس نے پھٹی پرانی دلائی میں لپٹی ہوئی دلگیر بھکارن کو ایک روپیہ خیرات کے طور پر دیا تھا' جو ان کا دیا ہوا روپیہ لیمپ کی روشنی میں الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی جیسے اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا ہو۔ اس کے بال چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ اور اس کے چہرے پر ان گنت جھریاں تھیں۔ اس کی دلائی میں جا بجا پیوند لگے تھے۔ کہیں کہیں پر

کوکھروا اور بنت گئی وہ تھی جس کے کنارے نکلے ہوئے تھے" (ص ۲۷۹)

یہی بھکاری اس سے پہلے یہ جملہ دہراتی رہی تھی "خدا سواتم حسین کے اور کوئی غم نہ دے"۔ یہ چمپا تھی' جو وقت کی آسیا میں پوری طرح پس چکی تھی۔ شدت احساس کے اعتبار سے یہ دو تراشے اس ناول میں دو اوراق اشوں کی طرح بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ جدید لکھنؤ کی عکاسی تیسرے دور میں جس طرح کی گئی ہے' وہ ہمیں قرۃ العین حیدر کے اس سے پہلے کے ناولوں کی یاد دلاتی ہے یہاں کمال الدین کا تیسرا انکش' جو اسی دور کے پہلے حصہ میں نواب کمبی کی صورت میں نظر آیا تھا' اب کمال کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے اور جمپک کا تیسرا انکش چمپا باجی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ نرملا' گوتم ہری شنکر پھر سامنے آتے ہیں۔ نئم مرکزی کرداروں میں طلعت کا اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ کمال اور چمپا اہمیت رکھتے ہیں۔ رومان کی سطح پر جو مثلث بنتا ہے' اس کے تین نمائندے تہمینہ' عامر رضا اور چمپا احمد ہیں۔ تیسرے دور کے اس دوسرے حصہ اور چوتھے دور میں جو فارغ البال اور بری متوسط طبقہ کی ذہنی اور جذباتی سرگرمیوں کا آئینہ خانہ ہے' ازابیلا تھوبرن کالج اور کیننگ کالج لکھنؤ کی بے فکریوں اور کھلنڈرے پن کی داستان ہے' گلفشاں اور سنگھاڑے والی کوٹھی کے معمولات کا ذکر ہے' لندن اور کیمبرج کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا بیان ہے' پکنک' بیلے' کنسرٹ اور پارٹیوں کی چہل پہل ہے' موسیقی اور مکمر اشی کے مرکزوں کی نشاندہی ہے۔ لیکن ان کے علاوہ چند اور باتیں بھی قابل ذکر ہیں۔ اور یہ کہ طلعت ایک خاص طرح کی لاتعلقی' احساس برتری اور نقطۂ نظر کے اعتدال کا اظہار کرتی ہے' اور اس تمام ہنگامے پر مسکرانے والے تماشائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسرے چمپا احمد کی شخصیت میں سوچنے کا جو انداز ہے' تمناؤں اور آرزوؤں کے پامال ہو جانے پر جو خاموش احتجاج ہے اور تمام دوسرے کرداروں کے برعکس وہ جس نقطۂ خیال کو پیش کرتی ہیں' وہ توجہ کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ پھر عامر رضا ہیں' جو ہری شنکر کی طرح حقیقت پسند ہیں اور نہ دل و دماغ پر چوٹ پڑنے دیتے ہیں اور نہ اپنے دامن کو راہ کے خس و خاشاک میں الجھاتے ہیں۔ فنی اعتبار سے ڈرامائی تاثر اس موقع پر ظاہر ہوتا ہے' جہاں ڈلکشا کے باغات میں کمال اور چمپا وغیرہ پکنک منانے چاندنی رات میں آئے ہوئے ہیں اور یہاں نواب قدیر گل اور چمپا کے درمیان ایک تمثیلی مکالمہ شروع ہوتا ہے (صفحات ۲۰۵-۲۰۶) جس کے ذریعہ ماضی کے بہت سے نقوش چشم زدن میں ابھر آتے ہیں۔ لیکن اس پوری الف لیلوی داستان کے جذباتی مراکز تین ہیں۔ اول سیاست کے میدان میں اس کمال کی زبردست شکست جو عوامی جمہوریت' متحدہ قومیت اور ہندوستان کی پراچین تہذیب کا پرستار رہ چکا ہے' دوسرے وہ تلخی' کرب اور دل برداشتگی' جو آرزوؤں اور خواہشوں کے صنم خانے کے مسمار ہونے پر چمپا کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور تیسرے آفاقی المیہ کا وہ مرحلہ جو ڈیرسٹ کے سینے ٹوریم میں نرملا کی موت کی صورت میں انسان کی بے بسی اور بے چارگی کو ظاہر کرتی ہے۔ ناول کا پانچواں دور تقسیم کے بعد کے واقعات کے پس منظر میں تعمیر کیا گیا ہے۔ جن کرداروں سے ہم لندن اور کیمبرج میں ملے تھے' وہ واپس آ کر مختلف خطوں کا رخ کرتے ہیں۔ کمال اور چمپا دونوں نئی اور تلخ حقیقتوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ کمال عمل کا راستہ اختیار کرتا ہے اور چمپا صرف سہتے رہنے کا۔ متحدہ قومیت کا دلدادہ کمال نئی مملکت کا رخ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ چمپا جو لکھنؤ اور کیمبرج میں اپنی ذہنی برتری کی دھاک بٹھا چکی تھی' مراد آباد میں اپنے چچا کے پاس ایک چھوٹے شکستہ مکان میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہے۔ تقسیم کے بعد پاکستان میں جو معاشرہ وجود میں آیا ہے اس کی عکاسی کے سلسلے میں ناول نگار پر بہت لے دے کی گئی ہے جو غلط نقطۂ نظر کو برتنے کا نتیجہ ہے۔ ناول نگار نے حالات کا جو تجزیہ کیا ہے وہ بڑی حد تک دیانتداری پر مبنی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہم عصری واقعات کو تخلیقی فن پاروں کا موضوع بنانے کے لئے وقت اور فاصلے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ دیانتدارانہ عکاسی کے باوجود ہم ان عوامل کے سمجھنے میں غلطی کریں جو خارجی حالات کے پس پشت کام کر رہے ہیں اور ان قوتوں کا خاطر خواہ اندازہ نہ کر سکیں جن کی جڑیں عوام کے سینوں میں پیوست ہیں اور جن پر مستقبل کا دارومدار ہے۔ یہ قیاس کرنا صحیح نہیں' کہ اس تجزیہ اور عکاسی کے پیچھے کوئی تخریبی میلان اور جذبہ کام کر رہا ہے۔

ناول کے اس آخری حصہ میں صرف کمال اور چمپا ہی دو ایسے کردار ہیں جو ہماری توجہ کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔ تخلیقی طور پر ناول کا عمل اس آخری سین میں سب سے زیادہ موثر طور پر سامنے آتا ہے' جو چمپا کے چچا کے گھر میں مراد آباد میں دکھایا گیا ہے۔ کمال دوبارہ ہندوستان آ کر اور ماضی اور حال کا احتساب کرنے کے بعد جس منزل پر پہنچ چکا ہے' اس کی نشان دہی یہ جملے کرتے ہیں:

.... مگر یہ وطن نہیں تھا۔ اس کے ویزا کی معیاد ختم ہونے والی تھی۔ کل سویرے وہ یہاں سے اپنے ملک روانہ ہو جائے گا۔ مراد آباد' کلکتہ... چمپا احمد' بابا' مریم' چاہا' سب پیچھے رہ جائیں گے۔ کیا اس حقیقت پر اسے آنسو بہانا چاہئے' لیکن اب اسے محسوس ہوا کہ وہ بڈھا ہو چکا ہے۔ اس میں ضبط آ گیا ہے۔ ضبط' توازن اور سکون (ص ۷۵۱)

اور چمپا احمد جذباتی اور ذہنی شکست اور پسپائی کے بعد جس نقطۂ شدت کو چھو چکی ہے' وہ ان جملوں سے مترشح ہے:

.... "میں ایک عام اوسط درجہ کی لڑکی ہوں" چمپا کہتی رہی "اگر میں خدا کا خاص الخاص بندہ ہوتی' میرا آکاباآئی سینٹ صوفیہ' تو میرے جسم پر زخموں کے نشان نظر آتے' میرا لبادہ میرے مقدس خون سے سرخ ہوتا' میرے ہاتھوں میں میخیں گڑی ہوتیں' میرے سر کے گرد نور کا ہالہ ہوتا' مجھے وش کے

پیالے اور سانپ کے پٹارے بھجوائے گئے ہوتے لیکن میں بھی چمپا رہی ہوں۔ میرے غم کی کوئی نظر نہیں آسکتے کیونکہ میرے سنتا شائی بھی میری طرح جڑی ہیں۔ وہ کمزور اور فانی انسان ہیں جنہیں جنم نبھا نہیں رکھے..... (ص ۷۵۵)

اس منزل پر پہنچ کر کمال اور چمپا دو فردی کردار نہیں رہتے بلکہ اس المیہ کا ممثل بن جاتے ہیں جو ہم سب کا المیہ ہے۔

اس ناول میں بیانیہ قوت کا اعجاز ہمیں بہت سی جگہ نظر آتا ہے۔ اس کی سب سے پہلی مثال شراوستی کے شہر کی چہل پہل اور وہاں کے لوگوں کی مصروفیات اور مشاغل کے بیان میں ملتی ہے۔ "شراوستی کا شہر بہت گنجان اور بارونق تھا..... عود اور لوبان کی خوشبو سے فضا بوجھل ہو جاتی" (صفحہ ۳۰)۔ دوسری مثال ایک دیہات کی تصویر اور اس کے متعلقات میں ملتی ہے۔ "آخر اس نے لکھنوتی، گوڑ اور ستار گاؤں کی چہل پہل کو چھوڑ کر دیہات کا رخ کیا..... ڈھور چر رہے تھے" (صفحہ ۱۱۷) تیسری مثال لکھنؤ کی مشہور طوائف چمپا کے گھر کے نقشہ میں موجود ہے "کمرے پر بڑا ٹھاٹھ تھا..... طلعت لمبی عمر کے لئے شرمایا سا دروازے کے پاس کھڑا اس منظر کو دیکھتا رہا" (صفحات ۴۲۸-۴۲۹) اور چوتھی اور بے حد موثر مثال مراد آباد میں چمپا باجی کے محلہ کا بیان ہے "وہاں آگے سے اترا سامنے بڑا سا پرانے وقتوں کا پھاٹک تھا..... اس نے پھاٹک کی کنڈی کھٹکھٹائی" (صفحات ۷۴۶-۷۴۵) ان چاروں تراشوں میں ناول نگار نے جس طرح ایک ایک تفصیل کو نظر میں رکھ کر پوری تصویر کو بے نقاب کیا ہے اور منظر کی روح کو اسیر کیا ہے، اس سے مشاہدہ اور تخیل دونوں کی صحت اور قوت کا ثبوت ملتا ہے۔ ان تراشوں کو سامنے رکھنے سے ان چاروں جگہوں کا ایک ایک نقش زندہ اور جاندار معلوم ہونے لگتا ہے۔

یہ چند کہ اس ناول کا بیشتر حصہ اوپری درمیانی طبقے کی زندگی کی عکاسی پر مشتمل ہے، لیکن اس میں عوام کی زندگی کے نقش و نگار بھی واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ اس میں ہمیں اس گوالن (تنابالا) کی تصویر ملتی ہے، جس نے گوتم کے گھاؤ صاف کئے اور اسے گائے کا دودھ پلایا۔ اس یوریشین لڑکی ماریا تیریزا کا ذکر ملتا ہے، جو نہایت سادگی کے ساتھ سرل جیسے گرگ باراں دیدہ کے جھوٹے اظہار محبت پر ایمان لے آئی۔ اس میں ہم رجب علی بہادر کے جوگی بیٹے سے متعارف ہوتے ہیں جس نے تجربات زندگی کے زہر کو امرت جان کر پی لیا۔ اس بڑھیا سے ملتے ہیں جو حسن کی رعنائیوں کے بکھر جانے پر اپنے وجود کی صرف ایک پرچھائیں معلوم ہوتی تھی اور جسے طلعت نے ایک روپیہ دیا۔ اس میں ہماری ملاقات ابوالمنصور کمال اور اس کی بیوی آمنہ سے ہوتی ہے، جو اپنی بے داغ اور پرمشقت زندگی پر قانع ایک دوسرے کی محبت کے سہارے ہر طرح کی صعوبتوں کو مردانہ وار برداشت کرتے ہیں۔ اس میں ہمیں سرل کی داشتہ شیلا نظر آتی ہے، جو نہایت سادہ لوحی سے طلعت کے سپرد یہ کام کرتی ہے کہ وہ لکھنؤ جا کر چمپا سے یہ کہے کہ وہ سرل صاحب کو اپنے دام تزویر میں گرفتار نہ کرے۔ یہاں ہمیں ڈرائیور رفیق اور اس کی بیوی قمرن ملتے ہیں۔ بنگال کے قحط میں تنگدستی اور بے بسی کی حالت میں جان دے دیتے ہیں۔ اور آخر آخر میں کشادہ دل اور روشن جبیں سنتھالوں کا وہ گروہ ملتا ہے جس سے سرل اور کمال راج شاہی کے دورے کے زمانہ میں دوچار ہوتے:

..... ایک گاؤں میں سارے سنتھال ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ ایک سیاہ فام بے حد دلکش لڑکی نے آگے بڑھ کر گیندے کے ہار ان کے گلے میں ڈالے اور ہاتھ جوڑ کر ان کے آگے جھکی۔ ان کا ٹھاکر جس کی ناک کٹی ہوئی تھی، جس سے اس نے اپنی لاٹھی باندھ رکھی تھی ان کے اعزاز میں اپنی اکلوتی تانا رشیں پہن کر ان کو رخصت کرنے بستی کے موڑ تک آیا۔ ایک نوجوان نے تالاب میں سے سرخ کنول نکال کر سرل کو پیش کیا........... (ص ۷۳۲)

اس ناول میں جو نچلے طبقے کے افراد کی ذہنی اور جذباتی کشمکش اور پیچیدگیوں کا آئینہ ہے، انہیں معمولی لوگوں کے جذبات و احساسات کی مصوری سے تازہ زندگی کا ایک جھونکا آکر فضا کے بوجھل پن کو لطیف و تابناک بنا دیتا ہے اور ہمارے اندر دیرینہ محبت، عزم اور جانبازی اور سپردگی کے جذبات کو بیدار اور مستحکم کرتا ہے۔

جس وسیع رقبہ پر اور جس وسعت نظر کے ساتھ اس ناول میں تاریخی شعور اور تخلیقی فن کے آداب کو سمویا گیا ہے اس کے پیش نظر "آگ کا دریا" نہ صرف ناول نگار کے اب تک کے کارناموں میں شاہکار کا درجہ رکھتا ہے بلکہ ہماری زبان کے ادب میں بھی اس کی جگہ ایسی منفرد اور ممتاز ہے کہ اس کی ہمسری شاید مدت تک ممکن نہ ہو۔ اس پر کسی مخصوص سیاسی نقطہ نظر سے تنقید اس کے بنیادی منشاء، اس کے جمالیاتی ڈھانچہ اور اس کے ذریعہ پیش کی ہوئی بصیرت سے تغافل برتنا اسے جھٹلانا ہے۔ صرف اتنا کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ ابتدائی حصہ میں ناول نگار نے جس طرح سوجھ بوجھ اور فنی قدرت کا اظہار کیا ہے، وہ آخری حصہ میں اس حد تک نظر نہیں آتا۔ اسی لئے اس میں کسی قدر طوالت، تکرار اور عصبیت در آئی ہیں لیکن حال کی ایسی حقیقتوں پر جنہوں نے شدت تاثر کو اکسایا ہو تخلیقی کارنامہ کی بنیاد رکھنے کے لئے اپنے آپ کو اس سے الگ رکھ کر دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم اس کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ ناول کے آغاز یا انجام میں کہیں بھی تخریبی اور منفی رجحان کا غلبہ نہیں ہے۔ تجربات زندگی کے بطن میں کرب، تلخی اور تضاد کے باوجود امید کی جو ہلکی سی کرن ہے، وہ اس محیط تاریکی میں انسان کے لئے بہت بڑا سہارا ہے۔

...... چنانچہ گوتم نیلمبر، آندھیاں، طوفان، جھکڑ ان سب میں سے گذرتا سرجو کی لہروں پر بہتا وہ گوری شنکر کی اونچی چوٹی پر چڑھ کر بادلوں میں چھپ گیا۔ چوٹی پر وہ دو زانوں بیٹھ گیا اور اس نے دیکھا کہ چاروں اور

ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہا موجود ہے۔ دنیا کا ازلی اور ابدی انسان تھکا ہوا، شکست خوردہ،
بشاش، پُر امید۔ انسان جو خدا مثل ہے اور جو خدا ہے..... (صفحہ ۷۸)

کارمن

قرۃ العین حیدر

رات کے گیارہ بجے ٹیکسی شہر کی خاموش سڑکوں پر گزرتی ایک پرانی وضع کے پھاٹک کے سامنے جا کر رکی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھول کر بڑی نفاست کے ساتھ میرا سوٹ کیس اتار کر فٹ پاتھ پر رکھا اور پیسوں کے لیے ہاتھ پھیلائے تو مجھے ذرا عجیب سا لگا۔

"یہی جگہ ہے؟" میں نے شبہے سے پوچھا۔

"جی ہاں" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ میں نیچے اتری ٹیکسی گلی کے اندھیرے میں غائب ہو گئی اور میں سنسان فٹ پاتھ پر کھڑی رہ گئی۔ میں نے پھاٹک کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر سے بند تھا۔ تب میں نے بڑے دروازے میں جو کھڑکی لگی تھی اسے کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر بعد کھڑکی کھلی۔ میں نے چوروں کی طرح اندر جھانکا۔ اندر نیم تاریک آنگن تھا جس کے ایک کونے میں دو لڑکیاں رات کے کپڑوں میں ملبوس آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ آنگن کے سرے پر ایک چھوٹی سی شکستہ عمارت ایستادہ تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے گھسیاری منڈی لکھنؤ کا اسکول یاد آ گیا جہاں سے میں نے بنارس یونیورسٹی کا میٹرک پاس کیا تھا۔ میں نے پلٹ کر گلی کی طرف دیکھا جہاں مکمل تاریکی طاری تھی۔ فرض کیجیے...... میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ جگہ اچکوں، بردہ فروشوں اور اسمگلروں کا اڈہ نکلی تو......؟ میں ایک اجنبی ملک کے اجنبی شہر میں رات کے گیارہ بجے ایک گمنام عمارت کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی جو گھسیاری منڈی کے اسکول سے ملتا جلتا تھا۔

ایک لڑکی کھڑکی کی طرف آئی۔

"گڈ ایوننگ! یہ وائی ڈبلیو سی اے ہے نا؟" میں نے ذرا لجاجت سے مسکرا کر پوچھا "میں نے تار دلوایا تھا کہ میرے لیے ایک کمرہ ریزرو کر دیا جائے" مگر کس قدر بوسیدہ حال وائی ڈبلیو سی اے ہے یا میں نے دل میں سوچا۔

"ہمیں آپ کا تار نہیں ملا اور افسوس ہے کہ سارے کمرے گھرے ہوئے ہیں۔"

اب دوسری لڑکی آگے بڑھی.... "یہ گرلز ہوسٹل ہے۔ یہاں عام طور سے مسافروں کو نہیں ٹھہرایا جاتا" اس نے کہا۔

میں یک لخت بے حد گھبرا گئی۔ اب کیا ہوگا؟ میں اس وقت یہاں سے کہاں جاؤں گی؟ دوسری لڑکی میری پریشانی دیکھ کر خوش خلقی سے مسکرائی۔

"کوئی بات نہیں۔ گھبراؤ مت۔ اندر آ جاؤ۔ ادھر سے کود آؤ"

"مگر کمرہ کوئی خالی نہیں ہے......" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "میرے لیے جگہ کہاں ہوگی؟"

"ہاں ہاں کوئی بات نہیں ہم جگہ بنا دیں گے۔ اب اس وقت آدھی رات کو تم کہاں جا سکتی ہو؟" اس لڑکی نے جواب دیا۔ میں سوٹ کیس اٹھا کر کھڑکی سے اندر آنگن میں کود گئی۔ لڑکی نے سوٹ کیس مجھ سے لے لیا۔ عمارت کی طرف جاتے ہوئے میں نے جلدی جلدی کہا "بس آج کی رات مجھے ٹھہر جانے دو۔ میں کل صبح اپنے دوستوں کو فون کروں گی۔ میں یہاں تین چار لوگوں کو جانتی ہوں۔ تم کو بالکل زحمت نہ ہوگی۔"

"فکر مت کرو......" اس نے کہا۔ پہلی لڑکی شب بخیر کہہ کر غائب ہو گئی۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں پہنچے۔ برآمدے کے ایک کونے میں لکڑی کی دیوار کھینچ کر ایک کمرہ سا بنا دیا گیا تھا۔ لڑکی سرخ پھولوں والا دبیز پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے گئی۔ "یہاں میں رہتی ہوں، تم بھی یہیں سو جاؤ" اس نے سوٹ کیس ایک کرسی پر رکھ دیا اور الماری میں سے صاف تولیہ اور نیا صابن نکالنے لگی۔ ایک کونے میں چھوٹے سے پلنگ پر مچھردانی لگی تھی۔ برابر میں سنگھار میز رکھی تھی اور کتابوں کی الماری۔ جیسے کمرے ساری دنیا میں لڑکیوں کے ہوسٹلوں میں ہوتے ہیں...... لڑکی نے فوراً دوسری الماری میں سے چادر اور کمبل نکال کر فرش کے گھسے ہوئے بدرنگ قالین پر بستر بچھا دیا اور پلنگ پر نئی چادر بچھا کر مچھردانی کے پردے گرا دیے۔

"لو تمہارا بستر تیار ہے۔"

مجھے بے حد ندامت ہوئی۔ "سنو میں فرش پر سو جاؤں گی۔"

"ہرگز نہیں۔ رات بھر مچھر کاٹیں گے کہ حالت تباہ ہو جائے گی۔ ہم

لوگ ان مچھروں کے عادی ہیں۔ کپڑے بدل لو" اتنا کہہ کر وہ اطمینان سے فرش پر بیٹھ گئی۔ "میرا نام کارمن ہے۔ میں ایک دفتر میں ملازم ہوں اور شام کو یونیورسٹی میں ریسرچ کرتی ہوں۔ کیمسٹری میرا مضمون ہے۔ میں وائی ڈبلیو سی اے کی سوشل سیکریٹری بھی ہوں اب تم اپنے متعلق بتاؤ"

میں نے بتایا۔

"اب سو جاؤ" مجھے اونگھتے دیکھ کر اس نے کہا۔ پھر اس نے دو زانو جھک کر دعا مانگی اور فرش پر لیٹ کر سو گئی۔ صبح کو عمارت جاگی۔ لڑکیاں سروں پر تولیے لپیٹے اور ہاؤس کوٹ پہنے غسل خانوں سے نکل رہی تھیں۔ برآمدے میں سے گرم قہوے کی خوشبو آ رہی تھی۔ دو تین لڑکیاں برآمدے میں ٹہل ٹہل کر دانتوں پر برش کر رہی تھیں۔

"چلو تمہیں غسل خانہ دکھا دوں۔" کارمن نے مجھ سے کہا اور ہال سے گزر کر ایک گلیارے میں لے گئی۔ جس کے سرے پر ایک ٹوٹی پھوٹی کوٹھری تھی جس میں صرف ایک نل لگا تھا اور دیوار پر ایک کھونٹی گڑی تھی۔ اس کا فرش اکھڑا ہوا تھا اور دیواروں پر سیلن تھی۔ روشن دان کے ادھر سے کسی لڑکی کے گانے کی آواز آ رہی تھی اس غسل خانے کے اندر کھڑے ہو کر میں نے سوچا۔ کیسی عجیب بات ہے..... صدیوں سے یہ غسل خانہ اس ملک میں۔ اس شہر میں، اس عمارت میں اپنی جگہ پر موجود ہے اور میرے وجود سے بالکل بے خبر..... اور آج میں اس میں موجود ہوں..... کیسا بیوقوفی کا خیال تھا۔

جب میں نہا کر باہر نکلی تو نیم تاریک ہال میں ایک چھوٹی سی میز پر میرے لیے ناشتہ چنا جا چکا تھا۔ کئی لڑکیاں جمع ہو گئی تھیں۔ کارمن نے ان سب سے میرا تعارف کرایا۔ بہت جلد ہم سب پرانے دوستوں کی طرح قہقہے لگا رہے تھے..... "اب میں ذرا اپنے جاننے والوں کو فون کر دوں۔" چائے ختم کرنے کے بعد میں نے کہا۔

کارمن شرارت سے مسکرائی "ہاں اب تم اپنے بڑے بڑے مشہور اور اہم دوستوں کو فون کر دو اور ان کے ہاں چلی جاؤ۔ ہماری پروا کون کرتا ہے..... کیوں روز؟..... ہم اس کی پروا کرتے ہیں؟"

"بالکل نہیں۔" کورس ہوا۔

لڑکیاں میز پر سے اٹھیں "ہم لوگ اپنے اپنے کام پر جا رہے ہیں، شام کو تم سے ملاقات ہو گی۔"

میکیلنا نے کہا۔

"شام کو.....؟" ایملیا نے کہا "شام کو یہ کسی کنٹری کلب میں بیٹھی ہو گی۔"

کارمن کے دفتر جانے کے بعد میں نے برآمدے میں جا کر فون کرنے شروع کیے۔

فوج کے میڈیکل چیف میجر جنرل کیو گلاس جو جنگ کے زمانے میں میرے ماموں کے رفیق کار رہ چکے تھے۔ مسز فلونیا کوٹیلو..... ایک کروڑ پتی کاروباری کی بیوی جو یہاں مشہور سماجی لیڈر تھیں اور جن سے میں کسی بین الاقوامی کانفرنس میں ملی تھی۔

انتا سویلرا..... اس ملک کا صف اول نقاد اور جرنلسٹ جو ایک دفعہ کراچی آیا تھا..... "ہلو..... ہلو..... ارے تم کب آ گئیں۔ ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی؟ کہاں ٹھہری ہو..... ؟ وہاں..... ؟ گاڈ گاڈ..... وہ کوئی ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ ہم فوراً تمہیں لینے آ رہے ہیں۔" ان سب نے باری باری مجھ سے یہی الفاظ دہرائے۔ سب سے آخر میں میں نے ڈون گارسیا ڈیل پریڈوس کو فون کیا۔ یہ مغربی یورپ کے ایک ملک میں اپنے دیس کے سفیر رہ چکے تھے اور وہیں ان سے اور ان کی بیوی سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ ان کی سیکریٹری نے بتایا کہ وہ لوگ آج کل پہاڑ پر گئے ہوئے ہیں۔ اس نے میری کال ان کے پہاڑی محل میں منتقل کر دی۔

تھوڑی دیر بعد مسز کوٹیلو اپنی مرسیڈیز میں مجھے لینے آ گئیں۔ کارمن کے کمرے میں آ کر انہوں نے چاروں طرف دیکھا اور میرا سوٹ کیس اٹھا لیا۔ مجھے دھکا سا لگا۔ میں ان لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میں کارمن، ایملیا، ماریا، روز اور گلوریا کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔

"سامان ابھی رہنے دیجیے۔ شام کو دیکھا جائے گا۔" میں نے ذرا جھینپ کر مسز کوٹیلو سے کہا۔

"مگر تم کو اس نامعقول جگہ پر بے حد تکلیف ہو گی۔" وہ بڑی دیر تلی رہیں۔ رات کو جب میں واپس آئی تو کارمن اور ایملیا پھاٹک کی کھڑکی میں کھڑی میرا انتظار کر رہی تھیں "آج ہم نے تمہارے کمرے کا انتظام کر دیا ہے" کارمن نے کہا۔ میں خوش ہوئی کہ اب اسے فرش پر نہ سونا پڑے گا۔

ہال کی دوسری طرف ایک اور سیلے ہوئے کمرے میں دو پلنگ بچھے تھے۔ ایک پر میرے لیے بستر لگا تھا دوسرے پر مسز سوریل بیٹھی سگریٹ پی رہی تھیں۔ وہ اڑتیس یا انتالیس سال کی رہی ہوں گی۔ ان کی آنکھوں میں عجیب طرح کی اداسی تھی۔ یہ لاطینی نسل کی کس شاخ سے ان کا تعلق تھا ان کی شکل سے معلوم نہ ہو سکتا تھا۔ پلنگ پر نیم دراز ہو کر انہوں نے فوراً اپنی زندگی کی کہانی شروع کر دی "میں گام سے آئی ہوں۔" انہوں نے کہا "گام کہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"بحرالکاہل میں ایک جزیرہ ہے۔ اس پر امریکن حکومت ہے۔ وہ اتنا چھوٹا جزیرہ ہے کہ دنیا کے نقشے پر اس کے نام کے نیچے صرف ایک نقطہ لگا ہوا

ہے۔ میں امریکن شہری ہوں۔" انہوں نے فخر سے اضافہ کیا...... گام...... میں نے دل میں دہرایا۔ کمال ہے دنیا میں کتنی جگہیں ہیں اور ان میں بالکل ہمارے جیسے لوگ بستے ہیں۔

"میری ایک لڑکی ایک وائلن بجانے والے کے ساتھ بھاگ آئی ہے میں اسے پکڑنے آئی ہوں۔ وہ صرف سترہ سال کی ہے مگر حد سے زیادہ خودسر...... یہ آج کل کی لڑکیاں......" پھر وہ دفعتاً اٹھ کر بیٹھ گئیں...... "مجھے کینسر ہو گیا تھا۔"

"اوہ......" میرے منہ سے نکلا۔

"مجھے سینے کا کینسر ہو گیا تھا۔" انہوں نے بڑے علم سے کہا "ورنہ تین سال قبل...... میں بھی...... میں بھی اور سب کی طرح حاملہ تھی۔"

ان کی آواز میں بے پایاں کرب تھا...... "دیکھو......" انہوں نے اپنے نائٹ گون کا کالر سامنے سے ہٹا دیا...... میں نے لرز کر آنکھیں بند کر لیں۔ ایک عورت سے اس کے جسم کی خوبصورتی ہمیشہ کے لیے چھن جائے کتنی قہرناک بات تھی۔

تھوڑی دیر بعد مسز سوریل سگریٹ بجھا کر سو گئیں۔ کھڑکی کی سلاخوں میں سے چاند اندر جھانک رہا تھا۔ نزدیک کے کمرے سے گلوریلجا کے گانے کی آواز آنی بند ہو گئی۔ دفعتاً میرا دل چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔

اگلا ہفتہ فیشن ایبل رسالوں کی زبان میں "سوشل اور تہذیبی معروفیات کی آماجگاہ کی طرح "آرٹ اور کلچر" کے معاملات میں گزرا۔ ادلن مسز کوسٹیلو اور ان کے احباب کے حسین پرفضا مکانوں میں شامیں شہر کی جگمگاتی تفریح گاہوں میں بسر ہوئیں۔ ہر طرح کے لوگ...... انجینئر...... جرنلسٹ...... مصنف...... سیاسی لیڈر۔ مسز کوسٹیلو کے گھر آتے اور ان سے بحث و مباحثے رہتے اور میں انگریزی محاورے کے الفاظ میں اپنے آپ کو کیا بے حد "انجوائے" کر رہی تھی۔ میں رات کو وائی ڈبلیو واپس آتی اور ہال کی چھوٹی میز کے اردگرد بیٹھ کر پانچوں لڑکیاں بڑے اشتیاق سے مجھ سے دن بھر کے واقعات سنتیں۔ "کمال ہے......!" روزا کہتی...... "ہم اسی شہر کے رہنے والے ہیں مگر ہمیں معلوم نہیں کہ ایسی الف لیلوی فضائیں بھی ہیں۔"

"یہ بے حد امیر لوگ جو ہوتے ہیں نا۔ یہ اتنے روپے کا کیا کرتے ہیں؟" ایمیلیا پوچھتی۔

ایمیلیا ایک سکول میں پڑھاتی تھی۔ روزا ایک دفتر میں اسٹینوگرافر تھی۔ گلوریلجا اور بربارا ایک میوزک کالج میں پیانو اور وائلن کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ سب متوسط اور نچلے طبقے کی لڑکیاں تھیں۔

اتوار کی صبح کارمن ماس میں جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ کوئی چیز نکالنے کے لئے میں نے الماری کھولی تو اس کے جھٹکے سے اوپر سے ایک روئی کا خرگوش نیچے گر پڑا۔ میں اسے واپس رکھنے کے لئے اوپر اچکی تو الماری کی چھت پر بہت سارے کھلونے رکھے نظر آئے۔

"یہ میرے بچے کے کھلونے ہیں" کارمن نے سنگھار میز کے سامنے بال بناتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔

"تمہارے بچے کے......" میں ہکا بکا رہ گئی اور میں نے بڑے دکھ سے اسے دیکھا۔ کارمن بن بیاہی ماں تھی۔

آئینے میں میرا ردعمل دیکھ کر وہ میری طرف پلٹی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے کہا...... "تم غلط سمجھیں۔" پھر وہ کھلکھلا کر ہنسی اور الماری کی نچلی دراز میں سے ایک ہلکے نیلے رنگ کی چمکیلی "بے بی بک" نکالی "دیکھو یہ میرے بچے کی سالگرہ کی کتاب ہے جب وہ ایک سال کا ہو گا تو یہ کرے گا۔ جب دو سال کا ہو جائے گا تو یہ کہے گا۔ یہاں اس کی تصویر چپکاؤں گی......"

وہ اطمینان سے آلتی پالتی مار کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور اس کتاب میں سے خوبصورت امریکن بچوں کی رنگین تصویروں کے تراشے نکال کر بستر پر پھیلا دیئے۔

"دیکھو میری ناک کتنی چپٹی ہے اور نک تو مجھ سے گیا گزرا ہے تو ہم دونوں کے بچوں کی ناک کا سوچو کیا حشر ہو گا؟ میں اس کی پیدائش سے مہینوں پہلے یہ تصویریں دیکھا کروں گی تاکہ اس بے چاری کی ناک پر کچھ اثر نہ پڑے۔"

"تم دیوانی ہو اچھی خاصی اور یہ نک کون بزرگ ہیں؟"

اس کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا...... "ابھی اس کا ذکر نہ کرو۔ اس کے نام پر مجھے لگتا ہے میرا دل کٹ کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔"

مگر اس کے بعد وہ ہر بار نک کا ذکر کرتی رہی "میں اتنی بدصورت ہوں مگر نک کہتا ہے کارمن...... کارمن مجھے تمہارے دل سے، تمہارے دماغ سے، تمہاری روح سے عشق ہے۔ نک نے اتنی دنیا دیکھی ہے اتنی حسین لڑکیوں سے اس کی دوستی رہی ہے مگر اسے میری بدصورتی کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔"

گرجا سے واپسی پر ٹیمز کے کنارے سڑک پر چلتے ہوئے وائی ڈبلیو کے کامن ہال میں کپڑوں پر استری کرتے ہوئے کارمن نے مجھے اپنی اور نک کی داستان سنائی۔ نک ڈاکٹر تھا اور ہارٹ سرجری کی اعلیٰ ٹریننگ کے لیے باہر گیا ہوا تھا اور اسے دیوانہ وار چاہتا تھا۔

رات کو میں مسز سوریل کے کمرے سے کارمن کے کمرے میں واپس آ چکی تھی۔ کیوں کہ مسز سوریل اپنی لڑکی کو پکڑ لانے میں کامیاب ہو گئی تھیں اور لڑکی اب ان کے ساتھ مقیم تھی۔ سونے سے پہلے میں مچھردانی ٹھیک کر رہی تھی اور کارمن فرش پر آسن جمائے بیٹھی تھی۔

"نک......" اس نے کہنا شروع کیا۔

"آج کل کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔"

"تم اسے خط کیوں نہیں لکھتیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"تم خدا پر یقین رکھتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"یہ تو بہت لمبا چوڑا مسئلہ ہے" میں نے جماہی لے کر جواب دیا۔ "مگر یہ بتاؤ کہ تم اسے خط کیوں نہیں لکھتیں؟"

"پہلے میرے سوال کا جواب دو۔ تم خدا پر یقین رکھتی ہو؟"

"ہاں" میں نے بحث کو مختصر کرنے کے لئے کہا۔

"اچھا تو تم خدا کو خط لکھتی ہو؟"

عمارت کی روشنیاں بجھ گئیں۔ رات کی ہوا میں آنگن کے درخت سرسرا رہے تھے۔ کمرے کے دروازے پر پڑا ہوا سرخ پھولوں والا پردہ ہوا کے جھونکوں سے پھڑپھڑائے جا رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر اسے ایک طرف سرکا دیا۔

"بہت خوب صورت پردہ ہے" میں نے پلنگ کی طرف لوٹتے ہوئے اظہار خیال کیا۔ کارمن فرش پر کروٹ بدل کر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ میری بات پر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "میں اور نک پہاڑی علاقہ میں کسی ہوٹل کی ڈرائیو کے لیے گئے تھے...... سن رہی ہو؟"

"ہاں......ہاں......بتاؤ......"

"راستے میں نک نے کہا کہ چلو ڈون ریمس سے ملتے چلیں۔ ڈون ریمس نک کے والد کے دوست اور کابینہ کے وزیر تھے اور انہوں نے حال ہی میں اپنے ضلع کے پہاڑی مقام پر نئی کوٹھی بنوائی تھی۔ جب ہم لوگ ان کی کوٹھی کے نزدیک پہنچے تو سامنے سے سفید فراک پہنے بہت سی چھوٹی چھوٹی بچیاں ایک سکول سے نکل کر آتی دکھائی دیں۔ مجھے وہ منظر ایک خواب کی طرح یاد ہے۔

پھر ہم اندر آگئے اور مسز ریمس کے انتظار میں ان کے شاندار ڈرائنگ روم میں بیٹھے۔ کیبنٹ منسٹر گھر پر موجود نہیں تھے۔ ڈرائنگ روم اور اسٹڈی روم کے نزدیک جو دیوار تھی اس میں شیشے کی ایک چوکور ڈبے جیسی کھڑکی میں پلاسٹک کی ایک بہت بڑی گڑیا بچی تھی جو کمرے کی نفیس آرائش کے مقابلے میں بہت بھدی معلوم ہو رہی تھی۔ ہم دونوں اس بدمذاقی پر چپکے سے مسکرائے۔ پھر مسز ریمس برآمد ہوئیں۔ انہوں نے ہمیں ٹھنڈی چائے پلائی اور سارا گھر دکھلایا۔ ان کے غسل خانے سیاہ ٹائل کے تھے اور مہمان کمرے کے نفیس دیوان بیڈ۔ سرخ پھول دار ٹیپسٹری (Tapestary) کے جھالروں والے غلاف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ان پلنگوں کو دیکھ کر نک نے چپکے سے مجھ سے کہا تھا "بدمذاقی کی انتہا" اور میں نے اپنے دل میں کہا تھا کوئی بدمذاقی نہیں۔ میں تو اپنے گھر کے لیے ایسے ہی پلنگ خریدوں گی اور اسی رنگ کے غلاف بنواؤں گی۔ اس کے بعد...... میں جب بھی گھریلو سازوسامان کی دکان سے گزرتی تو اس کپڑے کو دیکھ کر میرے قدم ٹھٹھک جاتے...... پھر میں نے تنخواہ بچا بچا کر اسی قیمتی کپڑے کا پردہ خرید لیا۔

"جب میں ایک مخصوص چینی ریستوران کے آگے سے گزرتی ہوں......" وہ اسی آواز میں کہتی رہی "اور شیشے کے دریچے کے قریب رکھی ہوئی میز اور اس پر جلتا ہوا سبز لیمپ نظر آتا ہے تو میرا دل ڈوب سا جاتا ہے۔ وہاں میں نے ایک شام نک کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔"

مجھے نیند آ رہی تھی اور میں نک کے اس وظیفے سے اکتا چکی تھی۔

میں نے مچھر دانی کے پردے گراتے ہوئے کہا...... "ایک بات بتاؤ...... تم کو اس قدر شدید عشق ہے اپنے نک سے تو تم نے اس سے شادی کیوں نہ کرلی۔ اب تک کیوں جھک مارتی رہیں......"

"مجھے دس سال تک ایک دور افتادہ جزیرے میں اپنے بابا کے ساتھ رہنا پڑا" اس نے اداسی سے جواب دیا۔ "پہلے ہم لوگ اسی شہر میں رہتے تھے۔ جنگ کے زمانے میں بمباری سے ہمارا چھوٹا سا مکان جل کر راکھ ہو گیا اور میری ماں اور دونوں بھائی مارے گئے۔ صرف میں اور میرے بابا زندہ بچے۔ بابا ایک سکول میں سائنس ٹیچر تھے ان کو ٹی۔ بی ہو گئی اور میں نے انہیں سینی ٹوریم میں داخل کر دیا جو بہت دور کے جزیرے میں تھا...... سینی ٹوریم بہت مہنگا تھا۔ اس لیے کالج چھوڑتے ہی میں نے اس محکمہ کے دفتر میں نوکری کر لی اور آس پاس کے دولت مند زمین داروں کے گھروں میں ٹیوشن بھی کرتی رہی مگر بابا کا علاج اور زیادہ مہنگا ہوتا گیا۔ تب میں نے اپنے گاؤں جا کر اپنا آبائی باغیچہ رہن رکھ دیا۔ تب بھی بابا اچھے نہ ہوئے...... میں ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے میں کشتی میں بیٹھ کر جاتی اور زمین داروں کے محلوں میں ان کے کند ذہن بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے تھک کر چور ہو جاتی تب بھی بابا اچھے نہ ہوئے۔ نک سے میری ملاقات آج سے دس سال قبل ایک فیسٹا (Fiesta) میں ہوئی تھی۔ اس دوران میں جب بھی دارالسلطنت آتی وہ مجھ سے ملتا رہتا۔ تین سال ہوئے اس نے شادی پر اصرار کیا لیکن بابا کی حالت اتنی خراب تھی کہ میں ان کو مرتا چھوڑ کر یہاں نہ آ سکتی تھی۔ اسی زمانے میں نک کو باہر جانا پڑ گیا۔ جب بابا مر گئے تو میں یہاں آ گئی۔ اب میں یہاں ملازمت کر رہی ہوں اور اگلے سال یونیورسٹی میں اپنا مقالہ بھی داخل کر دوں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ بابا کے کھیت بھی رہن سے چھوٹ جائیں۔ نک میری مدد کرنا چاہتا تھا مگر میں شادی سے پہلے ایک

بیٹھ کیں لوں گی۔ اس کے خاندان والے بڑے بد دماغ اور اکڑ فوں والے لوگ ہیں اور ایک لڑکی کے لئے اس کی عزت نفس بہت بڑی چیز ہے۔ عزت نفس، خودداری اور خود اعتمادی۔ اگر مجھے کبھی یہ احساس ہو جائے کہ یہ مجھے حقیر سمجھتا ہے یا مجھے سوتیں...... اچھا...... گڈ نائٹ......"

دوسرے روز وہ صبح تیار ہو کر حسب معمول سب سے پہلے ناشتے کی میز پر انتظام کے لئے پہنچ چکی تھی۔ مسز سوریل کام والیں جا رہی تھیں اپنے ہونے والے داماد سے ان کی صلح ہو گئی تھی۔ وہ سویرے ہی سے آن پہنچا تھا۔ وہ ایک تیکھی سا نوجوان تھا اور برآمدے کے ایک کونے میں بنگلی پلیٹا بیٹھا تھا۔ فضا پر عجیب سی بشاشت طاری تھی۔ لڑکیاں بات بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔ میں بھی بہت مسرور تھی اور خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ یہ ہلکے پھلکے اور مکمل پن کا احساس زندگی میں بہت کم آتا ہے اور صرف چند لمحے رہتا ہے مگر وہ لمحے بہت غنیمت ہیں۔

کارمن جلدی جلدی ناشتہ ختم کر کے دفتر چلی گئی۔ "آج بھی تم اپنے شاندار دوستوں سے ملنے نہ جا رہی ہو گی تو تم کو جیپنی (Jeepney) میں بٹھا کر شہر کے گلی کوچوں کی سیر کرا دے...... " گمیلیا نے مجھ سے کہا۔

"تمہارے لیے ایک کیڈی لک آئی ہے بجی۔" روزا نے اندر آ کر اطلاع دی۔

"کیڈی لک...... اوہ......!!" کورس ہوا۔

تمہارے لیے لمبی چوڑی موٹریں آتی ہیں کہ ہم لوگوں کی رعب کے مارے گھگھی بندھ جاتی ہے" ٹیرا نڈا نے خوش دلی سے اضافہ کیا۔ میں نے لڑکیوں کو خدا حافظ کہا اور اپنا سفری بیگ کندھے سے لٹکا کر باہر آ گئی۔ میں سابق سفیر ڈون گارسیا ڈیل پریڈوس کے وہاں دو دن کے لیے ان کے مل ٹیشن جا رہی ہوں۔ ان کے وردی پوش شوفر نے سیاہ کیڈی کا دروازہ مؤدبانہ بند کیا اور کار شہر سے نکل کر سرسبز پہاڑیوں کی سمت روانہ ہو گئی۔

پہاڑ کی چوٹی پر ڈون گارسیا کا ہسپانوی وضع کا شاندار گھر درختوں میں چھپا ہوا سے نظر آ رہا تھا۔ وادیوں میں کیمر منڈلا رہا تھا اور سفید اور کاسنی اور سرخ اور زرد رنگ کے پہاڑی پھول سارے میں کھلے ہوئے تھے۔ کار پھاٹک سے ہو کر پورچ میں رک گئی۔ تاگالی نسلوں والی شائستہ نوکرانیاں باہر نکلیں۔ بٹلر نے نیچے آ کر کار کا دروازہ کھولا۔ ہال کے دروازے میں ڈون گارسیا اور ان کی بیوی ڈونا ملیا میرے منتظر تھے۔ ان کا گھر سفید قالینوں اور شیشم کے فرنیچر اور انتہائی قیمتی سامان آرائش سے سجا ہوا تھا اور اس طرح کے کمرے تھے جن کی تصویریں ووگ میگزین کے رنگین صفحات پر پریڈ فرنیچری انٹیریئر ڈیکوریشن کے سلسلے میں اکثر شائع کی جاتی ہیں۔

کچھ دیر بعد میں ڈونا ملیا کے ساتھ اوپر کی منزل پر گئی۔ وہاں شیشے والے برآمدے کے ایک کونے میں ایک نازک سی بیڈ کی نوکری میں ایک چھ مہینے کی بے حد گلابی بچی پڑی غاؤں غاؤں کر رہی تھی۔ وہ بچی اس قدر پیاری تھی کہ میں ڈونا ملیا کی بات ادھوری چھوڑ کر سیدھی نوکری کے پاس چلی گئی۔ ایک بے حد حسین صحت مند ترو تازہ اور کمسن امریکن نزدیک کے صوفے سے اٹھ کر میری جانب آئی اور مسکرا کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"یہ میری بہو ہے" ڈونا ملیا نے کہا۔

ہم تینوں نوکری کے گرد کھڑے ہو کر بچی سے لاڈ و پیار میں مصروف ہو گئے۔ دوپہر کو لنچ کی میز پر امریکن لڑکی کا شوہر بھی آ گیا۔

"یہ ہمارا بیٹا جوزے ہے" ڈون گارسیا نے کہا۔

جوزے کی عمر تقریباً پینتیس سال ہو گی۔ اپنی قوی کڑ حت کی بجے آبی رنگ کی قمیص اور سفید پتلون میں وہ خاصا وجیہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اپنی نوعمر بیوی کو بے حد چاہتا تھا اور بچی پر عاشق تھا۔ زیادہ تر اسی کی باتیں کرتا رہا۔

رات کو میں اپنی بے حد پر تکلف اور بڑھیا خواب گاہ میں گئی جس کے ساز و سامان کو ہاتھ لگاتے فکر ہوتی تھی کہ کہیں میلا نہ ہو جائے۔ اس وقت مجھے ونی گابلیو کے سلے ہوئے کمرے اور تنگ ڈریسنگ ٹیبل اور مسز سوریل اور ہال کی جرنگ کرسیاں شدت سے یاد آئیں۔

دو دن بعد پریڈوس خاندان میرے ہی ساتھ دارالسلطنت واپس لوٹا۔

اپنے ماں اور باپ کو ان کے کنٹری ہاؤس میں اتارنے کے بعد جوزے نے مجھے میری جائے قیام پر پہنچانے کے لیے کیڈی لک دوبارہ اسٹارٹ کی۔ جوزے اور اس کی بیوی ڈورتھی صرف دو ہفتوں قبل امریکہ سے لوٹے تھے۔ ان کا بہت سا سامان کسٹم ہاؤس میں پڑا تھا جسے چھڑانے کے لیے آفس جانا تھا۔ شہر کے سب سے اعلیٰ ہوٹل کے سامنے جوزے نے کار روک لی۔

"یہاں کیا کام ہے" میں نے اس سے پوچھا۔

"تم یہیں ٹھہری ہو نا؟"

"نہیں ڈیئر جوزے میں ونی گابلیو کی اے میں ٹھہری ہوں۔"

"ونی گابلیو......؟ گڈ گاڈ! کمال ہے اچھا تم یہیں چلتے ہیں۔ مگر کیا تم کو یہاں جگہ نہ مل سکی۔ تمہیں چاہیے تھا کہ آتے ہی ڈیڈی کو اطلاع دیتیں۔"

اس وقت مجھے دفعتاً خیال آیا کہ میں ہر طبقے اور ہر قسم کے لوگوں کو اپنی اتنا دلچسپی کے ذریعے کم از کم اپنی حد تک ذہنی طور پر ہموار کرتی چلی جاتی ہوں۔ مگر جوزے اور اس کے والدین ملک کے دس دولت مند ترین خاندانوں میں شامل تھے اور یہاں کے فکر میں طبقے کے اہم ستون تھے اور ان کو یہ سمجھانا بالکل

بیکار تھا کہ مجھے ہوائی ڈاٹیو کیوں اتنا اچھا لگتا ہے اور میں وہاں ٹھہرنے پر کیوں
اس قدر مصر ہوں۔

موزے نے گلی کے نکڑ پر کار روک لی کیوں کہ چینیوں کی ایک قطار
نے سارا راستہ گھیر رکھا تھا۔ میں جب ہوائی ڈاٹیو کے اندر پہنچی تو سب لوگ سو چکے
تھے۔ میں چپکے سے جا کر اپنی مچھر دانی میں گھس گئی۔ کارمن حسب معمول فرش پر
سکون کے ساتھ سو رہی تھی۔ اس کے سرہانے سانتو طوماس (سینٹ طامس) کی
تصویر پر گلی کے لیمپ کا مدھم عکس جھلملا رہا تھا۔

صبح چار بجے اٹھ کر میں دبے پاؤں چلتی شکستہ غسل خانے میں گئی
اور آہستہ سے پانی کا نل کھولا مگر پانی کی دھار اس زور سے نکلی کہ میں چونک اٹھی۔
اسی طرح چپکے سے کمرے میں آ کر میں نے اسباب باندھا تا کہ آہٹ سے
کارمن کی آنکھ نہ کھل جائے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ فرش سے غائب ہے
اور کچھ دیر بعد اس نے آ کر کہا "ناشتہ تیار ہے۔" وہ ٹیکسی کے لیے فون بھی کر چکی
تھی۔

"کیسا سفر رہا؟" اس نے چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔

"بہت دلچسپ۔"

"یہ تمہارے دوست لوگ کون تھے جہاں تم گئی تھیں؟ تم نے بتایا
ہی نہیں۔"

میں بات شروع کرنے والی ہی تھی کہ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔
میں نے جلدی سے کمرے میں جا کر سوٹ کیس کھولا۔ ایک نئی ساری نکال
کر ایک پرچے پر لکھا "تمہاری شادی کے لئے میرا پیشگی تحفہ......" اور
ساری اور پرچہ کارمن کے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

"ٹیکسی آ گئی" کارمن نے برآمدے میں سے آواز دی۔

ہم دونوں سامان اٹھا کر باہر آ گئے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ اتنے میں
کارمن اچانک کھڑکی میں سے سر نکال کر چلائی...... "ارے تم نے اپنا پتہ تو
دیا ہی نہیں۔" میں نے کاغذ کے ٹکڑے پر اپنا پتہ گھسیٹ کر اسے تھما دیا۔ پھر مجھے
ایک بے حد ضروری بات یاد آئی۔ "حد ہو گئی کارمن۔ تمہاری ہوائی ڈاٹیو نے مجھے
اپنا بل بھی نہیں دیا۔"

"بکواس۔"

"ارے یہ تمہارا نجی گھر تو نہیں تھا۔"

"تم میری مہمان تھیں۔"

"بکواس۔"

"تم خود مت بکو۔ اب بھاگو ورنہ ہوائی جہاز چھوٹ جائے گا اور
دیکھو جب میں شادی کا کارڈ بھیجوں تو تم کو آنا پڑے گا۔ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں
گی۔ ذرا سوچو ٹنک تم سے مل کر کتنا خوش ہوگا۔"

مگر ہم دونوں کو معلوم تھا کہ میرا دوبارہ اتنی دور آنا بہت مشکل
ہے۔

"خدا حافظ کارمن" میں نے کہا۔

"خدا حافظ......" وہ کھڑکی میں سر نکال کر بہت دیر تک ہاتھ
ہلاتی رہی۔ ٹیکسی صبح کاذب کے دھندلکے میں ایرپورٹ روانہ ہو گئی۔ ہوائی جہاز
تیار کھڑا تھا۔ میں کسٹم کاؤنٹر پر سے لوٹی تو پیچھے سے ڈون گارسیا کی آواز آئی
"...... ٹنک...... میں ذرا سگار خرید لوں۔"

"بہت اچھا ڈیڈی......" یہ موزے کی آواز تھی۔

میں چونک کر پیچھے مڑی۔ موزے مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔

"دیکھا ہم لوگ کیسے ٹھیک وقت پر پہنچے۔"

"موزے......" میں نے ڈوبتے ہوئے دل سے پوچھا......

"تمہارا دوسرا نام کیا ہے؟"

"ٹنک...... ڈیڈی جب بہت لاڈ میں آتے ہیں تو مجھے ٹنک
پکارتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر میں موزے ہی کہلاتا ہوں...... کیوں......؟"

"کچھ نہیں......" میں اس کے ساتھ لاؤنج کی طرف چلنے لگی۔

"تم...... امریکہ کیا کرنے گئے تھے؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہارٹ سرجری میں اسپیشلائز کرنے...... میں نے تمہیں بتایا تو
تھا۔ کیوں......؟"

"تم...... کبھی تم نے...... تم نے"

"کیوں......؟ کیا ہوا......؟ کیا بات ہے......؟"

"کچھ نہیں" میری آواز ڈوب گئی۔ لاؤڈ اسپیکر نے دہرانا شروع
کیا۔ "پین امریکن کے مسافر...... پین امریکن کے مسافر......"

"ارے......! روانگی کا وقت اتنی جلدی آ گیا؟" ٹنک نے تعجب
سے گھڑی دیکھی۔ ڈون گارسیا سگار خرید کر شفقت سے مسکراتے ہوئے میری
طرف آئے۔ میں نے دونوں باپ بیٹوں کا شکریہ ادا کیا۔ انہیں خدا حافظ کہا اور
تیزی سے مسافروں کی قطار میں جا ملی۔

دوڑتے ہوئے طیارے کی کھڑکی میں سے میں نے دیکھا۔ ڈون
گارسیا اور ٹنک نیچے ریلنگ پر جھکے رومال ہلا رہے تھے۔ طیارے نے زمین سے
بلند ہونا شروع کر دیا۔

یہاں سے بہت دور خطرناک طوفانوں میں گھرے ہوئے پر بلا
سمندر میں بکھرے جزیروں کا ایک جھنڈ ہے جو فلپائن کہلاتا ہے۔ اس
کے جاگتے جگمگاتے دارالسلطنت منیلا کے ایک بے رنگ سے محلے کی ایک شکستہ

عمارت کے اندر ایک بے حد چپٹی ناک اور فرشتے کے سے معصوم دل والی لڑکی رہتی ہے جو اپنے بچے کے لیے کھلونے جمع کر رہی ہے اور اپنے خدا کی واپسی کی منتظر ہے جس کی ذات پر اسے کامل یقین ہے۔

☆

بہاروں کی نوید

تحسین عام و خاص

قاری شا

قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں جابجا مولسری کی کلیاں بکھری پڑی ہیں، وقت کے زخم بھرے ہیں، شبنم آلود سفید شگوفے ہیں، باغوں پر جھکی گھٹائیں ہیں، سناٹے ہیں (اور سناٹوں کی مختلف قسموں کا تو کوئی شمار ہی نہیں) گھلی جاڑے میں پوئنسٹیا کے جھنڈ اشوک کی قطاریں اور پھر ان کے لانبے لیٹے ہوئے سائے ہیں۔ بنفشے کے شگوفے اور زرد گلاب کی بیلیں ہیں، کوکتی ہے اور گہرا گہرا ہے اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ رنگ ہیں، خوشبوئیں ہیں، آوازیں ہیں اور یہ سب کچھ اتنی فن کاری سے ناول کے کینوس میں سمویا جاسکتا ہے کہ قرۃ العین حیدر افسانہ نگار اور ناول نویس کے علاوہ کامیاب مصور بھی ہے اور رقص و موسیقی کے بارے میں اس کی معلومات و تجربات کا کوئی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی

قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" ایک جدید تر ذہن کی نمائندگی کرتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے دور تک جو تبدیلی ہوئی ہے وہ اس سے زیادہ دور رس اور تیز تر ہیں۔

سوچنے اور سمجھنے کی بہت سی نئی راہیں اس دور تک آتے آتے پیدا ہو چکی تھیں وہ مسائل جو پہلے واضح اور متعین ہو چکے تھے اب پھر پیچیدہ، دھندلے اور غیر متعین سے ہونے لگے تھے ادب اپنے اظہار اور انداز نظر میں ایک بار پھر اسلوب کے مختلف سانچوں اور فکر کی نئی سمتوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آنے لگا تھا۔ الفاظ کو نئے آہنگ اور روابط کے ساتھ استعمال کرنا، ان کو مانوس فضاؤں سے نکال کر نامانوس، اجنبی اور پردیسی فضاؤں میں لے جانا، نئی علامتوں کی درآمد اور پرانی علامتوں کو نئے اور خیال انگیز طور پر پیش کرنا، اندازِ بیان کے مختلف تجربات سے ذہن میں تازہ جستجو کو ابھارنا اور نئی سماعتوں کو پیدا کرنا یہ اور ایسی بہت سی چیزیں ہیں قرۃ العین حیدر کے دور کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جس کی ایک اچھی ترجمان خود قرۃ العین حیدر ہیں۔"

مجتبیٰ حسین

گوتم گھر پہنچ گیا اور یہ داستان ختم ہو گئی۔ لیکن "آگ کا دریا" ہندوستان اور پاکستان کے تمام لوگوں کو للکار رہا ہے کہ قرن رم نیا سے گذر کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ رم نیا قرن سے چھوٹ کر مر جائے گی۔ اور سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اسلام کی چمپا باجی جو کٹ گھر کی ایک ویران حویلی کی چوکھٹ سے لگی ہماری طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہی ہیں ان سے کیا کہا جائے؟ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے ادیب اس معمہ کا صحیح حل کس کی جنگ میں رکھ کر بھول گئے ہیں۔

راہی معصوم رضا

مجھے "آگ کا دریا" سے "گردش رنگ چمن" تک قرۃ العین حیدر کے تناظر ..... Perspective میں ایک سی ہمہ گیری، وسعت اور تخلیقی خود نگاری کے نشانات ملتے ہیں اس لئے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کے یہاں سارا قصہ تبدیلی سے زیادہ ایک تسلسل کا ہے۔ یہ تسلسل قرۃ العین حیدر کی حسیت کے آزادانہ سفر ان کے دانشورانہ تخلیقی رویے کی غیر مشروطیت کا اشاریہ بھی ہے۔ آزادی اور غیر مشروطیت کے عناصر قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں ابتدا سے موجود تھے۔ چنانچہ بہ حیثیت ادیب ان کی شخصیت میں وقت کے ارتقا نے کسی ایسی جہت کا اضافہ نہیں کیا جو اس شخصیت کے ماضی میں اپنی بنیادیں نہ رکھتی ہو۔

شمیم حنفی

قرۃ العین حیدر کی افرادی تخلیقات کا جائزہ پیش کرنا یا ان کے ناولوں میں نمایاں تخلیقی میلانات کی نشاندہی کرنا خود اظہاریت کا ایک سلسلہ ہے ان کے ناولوں میں سوانحی مواد کا استعمال فکر کی عکاسی کے مسئلے سے ملا ہوا ہے۔ وقت کی طرح متنوع رویوں کا مسئلہ قرۃ العین کے ناول اور افسانہ میں ایک مرکزی، وسیع معنویت یا اس کے تصور کے سوال سے مربوط ہے۔ ان کی کہانیوں میں مخصوص تہذیبی پس منظر کی عکاسی اور معاشرتی حقیقت نگاری کا جائزہ لیا جائے تو ان کے صحیح میلانات کا اندازہ ہوتا ہے جو معنی خیز بھی ہے اور وسیع فلسفیانہ بصیرت سے مالا مال بھی۔

مقبول حسن خان

قرۃ العین حیدر کے ہاں تلاش ذات کے سفر کے موجودہ مرحلے کا خیال کرتا ہوں تو اقبال یاد آتے ہیں۔ اس تلازم خیال پر غور کرتا ہوں تو اقبال اور قرۃ العین کے کارناموں میں چند در چند مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ اقبال ہی کے مانند قرۃ العین بھی آتشِ رفتہ کے سراغ میں ہیں اور ان کی تمام سرگزشت بھی کھوئے ہوؤں کی جستجو سے عبارت ہے۔ اقبال نے ہماری شاعری کو فلسفیانہ رنگ و آہنگ بخشا تو قرۃ العین نے ہماری فکشن کو گہرے فلسفیانہ انداز میں سوچنا سکھایا۔ دونوں کی تخلیقی بے چینی کا سرچشمہ ایک ہے۔ دونوں کا سوز و ساز آرزومندی مسلمانوں کے اجتماعی مقدر پر غور و فکر سے پھوٹا ہے اور دونوں کے ہاں یہ موضوع بالآخر وقت اور تاریخ کی ماہیت و معنویت پر فکری و تہذیبی مراقبہ بن گیا ہے۔ پھر یہ دو مفکر و فنکار ہم نصیب بھی ہیں۔ اقبال عمر بھر جس فکری تنہائی اور

روحانی اضطراب سے دوچار ہے فکری اجنبیت اور روحانی جلاوطنی کا وہی احساس قرۃ العین کا مقدر ہے۔

پروفیسر فتح محمد ملک

قرۃ العین حیدر کا یہ مختصر ناول کئی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے جس نے اس چھوٹے کینوس پر زندگی کی بڑے ہی وسیع انداز سے عکاسی کی ہے صرف کرداروں کو دیکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے راحت کا شانی فرحت کا شانی منصور، شمشاد، قاسم، واجد، زرینہ، ادلان، منصور میاں یا دتی جن سے ہر کردار منفرد ہے اور بڑا گہرا اثر قاری کے ذہن پر چھوڑتا ہے اس کے علاوہ دوسرے کئی اور چھوٹے کردار ہیں جن کی اہمیت اور انفرادیت سے ناول کا تاثر اور گہرا ہوتا ہے ان بیسیوں کرداروں کے ساتھ بیسیوں مسائل ہیں جن کو اس فنکارانہ خوبی سے نمایاں کیا گیا ہے کہ ہر مسئلہ ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آتا ہے توارث کا مسئلہ، ماحول کا کردار اور شخصیت پر اثر، تقسیم ملک کے بعد کے مسائل، نئے دولت مند طبقے کا ابھرنا جن کی زندگی کا مقصد صرف دولت ہے اس کا اثر زندگی پر، اہم اقدار کا زوال، نفسیاتی الجھنیں، امیر اور غریب طبقے کی زندگی کا بعد، صنعتی اور شہری زندگی کے شاخسانے، سرحد کی تقسیم سے دلوں کی تقسیم کی ناکام کوشش، مغربی پاکستان والوں کی بنگال کے عوام سے بے تعلقی، ان سارے مسائل کا احاطہ جس فنکارانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ مصنفہ نے کیا ہے وہ اس ناول کو گراں قدر بناتا ہے۔

یوسف سرمست

قرۃ العین حیدر کے ناولوں اور افسانوں میں آزاد اور خود مختار کرداروں کی حیثیت سے اپنی شناخت کرانے والی خواتین دیپالی سرکار، نادرہ، نجم السحر، سیتا میر چندانی، جمیلی اور ثریا حسین جہاں اپنے قائم بالذات ہونے کے باعث مردوں کی مرکزیت کے خلاف ایک چیلنج بن کر ابھرتی ہیں وہیں ایسے کرداروں کی بھی کمی نہیں، جن کے وسیلے سے Feminism کی اس زیریں لہر کو محسوس کیا جا سکتا ہے جس کے احساس و ادراک کے بغیر جنسی بنیاد پر قائم معاشرتی عدم توازن کی آگہی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ کہیں "قلندر دیوان ہے" کی بھر وچا دستور کی آنکھیں، خون کشتہ آرزوؤں کی داستان سناتی ہیں۔ کہیں "کارمن" کی کارمن اپنے محبوب کو خدا سمجھنے پر مجبور ہے کہیں "ہاؤسنگ سوسائٹی" کی مشہور اقصاء اپنے گھر میں بے گھر نظر آتی ہے اور کہیں سلمیٰ مرزا کی معصومیت مجبوری اور مفلسی کے ہاتھوں نیلام ہونے کی سرحد تک آ پہنچی ہے عورت کے یہ مختلف روپ اس کے استحصال کی عبرت انگیز صورتحال، وقت اور زمانے کے سیاق و سباق میں عورت کی پامالی کی داستان اور مردوں کے بنائے ہوئے معاشرتی نظام میں عورت کی بے بسی دراصل تحریک نسواں کا وہ خام مواد ہے جس کو قرۃ العین حیدر اپنے فن کارانہ ضبط و اعتدال کے ساتھ نئے زاویۂ نظر کے ساتھ پیش کرتی رہی ہیں۔

ابوالکلام قاسمی

قرۃ العین حیدر نے جو سفر "ستاروں سے آگے" سے شروع کیا تھا وہ "روشنی کی رفتار" تک پہنچ کر فن کی اعلیٰ بلندیوں کو چھو لیتا ہے اگرچہ ان کا افسانوی سفر ابھی جاری ہے اب ان کی توجہ افسانے سے زیادہ ناول کی طرف ہے اور اس اثنا میں انہوں نے کئی بڑے اہم ناولوں سے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے افسانے کی طرف ان کی توجہ کم ہو گئی ہے لیکن جتنے افسانے انہوں نے گزشتہ دس پندرہ برسوں میں لکھے ہیں ان میں ان کے فن کی معراج دکھائی دیتی ہے ان سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ابھی کئی اہم افسانے کا اضافہ اردو ادب میں کر سکتی ہیں۔

سہیل بیابانی

"چاندنی بیگم" قرۃ العین حیدر کا اچھا ناول ہے مصنفہ نے ہندوستان کی عصری تاریخ کے مختلف مسئلے کو نہایت فنکاری اور خوبصورتی سے اس ناول کی بنیاد بنایا ہے جسکے ماضی قریب یعنی 1947ء سے لے کر اب تک کی معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے مثلاً متروکہ جائیدادوں کا مسئلہ، ہندوستانی مسلمانوں کے عزیزوں کا پاکستان جانا، یہاں رہ جانے والوں کی دشواریاں، خاتمہ زمینداری اس سے پیدا ہونے والی مشکلات جس کی وجہ سے بعض زمینداروں کا ذہنی توازن بگڑ جانا، لڑکیوں کے لئے اچھے لڑکے نہ ملنا، شرفا کے لڑکوں کا کمیونزم کی طرف جھکاؤ یعنی ترقی پسندی کا فیشن، مسلمان لڑکیوں کے زیادہ ماڈرن نہ ہونے کی وجہ سے پڑھے لکھے مسلمان لڑکوں کا اپنے ساتھ کی ہندو لڑکیوں یا اکثر خاندانوں کی تیز طرار لڑکیوں سے شادی، بمبئی کی کھولیوں اور فلمی دنیا میں Break حاصل کرنے والوں کا خاکہ، اشراف کا زوال، شرفا کی پست ہمتی، مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی، امریکہ میں ہندوستانی Godmen کی اصلیت اور ہندوستان میں vested interest کا مندر اور مسجد کے لئے زمین ہتھیانا وغیرہ وغیرہ کا ایک جہان معنی آباد ہے۔

نزہت سمیع الزماں

آخر شب کے ہمسفر میں تاریخی، معاشرتی، سیاسی، معاشی، نظریاتی و انقلابی اور رومانی و جاسوسی عناصر ہم آمیز ہو کر ایک ایسے قصے کی ترتیب کا سامان کرتے ہیں جو معلومات سے پُر، افکار سے مملو اور جذبات سے لبریز ہے اس میں قدرت کے حسن کے ساتھ ساتھ دل انسان کا حسن بھی ہے اور جمال کے پہلو بہ پہلو جلال کے نظارے بھی، کہیں لطافت کہیں ملاحت، ایک طرف نور و نغمہ ہے دوسری طرف جنگ و جدال۔ اسی لئے یہ ناول مختلف مزاج کے قارئین کو مختلف سطحوں پر متاثر کرتا ہے اس کا پایۂ فن یقیناً آگ کا دریا سے نیا ہو یا نہ ہو، البتہ یہ خود خاص فکر میں پہلا ناول کا مقام جو بھی ہو۔

عبدالمغنی

'آگ کا دریا' ہماری تہذیب کی دستاویز بھی ہے اور ہم عصر طرز فکر و
احساس کا آئینہ خانہ بھی۔ اگر اسے اردو کا سب سے بڑا ناول نہ مانا جائے تب بھی
یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ناول اردو کے دو تین بڑے ناولوں میں سے ہے۔ دوسرا
ناول یقیناً "اداس نسلیں" (عبداللہ حسین) ہے۔ ان دو ناولوں میں اردو ناول
بلوغت کو پہنچا ہے۔ اردو میں ان کے علاوہ بھی قابل ذکر ناول ہیں۔ لیکن ہم عصر
عہد کی آئینہ داری جس وسیع پیمانے پر ان ناولوں میں ہوتی ہے اس کی مثال اور
ناولوں میں نہیں ملتی۔

وحید اختر

قرۃ العین حیدر اردو کی واحد ناول نگار ہیں جن کے فکر و فن کے
مختلف پہلوؤں پر بیک وقت مختلف اور متضاد خیالات کا اظہار کیا جاتا رہا ہے
مخالفت اور موافقت کے شدید ردعمل سامنے آئے ہیں۔ ردعمل کی یہ شدت
بجائے خود ان ناولوں کی اہمیت کا ثبوت ہے۔ مزید یہ کہ عصر حاضر کے ناول
نگاروں کی بڑی تعداد قرۃ العین حیدر کے فکر و فن سے متاثر نظر آتی ہے۔ جس کا
اظہار "آگ کا دریا" کی اشاعت کے بعد منظر عام پر آنے والے ان ناولوں کی
ایک طویل فہرست سے ہوتا ہے جن پر قرۃ العین حیدر کے انداز فکر اور مخصوص
اسلوب کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں اس ضمن میں "اداس نسلیں" (عبداللہ حسین)
"تلاش بہاراں" "چہرہ بہ چہرہ روبرو" (جمیلہ ہاشمی) "نے چراغے نے گلے"
(نثار عزیز بٹ) "اس خیمے کے آخری پروانے" "گھر میرا راستے گم کے" (رشیدہ
رضویہ) وغیرہ کے نام خاص طور سے سامنے آتے ہیں۔

نیلم فرزانہ

قرۃ العین حیدر کا ذخیرۂ علم، تجربہ، فکر اور مشاہدہ اتنا تیز ہے کہ ان کو
معمولی سے معمولی جذبات کے ذریعہ خیال کی ترسیل کا ایسا ملکہ حاصل ہے کہ اردو
میں کم کم لوگ اس روش خاص میں ان کے ہمسر ٹھہرتے ہیں۔ وہ یو۔ پی کے
قصبات کی تمدنی، تہذیبی زندگی سے گہری واقفیت رکھتی ہیں۔ مغربی اسلوب میں
وہ مشرقی مزاج اور فطرت کی نازک خصوصیات کامیابی سے سمو سکتی ہیں۔ تاریخی حوالوں
کے نازک سے نازک فرق کو وہ اشاروں میں قاری کے ذہن پر بے نقاب کر سکتی
ہیں۔ وہ سرگذشت عہد گل نہیں سناتی ہیں بلکہ ایسا آئینہ خانہ سجا دیتی ہیں جس
میں ماضی، حال، مستقبل سب کے نقوش اُجاگر ہو جاتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی
کے بعد مجھے ایسا کوئی دوسرا ادیب نظر نہیں آتا جس کو اپنے اسلوب پر ایسی گرفت
اور فن پر ایسی دسترس حاصل ہو جیسی قرۃ العین حیدر کو حاصل ہے۔

ہادی انصاری

قرۃ العین حیدر معلم اخلاق نہیں ہیں۔ اور نہ انھوں نے اپنے کسی
افسانے میں گزشتہ خاتون افسانہ نگاروں کی طرح اخلاق ثقافت کی آئینہ داری کی
ہے۔ اس معاملے میں وہ عصمت چغتائی سے بھی کئی قدم آگے ہیں۔ عصمت کا
معاشی انداز بیاں کہیں کہیں ایک مخصوص اخلاق کی تربیت کرتا ہے۔ صالحہ عابد
حسین کے افسانوں میں اس کا سب سے زیادہ اثر ہے انھوں نے براہ راست
نذیر احمد اسکول اور صغریٰ ہمایوں حتیٰ کہ سجاد حیدر کی روایت کو اپنایا اور اپنے مطابق نیکی
اور بدی سے اخلاقی اصولوں کی طرف اپنے افسانوں کا رخ موڑا۔ اس سے ان
کے فن کو نقصان ضرور پہنچا لیکن ان کی عظمت اس امر میں ہے کہ انھوں نے ادب
کے ذریعے سماجی زندگی میں ایک تبدیلی لانے کی ضرورت محسوس کی۔

ش اختر

قرۃ العین حیدر ہمارے اُن چند لکھنے والوں میں شمار ہوتی ہیں
جنھوں نے جدید مغربی ادب کی صحت مند اور توانا روایات سے بھرپور فیض
حاصل کیا ہے۔ "آگ کا دریا" اپنے وسیع کینوس، نفسیاتی دروں بینی، جدید تکنیک
اور مخصوص ہندوستانی روح کی وجہ سے نہ صرف قرۃ العین بلکہ پورے اردو ناول
سرمایے میں گراں قدر اضافہ ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ہاں آزاد تلازمۂ خیال
Stream of conciousness کو شعوری طور پر اپنانے کے
رجحان کے علاوہ جدید انسان کا کرب جس شدت سے ملتا ہے اس کی مثال اردو
میں کم ہی لکھنے والوں کے پاس مل سکے گی۔ عموماً عالمی سطح پر اور خصوصاً برصغیر
ہندو پاک کے دانشوریا So called intellectual طبقے کے ذہنی اور
نفسیاتی مسائل کو انتہائی فنکاری اور چابکدستی سے پیش کرنے میں قرۃ العین حیدر
کو خاص ملکہ حاصل ہے۔

ثریا جمال

بظاہر عینی کے بارے میں جو باتیں سننے میں آتی ہیں ان میں ایک
طرح کا تضاد نظر آتا ہے لیکن عینی سے مل چکنے کے بعد یہ باتیں متضاد معلوم نہیں
ہوتیں۔ غیر معمولی بھی نہیں معلوم ہوتیں اور اس تضاد میں ایک ہم آہنگی، ایک قسم
کی یک رنگی معلوم ہونے لگتی ہے..... تضاد اور ہم آہنگی ہی تانا بانا عینی کی اصل
شخصیت ہے۔

ابن سعید

حقیقت یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر کے پورے افسانوی ادب کے
تجزیے سے یہ بات روشن ہے کہ انھوں نے اپنی زیادہ تر تخلیقات میں خود اپنی
ذات کا اظہار کیا ہے اور یہ اظہار ذات محدود معنی میں ہرگز نہیں ہے بلکہ "شیشے
کے گھر" سے لے کر "روشنی کی رفتار" اور "میرے بھی صنم خانے" سے لے کر
"چاندنی بیگم" تک کی تمام تحریروں میں انھوں نے ایک "جہان معنی" آباد کر رکھا
ہے جس سے پوری طرح لطف اندوز اور محظوظ ہونے کے لئے تاریخی بصیرت
لازمی شرط ہے۔

ارتضیٰ کریم

قلبِ صمیم

ثنائے مُرسَلؐ

عبدالعزیز خالدؔ

رحمت کا پیمبر بھی، ملاحم کا نبی بھی
جس کے عجمی بھی ہیں مُصدِق، عربی بھی

ایسے ہیں غیوراس کے فدکار کہ ان سے
برداشت نہ ہواس کی تنک بے ادبی بھی

گو سیرتِ اطہر بھی ہے اک دائمی مضموں
موضوعِ ثنا اس کی ہے زیبا نسبی بھی

وہ جس نے کہ اضداد کو آہنگ میں ڈھالا
تکتی ہے تعجب سے جسے بُوالعجبی بھی

ہاں جسے آغوشِ یتیمی نے مُعزّہ
ہر کُوث ہے جس کی صحیح النسبی بھی

جس سے دمِ آخر کہے جبریل: ''اے احمد!
میں آج سے دنیا میں نہ آؤں گا کبھی بھی!''

تھی اس کے ہونٹوں میں، بطحا کی فضا میں
وہ گرمیِ انفاس، وہ بُو باس ابھی بھی

وہ ہونٹ گُلِ تازہ کو شرمندہ کریں جو
وہ ہونٹ خجل جن سے ہے شیریں لبی بھی

ہو نامِ محمدؐ کا جہاں مشعلہ روشن
ہوتی ہے شرر بار وہاں بُولہبی بھی

درکار نہیں اس کو کسی کی بھی اعانت
اس شانِ توکّل پہ ہے غش بے طلبی بھی

یہ ہے وہ مقام اسوۂ تسلیم و رضا کا
بن جاتی ہے اسبابِ جہاں بے سببی بھی

اک بار جو خوش جرعۂ زمزم کا اٹھا لے
شوراب لگے اس کو نبیذِ عنبی بھی

بلکہ تو ہو بے ذائقہ اس کیف کے آگے
خوبانِ مغاں شیوہ عنّاب لبی بھی

اس بات کا عرفاں ہو نہ اربابِ شکم کو
ہے معقلۂ نوکِ زباں تشنہ لبی بھی

اترا جو کلام آنسوئے افلاک سے اس پر
تقویتِ دل بھی ہے شفائے عصبی بھی

بخشش ہے اسی کی یہ شکر خند، اسی کا
فیضان ہے یہ بادِ بہوئے نیم شبی بھی

جس کے در سے ہمیں عشق کا آزار لگا
خالدؔ اسی در سے کریں درماں طلبی بھی

نعتِ رسولؐ

صابرؔ عظیم آبادی (کراچی)

کب میّسر ہوگی مجھ عاصی کو قربت آپ کی
اپنی جانب کھینچتی رہتی ہے الفت آپ کی

میں اندھیرے میں چلا جب اپنی منزل کی طرف
رہبری کرتی رہی شمعِ ہدایت آپ کی

پیکرِ صدق و صفا ہیں منبعِ مہر و خلوص
قابلِ تقلید ہے گویا صداقت آپ کی

آپ کے آنے کا مقصد کیا تھا کیوں بھیجے گئے
ہے عیاں ہر شخص پر ساری حقیقت آپ کی

کیجئے اپنے کرم سے دور سب کی مشکلیں
ہر کس و ناکس کو ہے آقا ضرورت آپ کی

رحمت اللعالمین ہیں مونس و غم خوار ہیں
ہو غلاموں پر کبھی چشمِ عنایت آپ کی

آپ کی سنت پہ صابرؔ چل پڑا یہ سوچ کر
مشعلِ راہِ ہدایت ہے شریعت آپ کی

نعتِ رسولؐ

منظر ایوبی

ہوئے مصروف کیا نطق و دہن ذکرِ پیمبر میں
اجالوں نے بسیرا کر لیا آ کر مرے گھر میں

زمیں تا عرش ہر شے جھومتی محسوس ہوتی ہے
قلم ہوتا ہے جب محوِ رقم وصفِ پیمبر میں

میں کس منہ سے تری چوکھٹ کا بوسہ لوں مرے آقاؐ
نہیں کچھ پاس جز اشکِ ندامت دیدۂ تر میں

نہیں دیکھا کسی نے سایہ جس نورِ مجسم کا
اسی کی رحمتِ کامل کا ہے سایہ مرے گھر میں

سرِ طیبہ جبیں بے تاب رہتی ہے پئے سجدہ
عجب سودا محبت کا سمایا ہے مرے سر میں

شفاعت کی تمنا ہے تو سرکارِ دو عالم سے
غلامی کی سند لے کر چلو میدانِ محشر میں

شہنشاہوں کو خاطر میں کہاں لاتا ہے وہ منظرؔ
گدائے کوئے سرور ہو لکھا جس کے مقدر میں

سخن تازہ

سید مشکور حسین یاد

پریم کہانی جب بھی سُنانی پڑتی ہے
آنسوؤں سے آواز ملانی پڑتی ہے

اپنے سنگ بھی سوانگ رچانا پڑتا ہے
خود سے پوری بات چھپانی پڑتی ہے

رات کے زخم سے تارا تارا بجھتے ہوئے
جگنو جگنو جنگ چلانی پڑتی ہے

پانی خود ہے پیاس، سراب ہے اُس کی آگ
پانی کی یوں پیاس بجھانی پڑتی ہے

اُتنا اُتنا ہاتھ سے ساتھ نکل جاتا ہے
جتنی جتنی بات جتانی پڑتی ہے

خاک سے جتنا خواب اُبھر کر آتا ہے
خواب میں اتنی خاک ملانی پڑتی ہے

صبحِ صادق سے جب آنکھیں خیرہ ہوں
سچ کی بجری سانجھ سجانی پڑتی ہے

محسن احسان

بے پیرہن ذات ہیں بے نام و نسب ہم
اس شہر میں زندہ ہیں مگر زندہ ہیں کب ہم

خوش منظریٔ صبح نظر آئے تو کیسے
آنکھوں میں لئے پھرتے ہیں تاریکیٔ شب ہم

اب عرش سے کیا واسطہ ہم اہلِ زمیں کا
خود اپنے ہی بندے ہیں تو خود اپنا ہی رب ہم

آ نذر گذاریں تری دو چار بگولے
اس دشت میں رکھتے ہیں یہ سامانِ طرب ہم

حیرت ہے کہ پچاس برس بعد بھی محسنؔ
ہیں ملکِ خداداد میں انصاف طلب ہم

''چہارسُو''

شبنم رومانی

یہ ہے میری شباہت، میں نہیں ہوں
جو میں ہوں، درحقیقت میں نہیں ہوں

کہیں ہوں میں ہی ہوں، حسبِ تمنا
کہیں، حسبِ ضرورت، میں نہیں ہوں

مری ایجاد ہے یہ عالمِ حسن
یہ مانا خوبصورت میں نہیں ہوں

یہ ثابت ہے کہ ہوں آدم کا بیٹا
ثبوتِ آدمیت میں نہیں ہوں

تو پھر آخر پسِ آئینہ ہے کون
اگر آئینہ صورت میں نہیں ہوں

تو میری وجہِ رسوائی ہے پھر کون
جو تیری وجہِ شہرت میں نہیں ہوں

افتخار عارف

ہو کے دُنیا میں بھی دُنیا سے رہا اور طرف
دل کسی اور طرف دستِ دُعا اور طرف

اک رجز خوان ہنر کاسہ و کشکول میں طاق
جب صف آرا ہوئے لشکر تو ملا اور طرف

اے یہ ہر لحہ نئے وہم میں اُلجھے ہوئے شخص
میری محفل میں اُلجھتا ہے تو جا اور طرف

اہلِ تشہیر و تماشا کے طلسمات کی خیر
چل پڑے شہر کے سب شعلہ نوا اور طرف

کیا مسافر تھا سفر کرنا تھا اس بستی میں
اور کو دیتے تھے نقشِ کفِ پا اور طرف

شاخِ مژگاں سے جو ٹوٹا تھا ستارہ سرِ شام
رات آئی تو وہی پھول کھلا اور طرف

نرغۂ ظلم میں دُکھ سہتی رہی خلقتِ شہر
اہلِ دُنیا نے کئے جشن بپا اور طرف

رفعت سروش

میرے دل میں اک سمندر پیچ و خم کھاتا ہے ہر دم
مضطرب سا اک نظام بے یقینی مجھ میں قائم

ایک سُر بھی ہو غلط تو گیت ہو جاتا ہے مبہم
جسم بھی ایک راگنی ہے اور عناصر ایک سُرگم

کوئی منزل ہے نہ جادۂ ہر قدم ہے بے ارادہ
ہم سفر کوئی نہیں ہے ہاں مگر اک سعیٔ پیہم

یہ کہاں لے آئی مجھ کو اے مری عمر گریزاں!
یاں نہ خُلق و مہر و الفت اور نہ رسم ربط باہم

چل رہے ہیں لوگ کاندھوں پر اٹھائے اپنی لاشیں
کونسی دنیا میں آخر آ گئے اے زندگی ہم

موت اپنے ساتھ لے جائیگی تو کتنے جنازے
بزمِ اردو میں ہوا جاتا ہے اب تو ہُو کا عالم

اے سروش اب جی الجھتا ہے ہجوم بے اماں سے
وہ خوشی کا شور و غوغا ہو کہ ہو ہنگامۂ غم

جاوید شاہین

گھڑی دو پل میں اندھیرا اترنے والا ہے
اک اور دن مرا خالی گذرنے والا ہے

اتر کے چھت پہ مری پچھلی شب کو اک تارا
بہت ہی راز کی اک بات کرنے والا ہے

مجال ہے جو رُتوں میں کہیں خلل آئے
بس ایک موسم دل ہی ٹھہرنے والا ہے

بگڑتی جا رہی ہے اس طرح سے شکل جہاں
بنانے والا بنا کر مکرنے والا ہے

ذرا سا آنے لگا ہے کریدنے میں مزہ
کہیں سے زخم کوئی جیسے بھرنے والا ہے

کبھی تو کوئی نہیں حسن بے خبر میں مگر
بس اک جگہ سے ذرا سا سنورنے والا ہے

ہوائے صبح! ٹھہر جا کہ تیرے چلنے سے
گلوں پہ قطرۂ شبنم بکھرنے والا ہے

ذرا خیال رکھ شاہیں عمارتِ دل کا
کہیں سے رنگِ تمنا اترنے والا ہے

مامون ایمن (نیویارک)

آرزوئے زندگانی کار فرما ہو کبھی
بے قراری میں سکوں کا راز اِفشا ہو کبھی

جذب کی اِک موج ہو موجِ رَسائے دیدہ وَصل
دِل کے دروازے پہ کوئی حشر بَرپا ہو کبھی

موت سے پہلے بھی ٹھہرے زندگی ہی زندگی
آئنے میں خود نگاہی کا سَراپا ہو کبھی

شاہد و مشہود کی حد سے گذر جائے کمال
خواب کی تمثیل سے بڑھ کر تمنا ہو کبھی

ضبط کے جنگل سے نکلیں خواہشوں کے سلسلے
خود فراموشی سرِ بازار رُسوا ہو کبھی

وَقت کا ہر راز کھلتا جا رہا ہے فِکر پر
فکر کی اپنی حقیقت بھی ہویدا ہو کبھی

زندگی کے واسطے ہم نے خریدا موت کو
موت سے پھر زندگی کا کوئی سودا ہو کبھی

ایک قطرے کے لیے تڑپے سمندر کی حیات
آبروئے شعلِ احساس تنہا ہو کبھی

مُسکرا کر بے وفا، ایمن! ہمیں کہہ دے وہ حُسن
عشق پہ ایمان اپنا کاش کچا ہو کبھی

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ (دہلی)

لے آئی زندگی یہ مُجھے کس مقام پر
ہر ایک شئے نگاہ میں ہے اختتام پر

ہنگامہ سا بپا تھا کبھی، اب وہ دن کہاں
آتی ہے آج مجھکو ہنسی صبح و شام پر

اُٹھکر یہاں سے جائیں کہاں، کُچھ پتہ نہیں
کب تک گزارا ہو تہی مینا و جام پر

کوئی اُمنگ، کوئی تمنا، کوئی اُمید
آمادہ خود کو پاتا ہوں کس انجام پر

دُھندلا گئی عبارت اوراقِ زندگی
اِک داستاں لکھی تھی کبھی تیرے نام پر

لگتا ہے اپنا شہر بھی اب گھر بھی اجنبی
گردش میں آگیا ہوں میں ایسے مقام پر

ہونے لگے حیات کے سائے بھی اب طویل
حیراں ہے تشنہ وقت کے اس اختتام پر

ڈاکٹرعبدالرحمان عبدؔ

وہی سرگوشیاں میٹھی، وہی جملے محبت کے
محبت مانگتی ہے عمر بھر وعدے محبت کے

نظر آتی ہیں تحریریں نئی اوراقِ ہستی پہ
زمانہ لکھ رہا ہے نت نئے قصے محبت کے

وہی جادو نگاہوں میں، وہی ہے بے بسی دل کی
جہاں بدلا مگر قانون کب بدلے محبت کے

محبت نام ہے قلب و جگر کی مسکراہٹ کا
بہت نادان ہے جو خواب نے دیکھے محبت کے

مری نظروں میں ایسے لوگ بھی رشک ملائک ہیں
محبت کے عوض جن کو ملے دھوکے محبت کے

یہ دنیا ہے یہاں سب کو محبت کی ضرورت ہے
کہیں یا نہ کہیں، سب لوگ ہیں بھوکے محبت کے

محبت کرنے والوں پہ بڑھاپا آ نہیں سکتا
سلگتے ہیں بدن میں عمر بھر شعلے محبت کے

سفر انسانیت کا اَن گنت ادوار سے گزرا
رہے صدیوں پہ بھاری مختصر لمحے محبت کے

ڈاکٹرمناظرعاشق ہرگانوی

دوہاغزل

سب کے من کرودھ بھرا ہے سیّد ہو کہ میر
جس کے من سنتوش بھرا ہے سب سے بڑا فقیر

سارے جھمیلے دنیا کے ہیں منوا کی جاگیر
سر پہ تاج ہے کانٹوں کا پاؤں میں ہے زنجیر

نا پھولوں میں باس ہے باقی نا کلیوں میں تاثیر
فصلِ بہاراں کی آنکھوں میں پت جھڑ کی تصویر

سسرال بھلا نہ میکا جس کا اس کی کیا تقدیر
دن سوچوں گذارے ابلا، رات بہائے نیر

جس کی قسمت میں تھی کبھی خوشیوں کی تحریر
جو بانٹ رہا تھا بھر بھر جھولی آج وہی دلگیر

ڈاکٹر حنیف ترین

لوگ سَر دھنتے ہیں جن کی یاد میں
وہ محاسن تھے مرے اجداد میں

خوشبوئیں بھر کر تمہاری یاد میں
گُل کھلا دونگا شب آباد میں

ماورا ہیں جو مضامیں ذہن سے
ہم تلاشیں گے تمہاری داد میں

پھر ابابیلیں اُترتیں غیب سے
ہوتا گر صالح عمل فریاد میں

دیکھ کر روحِ ہلاکو رو پڑی
اس صدی کا سانحہ بغداد میں

نسلِ نو میں وہ خصوصیت کہاں
تھی جو برکت ورثۂ اجداد میں

اپنوں نے زندہ جلا ڈالا جسے
غیر نے دفنا دیا بغداد میں

شاہد واسطی

تیری یادیں اس طرح چلتی ہیں دل کی ریل پر
جس طرح اتریں پرندے جھلملاتی جھیل پر

تو مجھے مل جائیگا اس کی خبر کبھی بھی نہیں
ورنہ اُترا ہے کبھی کچھ دل کی اس انجیل پر

معجزہ وہ بھیج سکتا ہے کبھی کشمیر میں
راستے جس نے بنا ڈالے تھے آبِ نیل پر

کچھ نہ ہو پاتا رقیبوں سے مجھے معلوم ہے
سارا ہنگامہ ہوا ہے یہ تمہاری ڈھیل پر

صرف پہلے قتل ہی کا جرم تو وارد نہیں
جانے کتنے مقتلوں کا بار ہے قابیل پر

یہ ازل سے ہو رہا ہے ایک میں مجرم نہیں
سینکڑوں پروانے مر مٹتے ہیں اِک قندیل پر

تم نہ آئے پوچھنے اس کا گِلہ میں کیا کروں
کون سا بیٹھا ہوں میں اے دوست چھتیس میل پر

سُلطان صبروانی

یہ بھی ہُوا کہ جذبوں کے محور بدل گئے
بدلا جو آسماں تو سمندر بدل گئے

یہ بھی ہوا کہ ہجر کی شب نیند آ گئی
یہ بھی ہوا کہ خواب کے منظر بدل گئے

یہ بھی ہُوا چراغ سبھی زخم کے بجھے
یہ بھی ہُوا کہ رات کے نشتر بدل گئے

یہ بھی ہوا کہ حلقۂ شب اور بڑھ گیا
یہ بھی ہوا کہ صبح کے منظر بدل گئے

یہ بھی ہوا کہ وقتِ سحر تھا اذاں نہ تھی
یہ بھی ہوا کہ مسجد و منبر بدل گئے

یہ بھی ہوا عنانِ زماں اپنے ہاتھ تھی
یہ بھی ہوا کہ وقت کے تیور بدل گئے

یہ بھی ہوا کہ ڈرتے رہے اپنے سایے سے
یہ بھی ہوا کہ خوف کے منظر بدل گئے

یہ بھی ہوا کہ اگلی صفوں میں کوئی نہ تھا
بازو کٹے تو اپنے ہی لشکر بدل گئے

اے صبؔر ہم نے لفظ سلیقے سے چُن دیے
الزام یہ نہ آئے سخنور بدل گئے

قیصر نجفی

کبھی خوشی میں کبھی غم میں ڈوب کر روئے
کسے خبر ہے کہ ہم لوگ عمر بھر روئے

یہ حادثوں کا جہاں ہے سن اے دلِ ناداں
کسی کی شام کسی کی یہاں سحر روئے

لہو کے اشک وہ کن دامنوں کی نذر کریں
کہ جن کا دل کبھی روئے کبھی جگر روئے

کنارِ آب تھے دونس آج محوِ خرام
ہم ان کے پاس بہت دیر بیٹھ کر روئے

وہ کشتیاں وہ مسافر وہ ناخدا ہیں کہاں
جنھیں ڈبو کے ندامت سے خود بھنور روئے

کٹے درخت تو شاخوں کو تھام کر قیصؔر
طیور دیر تلک پھوٹ پھوٹ کر روئے

''چہارسُو''

انوار فیروز

جو بسایا تھا گھر چھوڑ دیا
ہم نے کیوں زادِ سفر چھوڑ دیا

ہے کوئی زلزلہ آنے والا
کیوں پرندوں نے شجر چھوڑ دیا

بات تقسیم کی جب بھائی نے کی
ہم نے گھبرا کے وہ گھر چھوڑ دیا

اس قدر تیز چلی تھی آندھی
سبز پتوں نے شجر چھوڑ دیا

راہ میں نقش ہیں میری آنکھیں
تم نے کیوں اپنا سفر چھوڑ دیا

نذر تیں آ گئے گی تھیں اس میں
خوف سے اس نے وہ گھر چھوڑ دیا

کیا بنے گا جو مرے لوگوں نے
سچ کا دامن بھی اگر چھوڑ دیا

خیر نے اس کو پکارا فیروزؔ
جس نے بھی دیس میں شر چھوڑ دیا

خیال آفاقی

بہار آئے کہ آئے خزاں ہمیں کیا ہے
ہمارا تھوڑی ہے یہ گلستاں ہمیں کیا ہے

ہمارا کونسا رکھا ہے آشیاں کہ ڈریں
چمک رہی ہیں اگر بجلیاں ہمیں کیا ہے

زمیں ہے اپنی نہ اس کی ہی فصل ہے اپنی
اب آگ برسے کہ پانی یہاں ہمیں کیا ہے

ہمارے پاس تو اب اشک بھی نہیں باقی
کہیں سے شعلے اُٹھیں یا دھواں ہمیں کیا ہے

نہیں ہے ان کے لبوں پہ ہمارا نام تو پھر
وہ مہرباں ہوں کہ نامہرباں ہمیں کیا ہے

ہم ان کے سامنے بیٹھے ہیں آئینہ بن کر
وہ ہم سے ہوتے رہیں بدگماں ہمیں کیا ہے

ہمارا ذکر نہیں ہے اگر تو کیا حاصل
ہزار لکھے کوئی داستاں ہمیں کیا ہے

گلوں میں آگ لگے یا ستارے ماند پڑیں
زمیں ہے تری ترا آسماں ہمیں کیا ہے

خیالؔ تم کو کہیں خود غرض نہ کر ڈالے
ہر ایک بات میں کہنا میاں ہمیں کیا ہے

غالب عرفان

مرے عکس اور مجھ میں کوئی جستجو ہے باقی
نہیں روکنا تکلم ابھی گفتگو ہے باقی

مرے خستہ خاکی تن کو یوں ابھی سے تم نہ دیکھو
ابھی چاک ہے قبا میں ابھی کچھ رفو ہے باقی

میں شریک ہو رہا ہوں کسی جگہ پچھلی صف میں
نہ پڑھے کوئی اقامت ابھی کچھ وضو ہے باقی

مرے تارِ ہر نفس میں جو مہک بسائی اُس نے
مری خواب گاہ میں بھی وہی مشک بو ہے باقی

مرے ذہن و دل کے دشمن کو مٹا چکا میں لیکن
مری بے سبب انا کا ابھی اک عدو ہے باقی

نہیں نا امید ہوا مری نسلِ شیشہ گر سے
کہ نگاہِ شیشہ گر میں ابھی کچھ لہو ہے باقی

جو ازل کی روح بن کر رہی آدمی کے اندر
ابھی جسم و جانِ عرفاںؔ میں وہ آرزو ہے باقی

غفار بابر (ڈیرہ اسمٰعیل خان)

اس گریۂ پیہم نے مجھے مار دیا ہے
ہاں دیدۂ پُرنم نے مجھے مار دیا ہے

آنکھوں میں سمٹ آیا ہے برسات کا موسم
اشکوں کی چھما چھم نے مجھے مار دیا ہے

کیا موت کی جرأت کہ میرے سامنے آئے
*انصار! تیرے غم نے مجھے مار دیا ہے

بے آب رہا کرتے تھے دریا میرے آگے
اک قطرۂ شبنم نے مجھے مار دیا ہے

مجھ کو تھا بڑا زُعم کہ تُو ساتھ رہے گا
اپنے اسی دم خم نے مجھے مار دیا ہے

سچ بات تو یہ ہے کہ کسی سے ہو گلہ کیا
جب اپنے ہی ہمدم نے مجھے مار دیا ہے

ہونٹوں پہ لرزتا ہے ہر بزم تیرا نام
اس مجلس ماتم نے مجھے مار دیا ہے

اُس شام سے جس شام میرا چاند بجھا تھا
زلفِ شبِ برہم نے مجھے مار دیا ہے

کیا آپ کریں گے میرے زخموں کا مداوا
کچھ اور بھی مرہم نے مجھے مار دیا ہے

زندہ ہوں اُسی زلف کے سایے میں ابھی تک
جس زلف کے ہر خم نے مجھے مار دیا ہے

بابرؔ وہ کہاں لوٹ کے آئیں گی بہاریں
بیتے ہوئے موسم نے مجھے مار دیا ہے

*(ساڑھے چار سالہ بیٹا)

ملک زادہ جاوید

پاؤں پر اپنے کھڑا تھوڑی ہے
میرے قد سے وہ بڑا تھوڑی ہے

اک دیا بھی نہ جلایا جائے
اس قدر تیز ہوا تھوڑی ہے

وہ ہے ناراض تو ڈرنا کیا
خوبصورت ہے بلا تھوڑی ہے

لمحہ بھر میں ہوا محسوس مجھے
دشت میں ایک صدا تھوڑی ہے

گھر کی دیوار پہ پودا جاویدؔ
اپنی مرضی سے اُگا تھوڑی ہے

صدیق شاہد

اٹھتے بُجھتے درد کا اک سلسلہ رہ جائے گا
خواب ٹوٹے گا تو باقی اک خلا رہ جائے گا

ایک مدت سے رواں ہوں بے تکاں اس کی طرف
میرے مٹ جانے سے تنہا راستہ رہ جائے گا

میں نے جس ڈھب سے نبھائی اپنے ہمسائے کے ساتھ
جو بھی دیکھے گا' سُنے گا' سوچتا رہ جائے گا!

اک خیالوں کا سفر ہے اور کچھ ژولیدہ خواب
یہ اثاثہ چھن گیا تو پاس کیا رہ جائے گا!

میرا اس کا ساتھ ہے جیسے کہ متوازی خطوط
لاکھ اس کا قرب چاہوں فاصلہ رہ جائے گا

کاٹتا ہوں رات دن شاہدؔ سزا احساس کی
زندگی سے یوں مرا اک رابطہ رہ جائے گا

''چہارسُو''

سیفی سرونجی

دلوں کے فاصلے دل سے مٹانا چاہتے ہیں
ہم اپنا گھر خلاؤں میں بنانا چاہتے ہیں

تمہارے پاس بیٹھے ہیں نئی پوشاک پہنے
ہر شہر سے رشتہ بڑھانا چاہتے ہیں

زمیں ہے سرخ اور تپتی ہوئی ہے ریت پھر بھی
ہمارا شوق ہے پاؤں جلانا چاہتے ہیں

قلم کر دو ہمارے ہاتھ یہ طاقت ہے تم میں
ہم اپنے بازوؤں کو آزمانا چاہتے ہیں

ہمارے نام سے نفرت بہت ہے تم کو ورنہ
کسی کا دل بھلا ہم کب دکھانا چاہتے ہیں

تم اپنے شہر کی اپنی سیاست پاس رکھو
ہم اپنے گاؤں کو اس سے بچانا چاہتے ہیں

کرامت بخاری

بڑھائیں گے محبت میں قدم آہستہ آہستہ
کھلیں گے راستوں کے پیچ و خم آہستہ آہستہ

چلے گا لوحِ دل پہ یہ قلم آہستہ آہستہ
تو ہو گی ہر حدیثِ غم رقم آہستہ آہستہ

وہ پتھر ہے تو پھر اُس کو تراشیں گے محبت سے
بنا لیں گے اُسے آخر صنم آہستہ آہستہ

سُنا ہے کہ کل بھری محفل میں اُس نے توڑ ڈالی ہے
شبِ وعدہ جو کھائی تھی قسم آہستہ آہستہ

شبِ فرقت ستاروں سے کسی کی گفتگو کرتے
اُترتا ہے مری آنکھوں میں نم آہستہ آہستہ

زمانہ زندگی کے ساتھ بے آواز چلتا ہے
یونہی تاریخ ہوتی ہے رقم آہستہ آہستہ

ہمیں سے تو عبارت ہے اُمید عہدِ آئندہ
ہمیں توڑیں گے صدیوں کا بھرم آہستہ آہستہ

''چارسُو''

علی آذر

جو تمہیں کہنا ہے کہہ دو کہ ہو مختار اسوقت .... !
اور مرے سر پہ ہے تقدیر کی تلوار اس وقت

ہر طرف آنسوؤں کے بدلے میں پتھر سے جواب
شہر کا شہر ہوا' شام کا بازار اسوقت

خود پسندی اور تکبیر ہے تمہارے دل میں
ہر کوئی اپنے ہوا لگتا ہے بیکار اِسوقت

دور سے دیکھتی ہیں لہریں عداوت سے مجھے ....!
میری کشتی کے قریں رُک گیا منجدھار اِسوقت

شاید مر جاؤں تو ہو جاؤں دوبارہ زندہ . . .!
جا کے خود کو ہی چڑھا دوں میں سرِ دار اِسوقت

آتے آتے ہی تو آئے گی قیامت یارو....
آنے لگ گئے ہیں قیامت کے کچھ آثار اِسوقت

تیرگی پھیل گئی ہے علی آذر ہر سُو . . . .
یاد آنے لگا ہے مجھکو مرا پیار اِسوقت

شہنازنور

سبب تو کچھ بھی ہے ممکن مگر حقیقت ہے
ہمارے بیچ بھرم یا فقط ضرورت ہے

جب اپنے آپ سے میں نے تیری وکالت کی
وہ ساعت آج بھی آئینۂ شکایت ہے

ہے شہر کس لئے بے رنگ و بو کہ تجھ کو تو
ہمارا خون بہانے کی بھی اجازت ہے

تمہارے ہجر میں گذریں ہزارہا راتیں
مگر یہ آخری شب تو عجب قیامت ہے

دنوں کے بعد ملا والہانہ وہ' تو کھلا
کہ دوستوں کا بچھڑنا بھی اک ضرورت ہے

خبر نہیں میں کہاں رکھ کر خود کو بھول آئی
رہا ہے باقی اگر کچھ تو صرف وحشت ہے

دیارِ صوت و سخن میں یہ نور رکھنا یاد
جو زندہ رکھتی ہے شہرت نہیں ہے عزت ہے

''چہارسُو''

شگفتہ نازلی

کتنا بھی ساتھ ساتھ چلیں' راستے جُدا
کتنے بھی پھول پاس کھلیں' راستے جُدا'

دن کی رفاقتوں کا بھی کوئی جواز کیا
اب روشنی میں سائے گھلیں' راستے جُدا'

کوئی بھی موڑ ہو کبھی مل لینا چاہیے
جانے کہ پھر ملیں نہ ملیں' راستے جُدا'

آسودگی کا کچھ تو ہو سامان آس پاس
کیسے وہ شب و روز ڈھلیں' راستے جُدا'

جب کہ ملال بھی نہیں بے اعتنائی پر
کیونکر وہ سارے زخم بھریں' راستے جُدا'

اُس نے شگفتہ منفرد دُنیا بسائی ہے
کس بات پر لوگ جلیں' راستے جُدا!'

نثار ترابی

آنکھ بیدار ہوتی جاتی ہے
نیند ناچار ہوتی جاتی ہے

وہ جو حالت تھی اُس کنارے پر
اَب وہ اِس پار ہوتی جاتی ہے

ہم نے سمجھا تھا پہلی اینٹ جسے
اَب وہ دیوار ہوتی جاتی ہے

زندگی آ کے تیرے کوچے میں
کوئی کردار ہوتی جاتی ہے

تُم نہیں ہو تو یوں لگے جیسے
عُمر بیکار ہوتی جاتی ہے

حقیرؔ نوری

بے نیازانہ مرے زخم ہنر سے گزری
جب بھی گزری ہے یہ آندھی مرے سر سے گزری

آرزوؤں کے کھلونے ہوئے پارہ پارہ
اتنی عجلت میں حیات اپنے سفر سے گزری

ہاتھ کچھ آ نہ سکا حیرت و حسرت کے سوا
نت نئی چیز سرِ راہ نظر سے گزری

مجھ سے گُم کردۂ آلام کو کیا اس کی خبر
صبح کب آئی یہاں شام کدھر سے گزری

میں تری بزمِ طرب میں رہا شامل لیکن
کتنی تکلیف مرے دل سے جگر سے گزری

اے مسیحا تجھے احساس تو ہو گا اس کا
میری خواہش ترے اندازِ نظر سے گزری

جب بھی اس دورِ سیہ بخت کو سوچا ہے حقیرؔ
خون کی دھار مرے دیدۂ تر سے گزری

پروفیسر زُبیرؔ گنجاہی

مَیں نے ہر اک بات پر تیری کیا ہے اعتبار
پہلے بھی میں کہہ چکا ہوں عرض ہے اِک اور بار

ہر ضرورت اِک مُصیبت بَن گئی میرے لئے
مَیں کِسی صورت نہیں کر سکتا ہوں ان کا اختصار

عقل اور دانش سے جس نے بہرہ ور مجھ کو کیا
اُس خُدا کی ذات پر دائم رکھوں گا انحصار

ترکِ اُلفت کا اشارہ کر دیا ہے آپ نے
اَب کہاں ہیں جو کئے تھے آپ نے قول و قرار

پائیں گے اُس کا ثمر بویا ہے جو پیڑ آپ نے
یوں تو سب کے سامنے پھیلے ہوئے ہیں مرغزار

جو کیا ہے سوچنا اُس پر عبث ہے اِس گھڑی
شکر ہے اللہ کا مَیں ہو چکا ہوں واگذار

قول میں اَور فعل میں ہر ہر قدم کتنے تضاد
پر زُبیرؔ اپنا نہیں ہوتا ایسوں میں شمار

سرفراز تبسم

پانی پر تلوار چلاتا رہتا ہے
دُور سے لیکن ہاتھ ہلاتا رہتا ہے

کینوس پر تصویر بنانے کی خاطر
رنگوں کے کئی تیر چلاتا رہتا ہے

چار آنکھوں کے دیپ جگانے کی خاطر
دو آنکھوں کے دیپ جلاتا رہتا ہے

اس کے دل آسماں چھونے کے لئے
ساری رات زمین بناتا رہتا ہے

مٹی کا دربار سجاتا ہے پہلے
پھر اُس میں زنجیر ہلاتا رہتا ہے

مشتاق شبنم

اتنا شائستہ اظہار نہ ہونے پایا
میں نئے دور کا معیار نہ ہونے پایا

میرے در سے کئی ہنگامۂ محشر گزرے
خواب ایسا تھا کہ بیدار نہ ہونے پایا

زخم بھی دیتے ہیں احباب توقع کے خلاف
کیا مروّت ہے کہ انکار نہ ہونے پایا

مطلعِ صبح رہا مصلحت اندیشوں میں
ایک سورج کہ ضیابار نہ ہونے پایا

یہ سوال ایسا ہے جس کا نہیں ملتا ہے جواب
کیوں بشر صاحبِ کردار نہ ہونے پایا

نت نئی شکل میں تجدیدِ ستم ہوتی رہی
ختم وہ فتنۂ تاتار نہ ہونے پایا

اس پہ تنقید بہت سخت ہوئی ہے شبنم
پھر بھی تائب وہ سیہ کار نہ ہونے پایا

جوازجعفری

نہ کہکشاں پہ نہ افلاک پر گذارہ کیا
تمام عمر اسی خاک پر گذارہ کیا

کسی بھی آنکھ میں چمکا نہ آشنائی کا رنگ
تو ہم نے دیدۂ نمناک پر گذارہ کیا

کیا ہے کارِ تمنا کچھ اس قرینے سے
کبھی جنوں، کبھی ادراک پر گذارہ کیا

تمام عمر خوش آیا ہمیں لباسِ ملال
سو ہم نے ایک ہی پوشاک پر گذارہ کیا

بہت سے زخم سرِ راہ منتظر تھے مگر
جوازؔ ہم نے اسی چاک پر گذارہ کیا

فیصل عظیم

زباں صدمے سے بےخاموش آنکھیں میری پتھر ہیں
کبھی بازار گھر سے دُور تھے اب گھر کے اندر ہیں

کہاں تک ارتقا کی بے لگامی دیکھ پائیں گے
ہم آزادی کے دیوانے' پر اپنی حد کے اندر ہیں

ہمارے ہاتھ سے ٹوٹیں گے یہ بت نو تراشیدہ
صنم خانے کا حصہ ہیں مگر ہم ابنِ آزر ہیں

نہ پاسِ ابنِ آدم ہے نہ حرمت بنتِ حوا کی
نشانِ بے لباسی ہیں کہ آزادی کے پیکر ہیں؟

ہمیں تو پتھروں کا دور پھر محسوس ہوتا ہے
ترقی کے ہیں عنوانات اور پستی کے منظر ہیں

اجیت سنگھ حسرت (لدھیانہ بھارت)

اِس چمن کا عجیب مالی ہے
جس نے ہر شاخ کاٹ ڈالی ہے

دن اُجالا گنوا کے بیٹھ گیا
رات نے روشنی چُرا لی ہے

غم کی عصمت بچی ہوئی تھی مگر
وقت نے وہ بھی روند ڈالی ہے

معجزہ ہو جو بچ نکل جائے
پانچ شہباز ایک لالی ہے

یہ ترا عدل کیا ہُوا یا رب
کوئی اونچی ہے کوئی خالی ہے

آنکھ میں چُبھ گئے کئی منظر
اب کہاں نیند آنے والی ہے

پہلے وقتوں میں ہو تو ہو شاید
دوستی اب حسین گالی ہے

خیمۂ ضبط کی طنابیں کھینچ
ہاں گھٹا ٹوٹ کے برسنے والی ہے

چلتے رہنا محسوس ہوا حسرتؔ
پاؤں زخمی ہیں رات کالی ہے

شہباز خواجہ

حصار تیرہ شبی میں بھی دل سنبھل جاتا
چراغِ عزم اگر جسم و جاں میں جل جاتا

تمہاری یاد سے رشتہ بحال رکھنے کو
میں ہر حصارِ غم دہر سے نکل جاتا

کہیں تو زلف کی چھاؤں نصیب میں ہوتی
کہیں تو قہر کا سورج سروں سے ڈھل جاتا

مرے لئے نہ اُترتی اگر بہار کی رُت
میں تیری یاد کے رنگوں سے ہی بہل جاتا

یہی نہیں کہ سدا میں ہی گُم رہا اُس میں
کبھی کبھی تو مری لَے میں وہ بھی ڈھل جاتا

کبھی کبھی تو کڑی دھوپ بھی بھلی لگتی
کبھی کبھی میں خنک چاندنی میں جل جاتا

بجا کہ ضبطِ مسلسل بھی کم نہ تھا شہبازؔ
مگر یہ لمحہ جدائی کا مجھ سے ٹل جاتا

ندیم ساحلؔ

سیراب کر رہے تھے نظر کو سراب میں
صحرا بنا دیا یونہی تصویرِ آب میں

خوشبو تو ہو گئی ہے ہواؤں میں خیمہ زن
کانٹوں کو اب تلاش کریں گے گلاب میں

تجھ کو بھی چھاؤں سے کوئی سایہ نہ مل سکا
مجھ کو بھی روشنی نہ ملی آفتاب میں

اے ہستیٔ خیال ترے ظرف کے سوا
یکجا ہوا ہے کون مرے اضطراب میں

اے سرد ذہن یوں کہ تیرا دل بُرا نہ ہو
اک دردِ ہم نے سوچ کے رکھا نصاب میں

لمحوں کا فیصلہ نہیں صدیوں کی بات تھی
روحوں کا تصفیہ نہیں ہوتا شباب میں

پھر یوں ہوا کہ وہ بھی گناہوں میں ڈھل گیا
میں جس کو دیکھتا تھا بدن کے ثواب میں

دشمن کا انحراف تو ہوتا نہیں قبول
تعبیر کا فساد نہیں ہوتا خواب میں

سورج نے اپنے جسم کی شکنیں سمیٹ لیں
آرام کیا ملا تھا اسے ماہتاب میں

سارا ہی جسم اس کی نگاہوں میں آ گیا
ڈھانپا تھا اپنی روح کو اس نے نقاب میں

اترا نہیں جو پچھلے صحیفوں میں آج تک
وہ حرف لکھ رہا ہوں میں اپنی کتاب میں

رحمان* اور لطیف* کی کشتی میں بیٹھ کر
اے کاش اس کو شعر سناتا چناب میں

*رحمان بابا
*شاہ عبداللطیف بھٹائی

شہاب صفدر

خلا سے دور جو ہونے کا کچھ گماں سا ہے
زمینِ دل پہ محبت کے آسماں سا ہے

مرے مکان میں کیا تھا جو میرے لائق تھا
یہ تیرے آنے پہ ہر گوشہ اک جہاں سا ہے

ترے جمال کو خود سے جُدا کہوں کیسے؟
مثالِ دل ہے کوئی نقش کوئی جاں سا ہے

ہزار بار میں جیسے اِدھر سے گزرا ہوں
یہ ایک موڑ نہ جانے کہاں کہاں سا ہے

مشقتوں نے کچھ ایسے بدن نچوڑ دیا
کہ قطرہ قطرہ مجھے بحرِ بیکراں سا ہے

نہیں نہیں یہ مری منزلِ حیات نہیں
ترے کرم سے مرا عزم سرگراں سا ہے

شہابؔ دل عجب آزاد مرد تھا اس کو
زنِ طلب نے بڑی مشکلوں سے پھانسا ہے

''چہارسُو''

سید فیاض علی

نہ جانے کب سے تلاش خود کو میں کر رہا ہوں
میں ہوں تو دریا' زمیں کے نیچے چھپا ہوا ہوں

جو میں نے بانٹی تھیں زندگی بھر محبتیں اب
میں ان کو پانے کی آرزو میں بھٹک رہا ہوں

خدا ہے شاہد کہ سچ کا سودا ہے میرے سر میں
یہ معجزہ ہے میں قتل ہونے سے بچ گیا ہوں

مجھے گلے سے لگانے والو یقین رکھنا
میں واپسی کے تمام رستے بھلا چکا ہوں

جو میرے حُسنِ نہاں کو سب پر عیاں کرے گا
اُس آئینے کی تلاش میں اب میں جا رہا ہوں

عجیب منظر مری بصارت کو ڈس رہے ہیں
مگر میں پھر بھی نگاہ و دل کو بچا رہا ہوں

صداقتوں کے چراغ فیاض جب بُجھائے
رواجوں کے مہیب جنگل میں کھو گیا ہوں

اوصاف شیخ

کیسے جی پاؤں بے نشاں ہو کر
ساری دنیا سے بدگماں ہو کر

دیکھ نقصان میں رہے گا یہاں
تو میرے جیسا خوش گماں ہو کر

خاک پر میرا ہم نشیں تھا کبھی
اب جو ملتا ہے آسماں ہو کر

ملتے رہتے ہیں عمر بھر جن کو
جینا پڑتا ہے سائباں ہو کر

دفن ہو جائے گا کتابوں میں
عشق اپنا بھی داستاں ہو کر

منزلیں خود قریب آئیں گی
آؤ چلتے ہیں کارواں ہو کر

زیست اوصاف ایک قطرہ ہے
کیا کریں بحرِ بیکراں ہو کر

سیاہ فام

ڈاکٹر عمران مشتاق

"آخر اللہ نے یہ کالے لوگ پیدا ہی کیوں کیے؟ جنھیں نکموں کے کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے۔ لڑائی جھگڑا دنگا فساد توڑ پھوڑ بدمعاشی قتل و خون آبرو ریزی ڈاکہ زنی مگنگ جیسے ہر جرم میں ملوث۔" وہ نفرت سے ہونٹ سکوڑ کے رہ گئی۔ دیر تک منہ ہی منہ میں بڑبڑانے کا عمل جاری رہا۔ اُس کی نظریں چکنے فرش پر پھسلتی پھسلتی لمبی راہداری کے آخر تک گئیں۔ راہداری کا اختتام ایک لمبے چوڑے ویٹنگ روم میں ہوتا تھا۔ دو جانب نشستوں پر مشتمل ویٹنگ روم، جہاں بیٹھ کے مریض اپنی باری کا اُس وقت تک انتظار کرتے جب تک اُن کا ڈاکٹر کی جانب سے بلاوا نہ آ جاتا (کون جانے کچھ لوگوں کے لیے یہ آخری بلاوا ہوتا ہو)۔ ویٹنگ روم اِس وقت خالی پڑا تھا۔ نہ ڈاکٹر نہ کوئی مریض۔ ویٹنگ روم کے کونے میں فرش سے دس فٹ بلند دیوار سے منسلک لوہے کے مضبوط اسٹینڈ میں دھرا کلر ٹیلی ویژن اپنے فل والیوم میں چل رہا تھا۔ ایتھنز اولمپک سے دوڑوں کے مقابلے براہِ راست دکھائے جا رہے تھے۔ اس عمر میں بھی بنا چشمے کے آنکھوں کو ہلکا سا سکوڑ کے وہ ٹی وی پر چلتی رنگین تصویروں کو بخوبی دیکھ سکتی تھی۔

"ایک..... دو...... تین..... چار.....پانچ..... اور چھ....."

پستول کے فائر کا انتظار کرتے ہوئے ایک سے آٹھ نمبر تک ہر ایتھلیٹ ساکت مگر چاق و چوبند دوڑنے کو تیار۔ اُس نے گنا، اُن میں سے چھ سیاہ فام تھے۔ "کھیل کود کے سوا ان کو اور آتا ہی کیا ہے۔ کھیلوں میں یہ بے شک آگے ہیں۔ اسی لیے ہر ملک کی ٹیم میں یہ شامل ہو جاتے ہیں۔ اپنی حرکتوں سے یہ یہاں بھی باز نہیں آتے۔ طاقت آور ممنوع اشیا کے استعمال سے اپنے جیتنے کی راہ ہموار کرتے ہوئے منتظمین کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈوپ ٹیسٹ (Dope test) پازیٹو ہونے پر ملک کا نام بدنام کرتے ہیں۔ خیر یہ کام تو دوسرے بھی کرتے ہیں مگر زیادہ یہ حبشی ہی کرتے ہیں۔"

اُس کی توقع کے مطابق ہونے والی دوڑ میں پہلی تینوں پوزیشنیں سیاہ فام ایتھلیٹس نے ہی حاصل کی تھیں۔ "اب دیکھیں ان میں سے کون کون ڈوپ ٹیسٹ پازیٹو ہونے کی صورت میں اپنے میڈل سے محروم ہوتا ہے۔"

اُس کی سوچ میں ڈوبی نگاہیں ٹی وی سکرین سے جدا ہو کے پھر چکنے فرش پر پھسلنے لگی تھیں۔ کچھ دیر تک وہ کسی سوچ میں گم نا معلوم تانے بانے بنتی رہی پھر تھکے تھکے انداز میں ایک چھوٹے سے کمرے میں گھس گئی جو شاید اسٹور تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ باہر نکلی تو چہرے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں اور سانس بے ربط ہو چکا تھا۔ سانس کی بحالی کے لیے جتنا وقت درکار تھا وہ اُس نے لیا۔ لمحہ بھر کو کچھ سوچ کے وہ آہستہ آہستہ چکنے فرش پر پاؤں دھرتے ویٹنگ روم میں آ گئی۔ کھڑکیوں سے پردے ہٹاتے ہی مدھم پڑتی روشنی اور رات کی سیاہی کو راستہ مل گیا۔ شام سے واسطہ پڑا۔ تیسری منزل کی کھڑکی سے جھانکتی ہوئی پتلیاں سکڑ کے سوئی بن گئیں۔ بارہ تیرہ برس کے تین چار لڑکے کسی بات پہ کسی شے کے لیے گتھم گتھا تھے۔ یہاں بھی وہ سیاہ فام لڑکے جارحیت کرتے نظر آ گئے۔

"ان کالوں نے تو زندگی عذاب کر دی ہے۔ اب اس عمر میں یہ کوئی وقت ہے یوں باہر سڑکوں پہ گھومنے کا؟ دنگا فساد کرنے کا۔ ماں باپ کو اپنا ہوش کہاں بیٹھے ہوں گے کسی پب (pub) میں جام کے جام انڈھیلتے ہوئے۔ نہ پڑھائی نہ لکھائی کام کرنا نہیں۔ بس اسٹیٹ بینیفٹس (State-Benefits) پہ گزارا۔ سارا دن صرف باتیں کام نہ دھندا۔" اُس نے کھڑکیوں کے پردے برابر کر دیے۔

"اور جو کام کرتے ہیں وہ ہوٹلوں، ایئرپورٹس، ہسپتالوں، بڑے سینٹروں پہ چھوٹی چھوٹی نوکریاں کرتے نظر آئیں گے۔ صفائی ستھرائی (خاص کر فرشوں کی صفائی)، بیرا گری، چوکیداری، باربری۔ جب پڑھیں گے نہیں تو اچھی نوکری کون دے گا۔ ہاتھ میں ہنر نہ ہو تو انسان کی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔" یہی خیالات نے حلق سمیت سارے وجود کو کڑوا کر رکھا تھا۔

"سڑک پہ یوں چلیں گے جیسے باپ کی ہو۔ کانوں میں مائکروفون ٹھونسے میوزک کی دھن پر تھرکتے، گھبراتے بلا کسی خوف و ڈر کے گاڑیوں کے بجتے ہارنوں سے بے پروا سڑک کراس کرتے ہوئے غلیظ گالیوں کے جواب میں ہاتھ ہلاتے ہوئے موبائل فون پہ گفتگو میں مست، شہری آداب سے ناواقف۔ پھر ان کے حقوق مارے جاتے ہیں۔ فرائض کوئی نہیں صرف فائدہ اور کچھ نہیں۔ لڑکوں کی ذمہ داریوں کا یہ حال کہ جہاں لڑکی حاملہ ہو گئی، بس بھاگ لیے۔ اب بطور سنگل پیرنٹ وہ جانے یا اسٹیٹ۔ لڑکیوں کی یہ کیفیت کہ کونسل کا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہیں کہ ہمارے بچوں کو پالیے بھی اور ہمیں رہائش کے لیے فلیٹ یا مکان بھی دے۔ گورے بھی اس کام میں پیچھے نہیں۔ جانے یہ نوجوان نسل تیس برس بعد کیسی ہو گی۔" سر جھٹکتے ہوئے وہ منفی سوچوں کو ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کام میں جت گئی۔ کام کرتے کرتے وہ ایک قدِ آدم آئینے کے مقابل آ گئی۔

"گھونگریالے بال، دلکشی سے عاری سیاہ چہرہ، موٹی موٹی سیاہ آنکھیں جیسے نشے سے بوجھل ہوں، سرخ موٹے اور بھدے ہونٹ، میانہ قامت، موٹاپے کی طرف مائل، گیزری وردی میں لپٹا ادھیڑ عمر جسم، موٹی موٹی سیاہ انگلیوں میں دبا صفائی کا پوچا جس سے پانی کے قطرے ٹپکتے ہوئے فرش پہ پھیل رہے تھے۔" تلخ مسکراہٹ موٹے ہونٹوں پہ لرز کے معدوم ہو گئی۔ "چل کالو! جلدی سے کام ختم کر لے ورنہ کل کی طرح سفید فام سپروائزر سے پھر وارننگ مل سکتی ہے۔" اُس کے ہاتھوں میں تھاما پوچا چکنے ہوئے فرش پہ تیزی سے پھسلنے لگا۔

اقبال کا فلسفۂ تقدیر

ع: تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

ڈاکٹر سید تقی عابدی

علامہ اقبال نے فرمایا:

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

جبر و قدر کا مسئلہ جسے مسئلہ تقدیر بھی کہتے ہیں بہت پرانا پیچیدہ اور مشکل مسئلہ ہے جس پر ہر زمانے میں ہر مکتبِ خیال کے لوگوں نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ دانشوروں فلاسفروں حکیموں اور صاحبِ نظروں نے گہری باتیں کیں لیکن اس مسئلہ کی گتھیاں سلجھنے کے بجائے الجھتی گئی اور صدیوں کے گزرنے کے بعد بھی گفتگو جوں کی توں رہی۔ علمائے اسلام میں دو انتہا پسند گروہ نظر آتے ہیں جو اسلام کے کسی خاص فرقہ سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ دوسرے اسلامی فلسفوں کی طرح ان افراد کا تعلق بھی تمام فرقوں سے ہے۔ ایک گروہ انسان کو مکمل مختار جانتا ہے جس کو قدری کہتے ہیں دوسرا گروہ انسان کو مکمل مجبور جانتا ہے جس کو جبری کہتے ہیں۔ علامہ اقبال وہ عظیم مفکر اور فلسوف اسلامی ہیں جنہوں نے اس مسئلہ پر بڑے غور و فکر اور سنجیدگی سے مطالعہ کرکے اعتدال اور میانہ روی کی راہ اختیار کی جو قرآن حدیث عقل اور منطق کے ساتھ ہے۔

گلشن راز کے خالق محمود شبستری جو آٹھویں صدی ہجری کے عظیم شاعر اور فلاسفر تھے جن کی مثنوی سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے نئی مثنوی گلشن راز جدید لکھی جبری تھے یعنی انسان کو مجبور محض جانتے تھے چنانچہ کہتے ہیں جو کوئی جبری عقیدہ کا قائل نہیں وہ گمراہ اور کافر ہے

ہر آں کس را کہ مذہب غیر جبر است
نبیؐ فرمود کاں مانند گبر است

لیکن علامہ اقبال نے گلشن راز جدید میں فرمایا کہ سلطان جنگ بدر حضور اکرمؐ نے فرمایا صاحب ایمان یعنی مومن مختاری اور مجبوری کے درمیان ہے

چنین فرمودہ سلطان بدر است
کہ ایماں درمیان جبر و قدر است

یعنی تقدیر نہ جبر ہے نہ اختیار کامل بلکہ ایک حالت ہے ان دونوں حدوں کے درمیان۔ اقبال کہتے ہیں کہ ہم جبر کے قائل ہو کر تقدیر کا لکھا سمجھ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ جائیں اور سب کچھ قسمت یا مشیت پر چھوڑ دیں یہ خود فریبی ہے اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ فرماتے ہیں:

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

علامہ مشروط طور پر تقدیر کو اور اس کے تحت جبر کو بھی مانتے ہیں۔ ایسے جبر کو وہ محمود کہتے ہیں جس میں مقاصدِ عالیہ کے لئے تڑپ اتنی شدت اختیار کر جائے کہ محسوس کرنے والا علت و معلول کے سلسلہ کو بالکل نظر انداز کر کے ظاہری نتیجہ سے آزاد ہو جائے۔ علامہ جس جبر کو معتبر مانتے ہیں اس میں سب کچھ مشیت پر چھوڑ دیا جاتا ہے جو ایمان کے خلاف ہے۔ علامہ ایمان کو یقین زندہ سے تعبیر کرتے ہیں جو فکر و کوشش کے تجربات اور قلبی واردات کی پیداوار ہے چنانچہ اسی قوت سے مجبوری مختاری میں بدل جاتی ہے۔ انہی مطالب کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے:

چیست بردن چہ کوں است و چہ کوں نیست
کہ تقدیر از نہاد او برون نیست

تو بہ مخلوق را مجبور گوئی - اسیر بند نزد و دور گوئی
جبر او حدیثی درمیاں نیست - کہ جاں بے فطرت آزاد جاں نیست
شی خوں بر جہان کیف و کم زد - زمجبوری بہ مختاری قدم زد

تقدیر کے لغوی معنی اندازہ کرنا، اندازہ مقرر کرنا اور آئین فطرت کا اظہار ہونا وغیرہ ہے۔ تقدیر کے اصطلاحی معنی ہمارے معاشرے میں جو متعول ہیں یعنی جملہ افعال اور اعمال انسانی کا پہلے سے متعین ہونا ہے۔ قرآن مجید میں تقدیر کا لفظ پانچ مقامات پر آیا ہے لیکن کسی بھی مقام پر ان اصطلاحی معنوں میں نہیں جو ہمارے معاشرے میں متعول ہیں۔ اسی لئے علامہ نے فرمایا کہ میں نے تقدیر کے رخ سے پردہ اٹھایا ہے اور اس کی حقیقت بتانے کی کوشش کی ہے کیونکہ زمین والے اپنی خودی کی دولت لٹا چکے تھے اسی لئے وہ نکتۂ تقدیر پہچان نہ سکے۔ میرے لفظوں میں اک لازوال راز چھپا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اگر تو بدل جائے تو تیری تقدیر بھی بدل سکتی ہے۔

ارضیاں نقد خودی را باختند - نکتۂ تقدیر را نشناختند
رمز باریکش بہ حرفی مضمر است - تو اگر دیگر شوی او دیگر است

علامہ اقبال نے مسلمانوں کی پستی اور زوال کی سب سے بڑی وجہ "ذوقِ عمل" سے محرومی بتائی ہے اور اس ذوقِ عمل کی محرومیت کے دو اسباب بتائے ہیں۔ ایک وحدت الوجود کا عقیدہ اور دوسرے تقدیر کا غلط مفہوم۔ تقدیر کے مسئلہ کے ذیل میں ہم پہلے ذوقِ عمل پر گفتگو کریں گے جو در حقیقت جدت فکر و عمل کی جان ہے اور جسے علامہ نے زندگی کے انقلاب کا سرچشمہ قرار دیا ہے

جدت فکر و عمل کیا شے ہے ذوقِ انقلاب

عدوت فکر و عمل کیا شے ہے ملت کا شباب

عدوت فکر و عمل سے معجزات زندگی
عدوت فکر و عمل سے سنگ خارا لعل ناب

اور یہی ذوق عمل انسانی زندگی کی محبت کی حرارت اور تمنا کی نمود ہے جو زندہ قوموں کی بقا اور ارتقا کا ضامن ہے:

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

علامہ کہتے ہیں کہ تقدیر کی غلط فہمی کی وجہ سے قوم کو خصوصاً نسل جدید کو جبریت کا غلط عقیدہ دکھایا جا رہا ہے کہ تمام شعوری واردات کا مبدا غیر شعوری نفس ہے ہم نہیں جانتے ہمارے غیر شعوری نفس کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس لئے اس پر ہمارا تصرف نہیں اور جب ہمارا تصرف نہیں تو ہم اس سے سرزد ہونے والے اعمال کے ذمہ دار نہیں۔ چنانچہ اس افسون نے نئی نسل اور عوام کی قوت عمل کو مفلوج کر دیا ہے:

صوفی کی طریقت میں فقط مستی احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستی گفتار

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار

وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار

علامہ اس پیچیدہ فلسفۂ تقدیر کے بارے میں اپنے پیر مولانا روم سے سوال کرتے ہیں:

اے شریک مستی خاصان بدر - میں نہیں سمجھا حدیث جبر و قدر

مولانا روم فرماتے ہیں:

بال بازاں را سوئے سلطاں برد - بال زاغاں را بگورستاں برد

یعنی قدرت نے عقاب اور گدھ دونوں کو طاقت و شہپر دیئے وہ ان کو جیسے چاہے استعمال کریں۔ عقاب اپنی لیاقت محنت اور کوشش سے اڑ کر بادشاہ کے ہاتھ پر بیٹھا تو دوسری طرف گدھ اپنی جہالت کاہلی اور سستی کی وجہ مردار کی تلاش میں قبرستان کا رخ کیا۔ اسی لئے تو علامہ نے فرمایا۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

ابھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

علامہ نے مسئلہ تقدیر یا فلسفۂ جبر و قدر پر بہت کچھ لکھا ہے جو جیدہ جیدہ جا بجا مثنوی اسرار خودی، ضرب کلیم، پیام مشرق اور گلشن راز جدید میں بکھرا ہوا ہے۔ علامہ نے مسئلہ تقدیر کو دوسرے اپنے فلسفوں کی طرح کسی ایک مثنوی یا کتاب میں ترتیب وار نظم نہیں کیا جس کی وجہ سے تمام مطالب سمجھنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اسی لئے بعض لوگ علامہ کو انتہا پسند "قدری" کہنے لگے یعنی اقبال ہر چیز کو انسان کے اختیار میں سمجھتے ہیں جو صحیح نہیں۔ علامہ کا موقف قرآنی موقف ہے جہاں خدا نے انسان کو آزادی دے رکھی ہے چاہے نیکی کرے چاہے بدی کرے اور قرآنی آیات کے مطابق "انسان سعی اور کوشش کا نام ہے" جو کوئی ذرہ برابر بدی کرے گا اُسے اس کی سزا ملے گی۔ لیکن روشن قرآنی آیات کی موجودگی میں انسان کے جملہ اعمال اور افعال کا تقدیر کو ذمہ دار ٹھہرانا قرین عقل ہے اور نہ قرین عدل اور انصاف۔ علامہ کہتے ہیں۔ اگر قرآنی آیت "اور تم کچھ چاہ بھی نہیں سکتے جب تک خدا نہ چاہے" کا مطلب یہ لیا جائے کہ انسان ہر کام کے کرنے میں مجبور ہے تو پھر جزا اور سزا کے کیا معنی ہیں۔ یقیناً خدا نے خود کو قادر مطلق کہا ہے خود کو خیر و شر کا خالق کہا ہے اس کی مرضی کے بغیر نہ خارجی دنیا میں کوئی عمل انجام ہو سکتا ہے اور نہ انسان سے کوئی فعل سرزد ہو سکتا ہے یہاں مگر انسان بعض امور میں مختار اور آزاد ہے اور بعض امور میں مجبور اور پابند ہے چنانچہ اس مسئلہ میں مجبور سمجھنا نادانی ہے اور ہر امور میں مختار سمجھنا دیوانگی ہے اور صحیح روش درمیانی ہے:

کہ ایماں درمیان جبر و قدر است

علامہ کہتے ہیں اسی تقدیر کی غلط فہمی نے ملت اسلامیہ کو عمل سے غافل کر دیا جس کا پیمانہ "شراب الست" تھی:

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست

گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

یہی نہیں بلکہ صحیح تعلیمات قرآنی نہ ہونے کی وجہ تقدیر کا بہانہ بنا کر طائفہ صوفی نے اپنے لئے نفس کو حلال اور آزادانہ کو حرام سمجھ رکھا ہے

اسی قرآں میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اسی تقدیر کے فلسفہ کو بہت کم افراد نے سمجھا ہے:

پابندیٔ تقدیر کہ پابندیٔ احکام
یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مردِ خردمند

اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خرسند

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

چونکہ احکامِ الٰہی کی پابندی کا بہترین نمونہ حضور اکرمؐ کی ذات مقدس ہے اس لئے پیروی سنت حضور اکرمؐ ہی تقدیر اور کامیابی کی طرح راہ ہونا چاہئے:

کشودم پردہ از روی تقدیر - مشو نومید و راہ مصطفیٰؐ گیر

میں نے تقدیر کو بے نقاب کیا ہے نا امید نہ ہو اور راہ حضور اکرمؐ پر گامزن رہو اور اسی پر ہر روز تقدیر اور قسمت کا کھیل رہے گا۔ اگر ایک تقدیر کے عمل سے رنج ہو تو خدا سے عزم و عمل کی توفیق مانگ تا کہ دوسری تقدیر تجھے خوشی دے سکے۔

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر - خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دگر

مایوس مت ہو کیوں کہ تو جدید سرنوشت اور تقدیر و قسمت مانگ سکتا ہے کیوں کہ خدا کے حضور میں لاتعداد تقدیریں ہیں جو بدل سکتی ہیں:

تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست
زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہاست

انسان زمین پر خلیفہ بن کر آیا ہے اور حضور اکرمؐ رحمت کی انتہا ہیں جن کے فیض سے تقدیر کل حاصل ہو سکتی ہے:

حرف لی جاعل تقدیرِ او - از زمیں تا آسماں تفسیرِ او
خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست - رحمت للعالمینی انتہاست
نسخۂ او نسخۂ تفسیرِ کل - بستۂ تدبیرِ او تقدیرِ کل

کاش انسان تقدیر کو سمجھتا اس نے تقدیر کے حق کو اچھی طرح نہیں سمجھا اور نہ خودی اور نہ خدا کے جلوہ کو محسوس کیا:

معنیٔ تقدیر کم فہمید وای - نے خودی دانست نے خدا دید وای

مرد مومن خدا سے دعا کرتا ہے کہ میں تیرے ساتھ ہوں تو بھی میرے ساتھ رہ۔

مرد مومن با خدا دارد نیاز - با تو ما سازیم و تو با ما بساز

مرد مومن کا ارادہ ہی تقدیر کو بدل سکتا ہے اور نئی تقدیر حاصل کر سکتا ہے اور وہ اپنی خودی کو مستحکم اور بلند و عالی کر سکے گا۔ عزم او خلاق تقدیرِ حق است اور پھر تو جب ہو گا۔ ع = خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

جہاں تک عقیدہ وحدت الوجود کا تعلق ہے اس کا گہرا اثر مسئلہ تقدیر پر ہے۔ علامہ فلسفہ وحدت الوجود جسے فلسفہ ہمہ اوست بھی کہتے ہیں مسلمانوں کی پستی اور گمراہی کا باعث جانتے ہیں۔ یہ فلسفہ اتنا وسیع اور وقت طلب ہے کہ اس مختصری تحریر میں صرف اس کے چند گوشوں پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ یہ فلسفہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی سے منسوب کیا جاتا ہے جو تقریباً ساڑھے آٹھ سو سال قبل اسپین میں پیدا ہوئے اور پھر دمشق میں قیام پذیر ہو گئے۔ ابن عربی کی دو تصنیفات "فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم" مشہور ہیں۔ ابن عربی کے متعلق علمائے اسلام کی رائے میں اختلاف ہے بعض انہیں ملحد اور کافر اور بعض انہیں ولی کامل سمجھتے ہیں۔ ابن عربی کہتے ہیں "ازل کے دن جب خدا کے سوا کوئی موجود نہ تھا تو خدا نے کن فیکون کسی اور سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے کہا تھا کیوں کہ اگر عدم بھی ہوتا تو اس کا وجود ہوتا اور اس وقت خدا کے سوا کچھ موجود نہیں تھا اور خدا نے کن کہہ کر مخلوق کے اندر خود کو جلوہ گر کر دیا یعنی ہم مخلوق خدا ہی سے ظہور میں آئے ہیں اور خدا ہی میں جذب ہو جائیں گے۔ علامہ واجب الشہود یا فلسفہ ہمہ از اوست کے طرفدار ہیں یعنی خدا اپنے مقام پر اور مخلوق خدا کی تخلیق کی ہوئی اپنے مقام پر جداگانہ ہے۔ علامہ ابن عربی کی عظمت کے قائل ضرور ہیں لیکن ان کے فلسفہ کو قبول نہیں کرتے چنانچہ ابن عربی کی تصنیف فصوص الحکم کے رد میں کتاب لکھنے کا ارادہ سراج الدین پال کے خط میں ظاہر کرتے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں توحید کا مفہوم مذہبی ہے وحدت الوجود کا مفہوم فلسفیانہ ہے توحید کی ضد شرک ہے اور وحدت کی ضد کثرت نہیں جسے صوفیا کہتے ہیں۔ علامہ نے تقدیر کے مسئلہ کی طرح اس میں بھی اعتدال کا لحاظ رکھا۔ وہ حالت سکر نہیں بلکہ حالت صحو کو اسلام سمجھتے ہیں۔ اسی لئے تو فرمایا حضورؐ کے مکتب میں کوئی حافظ شیرازی نہیں تھا۔ حافظ کے تصوف پر گہری تنقید کے اشعار جو اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن کے دیباچہ میں لکھے گئے آج بھی خوبیاں ہیں۔

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار - جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
آں فقیہِ ملتِ مے خوارگاں - آں امامِ امتِ بے چارگاں
محفلِ او درخورِ ابرار نیست - ساغرِ او قابلِ احرار نیست
بے نیاز از محفلِ حافظ گذر - الحذر از گوسفنداں الحذر

ایسی محفلیں علامہ کی نظر میں بے چارگی اور گوسفندی سکھاتی ہیں۔ قسمت کے یقین کی افیون پلاتی ہیں اور انسان کو مجبور اور اسیر بنا دیتی ہے۔ علامہ اس زنجیر کو عزم و عمل سے توڑنے کے قائل تھے اور یہی ان کا فلسفہ تقدیر بھی ہے:

اے وسعت جہاں میں بنتی ہیں انساں کے عمل سے تقدیریں
اک عزم و یقیں کا ہاتھ بڑھا اور ٹوٹ گئیں سب زنجیریں

انسان کا انسان، تماشے کا تماشا

ملک زادہ جاوید (نوئیڈا بھارت)

بلا کے ذہین، اپنا اشتہار خود، حال کی فکر، ماضی سے بے تعلق، مستقبل پر نظر، پڑھے لکھے مشہور لوگوں سے خائف، نسل سے مطمئن، شہرت کی ہوس میں بگٹو کو خدا کا نور سمجھ کر سجدہ کرنے کی عادت، مسلمانوں پر تنقید، غیر مسلم حضرات کی عظمتوں کے معترف، مداح، ناراض لوگوں کو منانے کے فن سے واقف، ناراض کرنے کے ہنر سے آشنا، مبالغہ آرائی، احسانات کو بھول جانا، اگر ان تمام باتوں کو کسی ایک جگہ مرتب کیا جائے تو اردو کے ممتاز شاعر ڈاکٹر بشیر بدر کا نام ذہن میں گونجنے لگتا ہے۔

راقم الحروف کا عرصہ دراز سے ایک تعلق ڈاکٹر بشیر بدر سے ہے اسی تعلق کے مدنظر ان کی شخصیت، جس میں اچھائیوں کے ساتھ ساتھ بے پناہ خامیاں ہیں، سے متعلق چند واقعات قلم بند کر رہا ہوں۔

بشیر بدر کا وطن کہاں ہے یہ بات ایک معمہ ہے، وہ اپنا وطن کبھی سیتاپور کو کہتے ہیں اور کبھی فیض آباد شہر کو بتاتے ہیں۔ ابھی حال میں بلیا میں ایک کوی سمیلن مشاعرہ ہوا، جس میں بشیر بدر کے ساتھ میں بھی شریک ہوں اس کوی سمیلن میں جب بشیر بدر مائک پر آئے انہوں نے اپنے آپ کو ایودھیا کا رہنے والا بتایا اور کہا کہ ہم رام کی سرزمین کے ہیں اور ان کی زندگی رام کی امانت ہے کیونکہ ایک بار جب وہ شدید بیمار ہوئے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ اس وقت ان کی والدہ کی ایک سہیلی جو کہ ہندو تھیں وہ آئیں اور ان کی والدہ سے کہا کہ اگر بچے کو سیتا کی رسوئی کی راکھ دی جائے تو بچ جائے گا چنانچہ ان کی والدہ نے یہ کام انجام دیا اور بچ گئے۔ بلیا کے اس کوی سمیلن اور مشاعرے میں اکثریت غیر مسلم حضرات کی تھی چنانچہ اس واقعے سے غیر مسلم حضرات کے دلوں اور کوی سمیلن کو لوٹ لیا۔ انہوں نے دو منٹ تک کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں۔ دوسرے دن بلیا اور آس پاس سے نکلنے والے تمام اخبارات بشیر بدر کے کلام اور شخصیت کی عظمتوں سے رنگے ہوئے تھے۔ واپسی میں جب میں نے بشیر بدر سے دریافت کیا کہ ڈاکٹر صاحب آپ تو ایودھیا کے رہنے والے نہیں ہیں پھر آپ نے خود کو ایودھیا کا کیوں کہا تو بشیر صاحب نے فرمایا کہ ہندوستان میں صرف ذہین لوگوں کو رہنے کا حق ہے اور میں ایک ذہین آدمی ہوں! مشاعروں کے ایک ترنم باز شاعر جن کا تعلق دیوبند سے ہے انہوں نے بشیر بدر کے انڈر (Under) میں پی ایچ ڈی (Ph.D) کے بارے میں ڈاکٹر بشیر بدر کا ایک واقعہ سنایا جب وہ ایکسپرٹ (Expert) کے ساتھ دیوبندی کا وائے وا (Viva) لینے کے لئے میرٹھ کالج میں اپنے کمرے میں بیٹھے تھے تبھی وہ داخل ہوئے۔ بشیر بدر نے ان سے کہا کہ سلام کرو، دیوبندی نے سلام کیا۔ دیوبندی سے بشیر بدر نے کہا کہ ایک اور سلام ایکسپرٹ صاحب (Expert) کو کرو۔ وہ گھبرائے۔ بشیر بدر نے ان سے کہا کہ پہلا سلام تو کمرے میں داخل ہونے کے لیے تھا۔ یہ دوسرا سلام انہیں Ph.D ملنے کے لیے ہے جلدی سلام کرو۔ دیوبندی نے ڈرتے ڈرتے سلام کیا اور کہا کہ آپ لوگوں نے تو مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس پر بشیر بدر نے انہیں ڈانٹا اور کہا کہ اگر ہم لوگوں نے تم سے سوال کیا تو تم کیا سمجھتے ہو تمہارے جیسے جاہل کو Ph.D مل جائے گی۔

پچھلے سال حکومت ہند نے انہیں پدم شری سے نوازا ہے۔ پدم شری کا اعزاز صدر جمہوریہ ہند سے ایک تقریب کے دوران ملتا ہے جس میں صدر جمہوریہ اپنے ہاتھوں سے اس خطاب کو دیتے ہیں۔ اس تقریب کے دوران بشیر بدر پاکستان میں تھے۔ اتفاق سے ممتاز فلمی شاعر جاوید اختر بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے بشیر بدر سے کہا کہ آپ پدم شری لینے کے لیے چل رہے ہیں۔ (جاوید اختر کو بھی اسی سال پدم شری کا اعزاز حاصل ہوا تھا) بشیر بدر نے جاوید اختر سے کہا کہ پدم شری کا اعلان ہو جانا بڑی بات ہوتی ہے لینے چھوٹے لوگ جاتے ہیں۔ چنانچہ بشیر بدر پدم شری لینے کے لیے پاکستان سے ہندوستان نہیں آئے اور پاکستان کی ایک تقریب میں کہا کہ میں پاکستان سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ حکومت ہند نے جو اعزاز مجھے دیا ہے وہ لینے کے لیے نہیں جا رہا ہوں۔

واپسی پر جب ڈاکٹر صاحب پاکستان سے ہندوستان آئے تو تمام واقعات انہوں نے مجھے بتائے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ آجاتے تو بہتر ہوتا کیونکہ اس تقریب کو دوردرشن نے اور مختلف ٹی وی چینل نے کئی کئی بار دکھایا تو بشیر بدر نے فرمایا کہ میری نظر نشان پاکستان پر تھی۔ پاکستان کا ایک اہم اعزاز ہے جو پہلے دلیپ کمار کو مل چکا ہے۔ پاکستان کی حکومت اور عوام کے لیے میرے تعلق سے اس بات کی (اہمیت) Importance تھی کہ بھارت کا ایک شاعر پاکستان سے اتنی محبت کرتا ہے کہ حکومت ہند کے اعزاز کو لینے بھارت نہیں جا رہا ہے۔

ڈاکٹر رضیہ بشیر بدر کی سالی ہیں نوئیڈا میں رہتی ہیں۔ اردو کا ایک معیاری رسالہ "فکر و آگہی" نکالتی ہیں۔ بشیر بدر کی دوسری شادی انہوں نے ہی اپنی بہن سے کروائی ہے۔

انہوں نے ایک خصوصی شمارہ فکر و آگہی بشیر بدر کے نام سے ماتی

میں ڈالا تھا جس کے نکلنے کے بعد فکروآگہی کا جب دوسرا شمارہ رضیہ آپا نے نکالنا چاہا تو بشیر بدر نے کہا میرا نمبر تو نکل چکا ہے اب اس رسالے کو نکالنے سے کیا فائدہ۔ رضیہ آپا کے بارے میں بشیر بدر کا ایک خط جو کہ میرے نام ہے دیکھیں۔

بردوام۔

خط ملا۔ اللہ نے ادھر بہت سی خوشیاں دی ہیں۔ آپ کی والدہ (میری بھابھی) نے میری بیگم کی گود بھری تھی۔ اللہ نے کرم کیا۔ طیب میاں بڑے شاندار ہیں۔ آپ سے دوری یوں ہوگئی کہ میں نوئیڈا نہیں آنا چاہتا۔ محترمہ رضیہ حامد دنیا کی سب سے بڑی منافق ہیں۔ ایک دن میری بیوی کو گلے لگایا تھا۔ بختوں ان کے بدن سے منافقت کی باس آتی رہی۔ میری ساس صاحبہ ان کی وجہ سے مجھ سے بدظن ہیں۔ اللہ کا شکر ہے بہرحال آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔

دعا گو بشیر بدر

آگرہ کے ایک مشاعرہ کے دوران انہیں معلوم ہوا کہ ان کی والدہ کا انتقال حج کے دوران ہو گیا ہے۔ یہ خبر ان کے چھوٹے بھائی منظر صاحب نے انہیں دی۔ میں بھی مشاعرے میں مدعو تھا مگر یہ بدستور مشاعرے کی نظامت کرتے رہے اور سامعین حضرات کو اپنی کئی منتخب غزلوں سے انہوں نے نوازا بھی۔ ایک بار ہم لوگ سہارنپور کے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے میرٹھ سے گزر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کی بیٹی یہاں ہے پہلے اس کے گھر چلا جائے۔ پچھلی بار جب میں میرٹھ آیا تھا تو صبا مجھے ملی تھی اور کہہ رہی تھی کہ پاپا سے ملاقات ہوگئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی بیٹی کے گھر جانے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ اس کے گھر جائیں گے تو انہیں کم سے کم ایک لفافہ لے جانا پڑے گی۔ رشتوں سے ڈاکٹر بشیر بدر بے نیاز ہیں' وہ صرف اپنے لیے زندہ ہیں۔ بھائی' بہن' ماں' باپ' بچے' بیوی اور دوست وغیرہ ان کے نزدیک غیر ضروری اشخاص ہیں۔

پنجے مارنا ڈاکٹر صاحب کی عادت ہے کہیں انہوں نے کہہ دیا کہ انور جلال پوری ایک غیر معیاری ناظم مشاعرہ ہیں۔ ایسے محفلوں کا ہی مشاعرہ کنڈکٹ conduct کر سکتے ہیں۔ یہ خبر جب انور جلال پوری کو لگی تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ اس زمانے میں میں لکھنو میں ہی تھا اور ہم کولا گنج میں یونیورسٹی فلیٹس میں رہتے تھے۔ انور بھائی آئے گفتگو کا رخ بشیر بدر کی طرف مڑ گیا۔ انور بھائی نے کہا کہ جاوید میں عنقریب بشیر بدر کو درست کرنے والا ہوں۔ انہوں نے میرے بارے میں غلط بیانی کی ہے۔ میں نے کہا آپ بھی کوئی مضمون تحریر کریں جس میں بشیر بدر کو کم تر درجے کا شاعر ثابت کریں۔ ادبی معرکہ آرائیاں تو ہر دور میں ہوئی ہیں مگر جسمانی طور پر انہیں کوئی سزا دینا آپ جیسے پڑھے لکھے انسان کے لیے مناسب نہیں ہے۔ آپ ایک ادیب اور شاعر ہیں۔ انور جلال پوری غصے میں بولے شاعر ادیب پڑھا لکھا بعد میں ہوں' سب سے پہلے میں جلال پوری ہوں' سالے کو ٹھیک کردوں گا۔ حالات سنگین تھے۔ میں نے بشیر بدر کو خط لکھا کہ محترم آپ انور صاحب سے اپنے معاملات ٹھیک کرلیں ورنہ آپ کی صحت کے لیے خطرہ ہے' چند دنوں کے بعد انور جلال پوری نے کسی مشاعرے میں مجھے بتایا کہ بشیر بدر نے انہیں کئی صفحات پر مشتمل خط لکھا ہے جس میں ان کی عظمتوں کا اعتراف کیا گیا ہے۔

وسیم بریلوی سے بشیر بدر کا چھتیس کا آنکڑا ہے۔ ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ نوئیڈا میں' میں نے ایک مشاعرہ کیا جس میں کوئی فلم پروڈیوسر کے علاوہ کچھ فلمی ستارے بھی شعرا کے ساتھ موجود تھے۔ میری خواہش تھی کہ وسیم صاحب بھی اس مشاعرے میں شریک ہوں۔ انہیں میں نے فون کیا۔ نوئیڈا کے مشاعرے کی تاریخ بتا کر میں نے Paymentزادِراہ کی رقم جو بہت مناسب تھی بتائی۔ انہوں نے زادِراہ کم ہونے کی شکایت کی اور کوئی جواب دیا۔ بہرحال میں نے مشاعرہ کمیٹی سے ایک ہزار کی اور رقم کا اضافہ حضرت (Payment) میں کروادیا۔ بریلی وسیم صاحب کے گھر فون کیا۔ وسیم صاحب کی بیگم سے میں نے کہا آپ انہیں یہ خبر دے دیں کہ ان کو ضرور آنا ہے۔ بیگم وسیم بریلوی نے فون پر کہا کہ آپ لوگ وسیم صاحب کو بہت کم حضرت دے رہے ہیں جب کہ ان کو دلی مشاعرے میں کافی حضرت ملتا ہے۔ وہ آپ کے مشاعرے میں شاید ہی شریک ہوں۔ چنانچہ میں وسیم صاحب کی طرف سے مایوس ہو گیا مگر مشاعرے سے ایک دن قبل ان کا فون آ گیا کہ میں آ رہا ہوں۔ آپ اسٹیشن پر گاڑی بھیج دیں۔ ان کو لینے کے لیے گاڑی بھیجی گئی مگر ان کی ٹرین کئی گھنٹے لیٹ تھی۔ ڈرائیور چلا آیا' دوبارہ گاڑی نہ جا سکی۔ نوجوان شاعر طاہر فراز نے آ کر خبر دی کہ وسیم صاحب اسٹیشن پر گاڑی نہ پہنچنے سے ناراض ہو کر اپنے ایک دوست کے یہاں چلے گئے ہیں۔ فون نمبر دیا ہے۔ آپ فون کرلیں جب یہ خبر بشیر بدر کو معلوم ہوئی' دوسرے مشاعرے میں صبح کو ہی نوئیڈا آ گئے تھے تو وہ خوش ہوئے۔ مجھ سے کہا کہ اتنے بڑے مشاعرے میں پہلے تو اتنے چھوٹے شاعر کو آپ کو مدعو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر آپ نے مدعو کرلیا تو انہیں گاڑی نہیں بھیجنی چاہیے تھی۔ آپ فون نہیں کریں گے۔ انہیں خود آنا ہو تو آئیں۔ میں بھی انتظامی معاملات میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ وسیم صاحب کو فون نہ کر سکا اور وسیم صاحب بغیر مشاعرہ پڑھے بریلی واپس چلے گئے۔

اپنے سامنے دیگر شعرا کی تعریف انہیں گوارا نہیں ہے۔ بلند شہر

کے ایک مشاعرے میں جاوید اختر کے کمرے میں ہم لوگ موجود تھے گفتگو اردو شاعری پر ہو رہی تھی۔ جاوید اختر نے ایک شعر عرفان صدیقی کا سنا کر اس کی تعریف کی۔ بشیر بدر خاموش رہے۔ جاوید اختر نے ایک دوسرا شعر عرفان صدیقی کا سنا کر اس کی تعریف کی جس پر بشیر بدر آپے سے باہر ہو گئے اور عرفان صدیقی کے ایک معمولی شاعر ہونے کی دلیل میں انہوں نے کئی مثالیں پیش کر دیں۔

وہ صرف شاعری میں اپنا حریف غالب و میر کو مانتے ہیں جس کا اظہار وہ کئی جگہوں پر تحریری اور زبانی طور پر کر چکے ہیں۔ سنسنی خیز بیانات اپنے کو سیکولر ثابت کرنے کی جدوجہد میں سرگرم عمل (بر اور ان وطن کے سامنے) یہ سب کچھ ان کی بنیادی خصوصیات ہیں جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ سرخیوں میں رہتے ہیں مگر ان سب کے پیچھے ان کی بے پناہ محنت اور لگن سے کی گئی شاعری کا بھی دخل ہے جس کی وجہ سے لوگ ان کی باتوں پر توجہ دینے کے لیے مجبور ہیں۔ یہ بات تو ادب کے مشاہیر طے کریں گے کہ بشیر بدر کا اردو شاعری میں کیا مقام ہے مگر یہ بات سو فیصدی سچ ہے کہ عوامی سطح پر جتنی شہرت بشیر بدر کو آج نصیب ہے وہ موجودہ وقت میں کسی اور شاعر کو میسر نہیں ہے۔

"کوئی شاعر جب مشہور ہوتا یا مشاعرے میں مجھ سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے تو میرے اندر کا شیطان بیدار ہو جاتا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس کو قتل کر دوں اگر غالب یا میر زندہ ہوتے تو میں ان کو قتل کر کے کب کا جیل چلا گیا ہوتا۔"

مندرجہ بالا خیالات اردو کے ممتاز شاعر بدر کے ہیں۔ راقم الحروف سے انہوں نے اپنے اس خیال کا اظہار ایک مشاعرے کے دوران کیا تھا.... شمیم جے پوری مرحوم نے اردو شاعروں پر ایک زمانے تک راج کیا ہے کسی بات پر بشیر بدر اور شمیم جے پوری صاحب میں رنجش ہو گئی اور رنجش اتنی بڑھی کہ اگر ایک کو معلوم ہوتا کہ دوسرا بھی اس مشاعرے میں مدعو ہے جس میں وہ جا رہا ہے تو وہ اس مشاعرے میں شریک نہیں ہوتا یا وہ اپنے اثرات کی بدولت دوسرے شاعر کا فہرست سے کٹوا دیتا۔ یہلی بھیت کے کنوینر نے بڑی چالاکی سے ان دونوں حضرات کو مدعو کر لیا اور اس بات کو راز رکھا۔ دونوں اس مشاعرے میں پہنچ گئے۔ شعرا کے قیام کی جگہ پر جب بشیر بدر پہنچے تو انہیں سامنے ہی لیٹے ہوئے شمیم جے پوری نظر آئے۔ بس پھر کیا تھا بشیر بدر اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے شمیم صاحب کی جانب لپکے۔ شمیم صاحب کہاں پیچھے رہنے والے تھے وہ بھی چارپائی سے نیچے اتر کر بشیر بدر صاحب کی شان میں قصیدہ پڑھنے لگے۔ بات اتنی بڑھی کہ دونوں ایک دوسرے سے گتھ گئے۔ اسی دوران شوق بہرائچی نام کے ایک شاعر جو کہ شمیم صاحب کے ہمراہ مشاعرے میں گئے تھے دوڑتے ہوئے آئے اور بشیر بدر کو زیر کر دیا..... اس مشاعرے کے ناظم انور جلالپوری سے مرحوم شمیم جے پوری نے اس واقعے کے بعد کہا کہ اب میں نے اپنی زندگی کا یہ مشن بنا لیا ہے کہ بابری مسجد کو بتوں سے پاک کرنا ہے اور مشاعروں سے بشیر کو (اس وقت بابری مسجد شہید نہیں ہوئی تھی)

نوئیڈا میں مقیم ایک شاعر طفیل چترویدی ہندی رسم الخط میں "سب رنگ" نام کا ہر سال ایک رسالہ نکالتے ہیں۔ اتفاق سے بشیر بدر نوئیڈا میں اپنے ایک دوست روی کانت کے یہاں مقیم تھے۔ طفیل چترویدی کو جب معلوم ہوا تو بشیر بدر سے ملنے پہنچ گئے اور ڈاکٹر صاحب سے کلام کی درخواست کی۔ بشیر بدر معاوضے کے بغیر کلام دینے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ طفیل چترویدی کو یہ بات بری لگی۔ انہوں نے کوئی بات چبھتی ہوئی کہہ دی۔ ڈاکٹر بشیر بدر آپے سے باہر ہو گئے۔ معاملہ مارپیٹ پر جا کر ختم ہوا اور دونوں حضرات اپنی اپنی درخواستیں لے کر تھانے پہنچ گئے۔ تھانے سے بشیر بدر کا فون میرے پاس آیا کہ فوراً آئیے۔ میں تھانے پہنچا تو عجب ماجرا تھا۔ بشیر بدر تھانے کے منشی کو یہ سمجھا رہے تھے کہ وہ پدم شری کیا ہے اور اس کی عظمت کیا ہے اور اسے کون دیتا ہے سمجھا کر اپنے پدم شری ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ طفیل چترویدی اپنی درخواست لے کر اپنے کو ایک مہذب اور شریف انسان ہونے کی دلیل دے رہے تھے اور بشیر بدر کو پاگل ثابت کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ منشی بڑے غور سے ان لوگوں کی باتوں کو سن رہا تھا۔ میرے پہنچنے پر منشی سے میں نے اکیلے میں بات کی اور اسے یہ بتلایا کہ یہ دو شاعروں کا معاملہ ہے تھوڑی دیر میں ان حضرات میں دوستی ہو جائے گی چنانچہ تھانے کے منشی نے دونوں کی درخواستیں تفتیش کے بعد کارروائی کرنے کو کہہ کر تھانے سے انہیں رخصت کر دیا..... سورج رامپوری آل انڈیا ریڈیو میں ایک اہم عہدے پر ہیں۔ انہیں جب ان واقعات کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے فون کر کے کہا کہ آپ بشیر بدر کو لے کر آ جائیں میں طفیل کو بلا لیتا ہوں۔ ان دونوں حضرات میں دوستی کروا دی جائے۔ میں بشیر بدر کو لے کر جب وہاں پہنچا تو سورج بھائی کے کمرے میں طفیل صاحب بھی موجود ملے۔ بشیر بدر سے اس معاملے کو ختم کرنے کی درخواست کی گئی تو انہوں نے عجب شرط رکھی کہ پہلے طفیل چترویدی سو بار ایک کاغذ پر رام لکھیں اور نیچے دستخط کریں تب ہی صلح ہو گی کیونکہ بشیر بدر کو خواب میں بھگوان رام چندر جی کے درشن ہوئے ہیں اور بھگوان نے بشیر بدر کو یہ حکم دیا ہے کہ جب تک طفیل چترویدی سو بار رام نہ لکھیں معاملہ ختم مت کرنا۔ چنانچہ طفیل چترویدی نے یہ کام انجام دیا۔ ایک کاغذ پر "رام" لکھا نیچے دستخط کیے جب جا کر معاملات ختم ہوئے......

لدھیانہ میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں میں اور بشیر بدر دونوں ہی

مدعو تھے۔ اس مختصر سے شہر میں ہیرو سائیکل کی فیکٹری ہے جس کے مالک اوم پرکاش سنجال اردو غزل کے عاشقوں میں ہیں۔ وہ ہر سال ایک ڈائری شائع کرتے ہیں جس میں منتخب شعرا کے شعر ہر صفحے پر شائع ہوتے ہیں۔ اوم پرکاش سنجال سے عرصہ دراز سے بشیر بدر کے مراسم ہیں۔ اس مشاعرے میں شرکت کے لیے جب میں اور بشیر بدر لدھیانہ پہنچے تو بشیر بدر نے مجھ سے کہا کہ میں سنجال صاحب سے ملنے جا رہا ہوں آپ ہوٹل میں آرام کریں۔ میں نے بھی سنجال صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی جس پر بشیر بدر نے ٹال مٹول کیا۔ میں نے بشیر بدر کا کہنا مانا اور ہوٹل کے کمرے میں آرام کرتا رہا۔ شام کو جب موصوف لوٹے تو ان کے ہاتھ میں ایک بڑا سوٹ کیس تھا اور لب پر سنجال صاحب کی دریا دلی کے قصے۔ میں نے دریافت کیا کہ سوٹ کیس خالی ہے یا اس کے اندر بھی کچھ ہے.....

بشیر بدر نے سوٹ کیس کھول کر دکھایا جس میں تحفوں کی ایک اچھی خاصی تعداد تھی اور ایک پیکٹ میں اچھی خاصی رقم، میں نے بشیر بدر سے کہا کہ اُستاد اگر میں آپ کے ساتھ ہوتا تو کم سے کم کچھ نہ کچھ میرے ہاتھ بھی لگ جاتا۔ بشیر بدر مسکرائے اور مجھ سے بولے اپنا شکار خود کرو دنیا سنجال جیسے احمقوں سے بھری ہوئی ہے.... آگرہ میں بزم نجمی کے مشاعرے میں جس کی صدارت کے لیے مشہور شاعر اور فلمی دنیا کی معروف شخصیت جاوید اختر کو مدعو کیا گیا تھا ان کو دیکھنے اور سننے کے لیے سامعین میں بڑا جوش و خروش تھا۔ جاوید اختر مشہور فلمی اداکار راج ببر کے ہمراہ آئے۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ جاوید اختر کی شہرت اور مقبولیت کو دیکھ کر بشیر بدر اندر اندر جلتے رہے۔ جاوید اختر نے اسٹیج پر آ کر مائک پر کہا کہ صدارت کے لیے میرا نام تجویز کیا گیا ہے مگر شعرا حضرات میں ان لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جنھوں نے میرے والد محترم جاں نثار اختر صاحب کے ساتھ مشاعرے پڑھے ہیں اس لیے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں اُن لوگوں کی موجودگی میں صدارت کروں۔ میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کا نام صدارت کے لیے پیش کرتا ہوں۔ ان کی اس تجویز کی سامعین نے تالیاں بجا کر تائید کی۔ ملک زادہ صاحب کی صدارت نے جلتی پر تیل ڈالنے کا کام کیا اور بشیر بدر اپنا منہ بنائے ہوئے بیٹھے رہے۔ جاوید اختر اپنی کمر کی تکلیف کے سبب اسٹیج پر ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ ناظم مشاعرہ نے جب بشیر بدر سے کلام سنانے کی درخواست کی تو انہوں نے کلام سنانے سے قبل ایک تقریر کی جس کا مفہوم یہ تھا۔ چونکہ ان کے خسر کیفی اعظمی اپاہج ہیں اس لیے جاوید اختر نے کرسی اسٹیج پر منگوا کر ان کی تقلید کی جو مشاعرے کی تہذیبی روایت کے خلاف ہے۔ اپنی اس تقریر میں انہوں نے ترقی پسندوں پر بھی نکتہ چینی کی۔ ان کی یہ تقریر لوگوں کو ناگوار گزری جنھوں نے بڑے ذوق و شوق سے جاوید اختر کو مدعو کیا تھا۔ بشیر بدر کی تقریر جاوید اختر صبر و ضبط کے ساتھ سنتے رہے۔ مشاعرے کے صدر ملک زادہ منظور احمد نے اپنی ذہانت کا ثبوت فراہم کیا اور جاوید اختر کے خانوادے اور ان کی ادبی خدمات جن میں جاوید اختر کے دادا مضطر خیرآبادی، ان کے والد جاں نثار اختر، ان کے ماموں مجاز لکھنوی اور ان کی والدہ صفیہ اختر اور ان کے خسر کیفی اعظمی کی ادبی خدمات کے علاوہ جاوید اختر کے کلام پر روشنی ڈالی اور مشاعرے کو بگڑنے سے بچایا۔ جاوید اختر کے شریفانہ رویہ اور ملک زادہ صاحب کی تقریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ سامعین کی نگاہوں میں بشیر بدر کا بھرم باقی نہیں رہا.......

سلیم جعفری نے جب اپنا جشن مشاعرے کا آغاز "بیادِ فیض" کے عنوان سے کیا تو اس کی صدارت مشہور ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری نے کی۔ مشاعرے کے ناظم ملک زادہ منظور احمد نے جب بشیر بدر کو دعوت کلام دی تو صدر مشاعرہ علی سردار جعفری فطری مجبوری کے سبب دو ایک منٹ کے لیے مشاعرے سے جانے لگے تو بشیر بدر نے انھیں مخاطب کر کے نہایت غصے سے کہا کہ جعفری صاحب آپ میری غزل کے سینے کو کچلتے ہوئے جا رہے ہیں۔ بشیر بدر کے اس جملے کا شعرا اور سامعین نے بہت بُرا مانا......

بحرین کے مشاعرے میں بشیر بدر نے امیر البحر حنیف اخگر ملیح آبادی کے گھر کی شعری نشست میں جو رویہ اختیار کیا اور دیا گیا ہے جس طرح شعرا اور ان کے درمیان پیسے کے بٹوارے کو لے کر تُو تُو میں میں اور جھگڑا ہوا اس سے ہندوستان کے شعرا کا وقار مجروح ہوا... جدہ کے مشاعرے میں ساغر خیامی سے مذہبی امور پر تو تو میں میں اور حیدرآباد کے مشاعرے میں انھیں اس لیے پڑھنے نہیں دیا گیا کیونکہ مسلم پرسنل لا کے معاملے میں عوام بشیر بدر کے نظریات سے اختلاف تھا۔ کھاڑی ممالک کی بدولت دنیاوی شہرت کا جو محل بشیر بدر نے تیار کیا ہے اس کی دیواریں بہت کمزور ہیں۔ اسٹیج اور اداکاری کی شاعری کے بعد بشیر بدر کا دامن خالی ہو چکا ہے۔ وہ اپنے آپ کو دہرا رہے ہیں شاعروں کے سامعین سے داد حاصل کرنے کے لیے وہ ان کی سطح پر اتر کر شعر کہنے لگے ہیں جس میں گہرائی کا فقدان ہے۔ وقتی جذبات ابھار کر داد حاصل کرنا بشیر بدر کا پچھلے پندرہ بیس سالوں سے مقصد بن چکا ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے انھیں پدم شری سے صرف اس لیے نوازا ہے کہ وہ بی جے پی کے نظریات کے حصول کے فروغ کے لیے کافی دنوں سے سرگرم عمل ہیں، کبھی اسلام پر تنقید کر کے، کبھی رسم النحا کا معاملہ اٹھا کر، کبھی مجھے اور مدرسے پر نکتہ چینی کر کے اور کبھی مسلم پرسنل لا کے معاملے میں دخل دے کر۔ میں بشیر بدر سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ

شہرتوں کی زمیں پکائی ہے .... گرنے والا سنبھل نہیں سکتا

مردِ غوغا

ارشاد احمد صدیقی

گریز از صفِ ماہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

یقین نہیں آرہا کہ جوہر میر حجرۂ میر میں موجود نہیں۔ اس نے تو
غروب آفتاب کے اس پار اپنا حجرہ بنا لیا۔ جہاں سے وہ لوٹ کر نہیں آئے گا لیکن
اس کی یادیں آتی رہیں گی۔ لیکن ہماری یادیں تو آدھی صدی کو احاطہ کئے ہوئے
ہیں۔ میں تو اسے اس وقت سے پہچانتا ہوں جب وہ خوب زور والا نوجوان تھا۔
مہربان مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کا حصہ تھی۔ اس کے بکھرے ہوئے بال اور
باغی درخشاں آنکھیں اس کی پہچان تھیں۔ ان دنوں وہ "انجام" اخبار میں رات کو
ایڈیٹری کرتا تھا۔ اور منہ اندھیرے تک منڈی چوک میں دہ طوطی کی دکان پر
ناشتہ کرتا تھا۔ اور سارا دن سوتا تھا۔ اور جب اس کا ناول "رنج رائیگاں" چھپ کر
آیا تو اس نے ادبی دنیا کو چونکا دیا اور بہت سوں کو جلا دیا۔ ملک راحت علی خان
ایک منجھے ہوئے صحافی اور دانشور بھی ان دنوں "انجام" میں کام کرتے تھے
راحت نے کہا تھا "جوہر پیدائشی صحافی ہے جب وہ خبر اخبار میں لگاتا ہے تو اخبار
کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔" ان ہی دنوں قلندر مومند دن کو ایم اے انگلش کا
طالب علم اور رات کو "شہباز" اخبار کی ایڈیٹری کرتا تھا۔ جوہر کبھی کبھی قلندر کو
ستانے کے لئے اسے فون کرتا اور کہتا "ڈیلی ڈان کی سرخی دیکھی ہے؟" قلندر کہتا
"ہاں دیکھی ہے" تو جوہر کہتا "اب ذرا انجام کی سرخی بھی دیکھو۔" پھر دونوں
پرتفنن قہقہے لگاتے اور صحافتی technicalties پر بحث کرتے۔ قلندر
جوہر سے اپنا ایڈیٹوریل پڑھواتا پھر کہتا "اب ذرا "نوائے وقت" کا ایڈیٹوریل
بھی پڑھو۔" ایک رات جوہر نے قلندر کو فون پر کہا "میرا ایڈیٹوریل پڑھ کر فوراً
فون کرو۔ قلندر نے فون کیا تو فون پر چلا اٹھا "ظالم انسان یہ تو میں نے کل کے
پرچے کے لئے لکھ کر رکھا ہوا تھا۔"

ان دنوں سیاسی اور ادبی انجمنوں کی گرم بازاری تھی۔ ون یونٹ
بن چکا تھا اور خان عبدالغفار خان بدستور غیر مطمئن رہتے کرتے "ون یونٹ نہیں مانتے"
جلسے ہوتے۔ ایک طرف خان عبدالغفار خان تقریر کرتے۔ دوسری طرف خان
عبدالقیوم خان دھاڑتے۔ اخبار اس گرم بازاری سے خوب فائدہ اٹھاتے۔ ادھر
ادبی انجمنیں بھی سرگرم تھیں۔ احمد فراز، فارغ بخاری، محسن احسان، رضا ہمدانی اور
مرزا محمود سرحدی جیسے لوگ غزلیں اور نظمیں لکھتے یہ ماحول ہمارے لوح و قلم کو جلا
بخشتا۔ ایک دن مجھے فارغ بخاری صاحب نے انجمن ترقی اردو کے تنقیدی
اجلاس میں افسانہ پیش کرنے کو کہا۔ انجمن کے اجلاس میں چند Heavy
Weight ضیا جعفری صاحب، پروفیسر نذیر مرزا برلاس، فارغ بخاری، مرزا
محمود سرحدی، رضا ہمدانی باقاعدگی سے شرکت کرتے۔ ان محفلوں میں چند گدھ
بھی آتے تھے (جنہیں انگریزی زبان میں Vultures کہتے ہیں) میں نے
جوہر سے کہا افسانہ تنقید کے لئے پیش کر رہا ہوں اجلاس میں ضرور آنا وہاں چند
گدھ بھی ہوں گے۔ جوہر نے قہقہہ لگایا۔ "دیکھو گدھ بچے کھچے پر منہ مارتے
ہیں۔ چیتا اپنا شکار خود کرتا ہے۔ تم چیتے کی طرح آنا اور میں اپنے ساتھ شیر ببر کو
لے کر آؤں گا۔" اجلاس شروع ہونے ہی والا تھا کہ جوہر میر اور قلندر مومند
بے تکلفی سے کمرے میں داخل ہوئے۔ (یہاں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ قلندر مومند
چونکہ انگریزی ادبیات کا طالب علم تھا اس لئے سارے اس سے ادبی موشگافی
کرنے سے کتراتے تھے) افسانے کے اختتام پر قلندر مومند نے بحث کی تو اس
نے افسانے کی تاریخ کو روسی ادب، فرانسیسی ادب، انگریزی ادب اور امریکی
ادب کا تقابل کرنا شروع کیا اور چیخوف، بالزاک، جوائس اور ہیمنگوے کے
موازنے کئے تو ساری انجمن دم سادھے بیٹھی رہی۔ افسانے کی پذیرائی ہوئی۔
اجلاس کے اختتام پر ہم شہر کی سنسان سڑکوں پر بے مقصد گھومتے قہوے پیتے، پان
چباتے، پھبتیاں کستے۔ چاندو خانے والی شاعری کرتے۔ طرح مصرع پا کر گرہ پر
گرہ لگاتے۔ کبھی جوہر کی گرہ بندی کے منتظر رہتے۔ ان ہی دنوں میں نے وطن کو
خدا حافظ کہا اور جرمنی آ گیا۔ حسب معمول ول ولولہ تو گرم جوشی سے خط و کتابت
ہوتی رہی۔ پھر وقفے آنے لگے پھر وقفے طویل ہونے لگے۔ پھر کبھی کبھی پر جا
رکے پھر سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں دھیرے دھیرے ان کے دلوں سے محو ہو گیا۔ وہ
دھیرے دھیرے میرے خیالوں میں دھندلے ہو گئے۔ لوح و قلم سے میرا رشتہ
کٹ گیا۔

آنکھ سے دور نہ ہو دل سے اتر جائے گا

حصولِ نانِ جویں نے مجھے ملک ملک سرگرداں رکھا۔ یورپ، مڈل ایسٹ، افریقہ
اور بالآخر امریکہ۔ فلوریڈا میں گھر بنایا۔ یہ میری پہلی ریٹائرمنٹ تھی جب پیچھے مڑ
کر دیکھا تو لگ بھگ ۳۳ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اور اس سارے عرصہ میری
انگلیاں لوح و قلم سے نا آشنا رہیں۔ ریٹائرمنٹ کی راتیں لمبی ہو گئیں اور دن بھی
لمبے۔ فلوریڈا میں بھی گالف کھیلتے ہیں۔ میں نے بھی کنٹری کلب جانا شروع کیا
لیکن جلد ہی کھلا کہ فلوریڈا میں گالف کھیلنا دہکتی ہوئی جہنم کے آس پاس منڈلانا
ہے۔ یہاں وہ یورپ والی بات نہ تھی۔

کبھی کبھار پاکستان سے اچھی خبر بھی آجاتی تھی۔ خبر ملی کہ جوہر میر
نیوارک میں ہے۔ تحقیق کی تو جواب ملا "بس جی آپ نیوارک جائیں وہ آپ

کھل جائیں گے..... آپ اسے ڈھونڈیے، ادبی رنج زیبا لے کر۔ بہرحال عرض تھا
گلی تھی، جستجو تھی، جوہر مل گیا۔ وہ حسبِ دستور رات کی ڈیوٹی پر تھا۔ لیکن اب کی بار
اخبار کا دفتر نہ تھا۔ بلکہ ہوٹل میں رات کی منیجری کر رہا تھا۔ فون کیا وہ میری آواز
سن کر ساکت ہو گیا۔ "ہوئے ارے ارے..... اللہ میں کس سے بات کر رہا
ہوں۔ میں نے تو سنا تھا کہ تم افریقہ کے جنگلوں میں بھٹک رہے ہو۔ کہاں ہو
اب؟"

میرے سر سے لگے گا، پرانی یادیں اندھیروں سے نکل کر اجالوں
میں آنے لگیں۔ الھڑ جوانی انگڑائیاں لینے لگی۔ جانے پہچانے در و دیوار مجسم
ہونے لگے۔ بات ادب پر آ کر رک گئی، کیونکہ اب میں اس کوچہ میں بالکل اجنبی
تھا۔ جوہر بگڑ گیا۔ اس کے بعد جب بھی فون پر بات ہوئی اس کا پہلا فقرہ "کیا لکھ
رہے ہو؟" اور میرا رٹا رٹایا جواب سنتا پڑتا۔ پھر کہنے لگا۔ "دیکھو! تم خوش قسمت ہو
نیوی کی بدولت تم نے دنیا دیکھی ہے۔ بس ان ہی یادوں کو محفوظ کر لو۔"

پھر وہ مجھے ادبی رسالے بھجوانے لگا۔ اپنے شعر، رنگ سیاسی کالم، اپنا
افسانہ بھی بھجوایا۔ کہنے لگا "تم ڈاکٹر احمد حسین کو جانتے ہو؟ وہ تمہارے آبائی گھر
محلہ بسادگل حسن کے پاس گلی پیر مس رہتے تھے آج کل اوہائیو میں ہیں۔ یہ
ہے ان کا نمبر، بات کرو۔ وہ پشاور پر بڑی جامع کتاب مرتب کر رہے ہیں۔ یہ
زریں موقع ہے۔ پشاور کی آتی ہوئی تہذیب پر کچھ لکھو اور انہیں بھجواؤ۔"

جوہر کے شاندار مشورہ پر میں نے اپنا زنگ آلود قلم ڈھونڈا اسے
دھویا، روشنائی سے آشنا کیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میرا قلم جو سو لکھ سکتا تھا۔ سالوں
کی تجدید حرف چھپنے لگی۔ قلم کی برق رفتاری ایسی کہ جوہر میرے ہوتے ہوئے
لفافوں سے عاجز آ گیا۔ کہنے لگا "اپنا رسالہ نکالنا پڑے گا، اس کے بغیر کام نہیں
چلتا۔"

غیر متوقع پیغام ملا۔ نیوی نے مجھے پھر بلا لیا اور میری تعیناتی کیلی
فورنیا میں کر دی۔ ایک بار پھر نقل مکانی ہوئی۔ کیلیفورنیا پہنچ کر میں نے جوہر کو
فون کیا۔ وہ برہم کہ "اتنی مدت بات نہ کی۔ پرانے فون پر مشین لگی ہے۔ یہ کوئی
شرافت ہے؟" وغیرہ وغیرہ۔ پھر کہنے لگا "پرچے کے بارے میں سنجیدگی سے
سوچو" ان دنوں آغا بابر سے بھی فون پر گفتگو رہتی تھی۔ میں نے آغا بابر سے
پرچے کا ذکر کیا۔ آغا بابر اپنی دستور کی بھول گئے اور بھاری دروازے سے قہقہہ لگا
کر کہنے لگے "اسے کہو یہ غلطی نہ کرے"

"لیکن آغا صاحب وہ سمجھا ہوا اتفاقی ہے"

"مجھے اس میں ہرگز کلام نہیں۔ لیکن [illegible] ہمارے ملک میں
چھپے ہوئے کاغذی کب کے وفات پا چکے ہیں۔ ذرا حقیقت پسندی سے دیکھو!!!
پہلے پرچے پر اپنا ایک Pay check لگا دے گا۔ دوسرے پرچے پر دوسرا
Pay check لگا دے گا۔ تیسرے اور چوتھے پرچے پر بیوی کے زیور بیچ کر
لگا دے گا اور جب پانچواں پرچہ مارکیٹ میں آئے گا تو اس کے پاس نہ نقد ہو گا
نہ زیور اور نہ ہی بیوی..." میں نے اپنے اور آغا بابر کے خدشات سے جوہر کو
آگاہ کر دیا یہ جانتے ہوئے کہ وہ اپنے فیصلوں پر ثابت قدم رہتا ہے۔ اس نے
"زاویہ" نکالا اور گھن گرج سے نکالا اور صرف چار پرچوں کی اشاعت کے ساتھ
پاکستان اور انڈیا کے علاوہ "زاویہ" پر امریکہ، کینیڈا، یورپ، مڈل ایسٹ اور
آسٹریلیا سے داد کے ڈونگرے برسنے لگے۔

جوہر نے فون کیا کہ فلاں تاریخ کو نیو یارک پہنچو تمہارے اعزاز
میں حلقۂ ارباب ذوق کا اجلاس بلا رہا ہوں۔ ڈاکٹر احمد صدارت کریں گے۔ نیا
افسانہ لے کر آنا۔ اجلاس اتوار کو ہو گا۔ اور پیر کی رات میرے ہاں محفل فکر و نظر لگتی
ہے۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ اس کا اپارٹمنٹ حجرۂ ضمیر کہلاتا ہے۔ اور پیر کی شب کو جو
کلاسیکی رت جگا ہوتا ہے۔ ادب، سیاست اور حالات حاضرہ پر زور دار مباحثے
ہوتے ہیں۔ ضمیر جعفری صاحب خود تشریف لاتے ہیں۔

یہ تو میں نے سن رکھا تھا بلکہ پڑھا بھی تھا کہ ضمیر جعفری اور جوہر میر
کی محبت لازوال ہے۔ ضمیر جعفری پاکستان جانے لگے تو جوہر میر اداس ہو گئے ان
ہی دنوں ایک غزل کہی۔

جوہر عذاب ہوں گے کڑی دھوپ کے سفر
ہوں گے نہ جب ضمیر یہاں سائباں مثال

جوہر کی غزل ان تک پہنچی۔ اور ضمیر جعفری نے یہ غزل جوہر کو ارسال کی۔

کشش وطن پاک لے جاتی ہے ورنہ
رہتے ابھی جوہر تیرے سنگ اور زیادہ

اور جب وہ واپس نیو یارک آئے تو حجرۂ ضمیر میں یہ غزل سنائی۔

کچھ جوانی کی گھڑیاں باقی تھیں عمر پیری میں
لوٹ کر ہم آ گئے ہیں شہر جوہر میر میں

حجرۂ ضمیر کی خاصیت صرف فکر و نظری نہ تھی کڑی تنقید، سیاست،
صحافت، شعر و نثر کی فکر انگیزی ہی نہ تھی بلکہ یہ حجرۂ ضمیر پشاوری طعام لذیذ کا لذت
کدہ بھی تھا۔ جوہر صبح سے شام تک باورچی خانے میں کھڑا ایپرن کندھے پر
ڈالے انواع کے کھانے بناتا رہتا۔ حجرۂ ضمیر کو لذت کدہ بنانے والے وہی ہاتھ
تھے جنہوں نے پاکستانی اور نیو یارک کے اخباروں کو شعلہ بداماں کر رکھا۔ یہ وہی
ہاتھ تھے جنہوں نے ضیاء الحق کو ضیاع الحق کہا۔ یہ وہی ہاتھ تھے جو آمر کی
ہتھکڑیوں سے آشنا ہوئے۔ یہ وہی ہاتھ تھے جنہوں نے حجرۂ ضمیر میں رت جگے
کرنے والوں کے لئے پلاؤ، کباب، نہاری، قورمہ اور شب دیگ سے ضیافت
کی۔

ایک دن مجھے کہنے لگا ایک دلچسپ واقعہ سنو۔ میں جیل میں تھا۔
مجھے باہر سے اطلاع ملی کہ مجھے رہا کر رہے ہیں۔" وہ خوش دلی سے ہنسا۔ "آمر

رباعیات

نامی انصاری (کانپور بھارت)

اک سلسلۂ حرف و حکایت ہے ادب
تفریح نہیں' دل کی وراثت ہے ادب
یہ طرزِ عبادت تھا کبھی ماضی میں
افسوس کہ اب مالِ تجارت ہے ادب

کہتے ہیں کہ اندر کی اُس آواز پہ جاگ
بجتی ہے جو ہر لمحہ نیا دیپک راگ
آسودگیِ شوق کا ہے ذکر عبث
بجھتی نہیں زلنار یہ تخلیق کی آگ

رندوں نے کہا "پیرِ مغاں! کم ہے شراب"
"کم ہی سہی' ناظورہ عالم ہے شراب"
ظاہر میں ہے جو کچھ اسے سب جانتے ہیں
باطن کے سروکار کی محرم ہے شراب

دنیا کی طلب ہے نہ زمانے کی ثنا
خود مست رہا کرتے ہیں اربابِ وفا
اس بزمِ خوش اطوار میں یکساں ہیں سبھی
عشاق میں کوئی نہیں اعلا ادنا

واماندۂ روزگار ہیں ہم لوگ
کہنے کے لئے ذی وقار ہیں ہم لوگ
کیا کچھ نہیں شاعر کے تخیل کی اڑان
محدود نہیں' بے کنار ہیں ہم لوگ

گرگٹ کا ہنر اس کو سکھایا کس نے
دنیا سازی کا گُن بتایا کس نے
گردن ہے وہی' جسم کا درپن ہے وہی
دس چہروں کا اک چہرہ بنایا کس نے

اپنے بچوں سے

نیّر جہاں

صحیفوں میں یہ لکھا ہے
شکست و ریخت کے موسم ازل سے آتے رہتے ہیں
بہاریں جب شگوفوں سے لپٹ کر الوداع کہہ دیں
مسافر زرد پتے جب سفر آمادہ ہو جائیں
بگولے ٹہنیوں سے اُن کا جوبن چھین لے جائیں
ہَوائیں تیز سے جب تیز تر ہوتی چلی جائیں
تو اتنا جان لینا تم..... کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ آندھی سے فضاؤں کی کثافت دُور ہوتی ہے
ہراساں تم نہ ہو جانا
شکست و ریخت کے موسم ازل سے آتے رہتے ہیں
شکست و ریخت کے موسم میں اک لمحہ ہے بس ایسا
اُس اک لمحے سے تم ڈرنا!
کہ جس میں پیڑ زندہ ہوں
مگر مالی کو گھُن کھائے
سفینہ راہ پر ہو
ناخدا گُم راہ ہو جائے
کہ جس میں گھر سلامت ہو
مکیں بے جان ہو جائے
کہ جب الفاظ زندہ ہوں
مگر مفہوم مَر جائے
اِس اک لمحے سے تم ڈرنا!
شکست و ریخت کا یہ لمحہ گر اندر اُتر جائے
تو پھر تعمیر کی دیکھو کوئی صورت نہیں رہتی!!

الحذر قہر سونامی

۲۶ دسمبر ۲۰۰۴ء

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ (د ہلی)

اے خدا میرے خدا سب کے خدا
ماسوا تیرے نہیں کوئی خدا
تیرے فیض و کرم سے جاری ساری
تیرے غیض و غضب میں ہے بہتری
بربادیوں کی ہو گئی تھی انتہا
خوف و دہشت کا بنا تھا سلسلہ
نفرتوں کے سانپ لہرانے لگے
ملنساری کے دیئے بجھنے کو تھے
قریہ قریہ پھیلے تھے دنگے فساد
تھی ملوث ان سے شہری نژاد
خضرِ راہ کے بھیس میں رہزن ملے
منافقوں کے ہو گئے بندے تیرے
دہر کو تیرے بنایا کربلا
آخرش ہمکو ملنا ہی تھی سزا
دے دیا اہلِ شرق کو سبق
اُس پہ روشن کر دیئے چودہ طبق
قہر سے بھرپور "سونامی" اُٹھا
زیرِ بحر آ گیا تھا زلزلہ
کر گیا ہر ایک شے زیر و زبر
اہلِ شرق پکڑے گئے بے خبر
آن واحد تھے جزائر زیرِ آب
کون لاتا بلاخیزی کی تاب
کہنے لگے تباہی کی داستان
سانحہ ہائے بکو بارانِ ذمان
شورِ محشر ایسا اُٹھا الاماں
تا حدِ نظر "اُجاڑ بستیاں"
آ گئے زد میں ہزاروں ماہی گیر
سینکڑوں ہی تفریح پہ نکلے رہگیر
غیر ملکی سیاح بھی گھیرے میں تھے
ان گنت لاپتہ طوفاں ہوئے
لاکھوں بیوائیں ہوئیں بچے یتیم
بے شمار زخمی ہوئے بے گھر ندیم
امتیازِ قوم و ملت نہ تھا
امتیازِ رنگ و نسل بھی نہ تھا
امتیازِ ذات پات نہ رہا

مرد و زن و طفل سب کو لے گیا
دے گئی "لہر سونامی" سوغات
زندگی سے پا گئے لاکھوں نجات
قہرِ اللہ سے کوئی ہے بچ سکا
گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا
اس شہر آشوب میں بھی دیکھئے
اسطرح انسان کو گرتے ہوئے
اغوا کر رہے ہیں بچے عورتیں
لوٹ مار اور شیطانی حرکتیں
ہائے آدم کی ہوس خرمستیاں
عقل حیراں ہے کہ آخر حد ہے کہاں
ہائے انسان اس قدر گر جائے گا
اے خدا تشنہ نے کبھی سوچا نہ تھا
اے خدا میرے خدا سب کے خدا
تو خلاقِ عالم افضل و اعلیٰ

تین مصرعوں کی نظمیں

ناصرؔ زیدی

مل کے آیا ہوں اک حسینہ سے
نشہ طاری ہے اس طرح جیسے
اپنے آپے میں رہ نہ پاؤں گا

☆

خواہشِ التفات پر اُس نے
بولتے لفظ کچھ لکھا ایسے
ہاتھ کو مَیں نے اُس کے چوم لیا

☆

پُرکشش جسم دل نشیں صورت
ہائے کیا حسنِ جاودانی ہے
سنگِ مرمر کی جیسے ہو مُورت

☆

مُسکراتا ہُوا حسیں چہرہ
گفتگو کرتی مدھ بھری آنکھیں
وہ سراپا بہار ہے گویا

☆

اَوابد اکر جسے میں تکتا ہوں
میرؔ بھی دیکھتے تو کہہ اُٹھتے
*"وصل اُس کا خدا نصیب کرے!"

*

وصل اُس کا خدا نصیب کرے   میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ
میر تقی میر

اقبال کی نذر

ڈاکٹر عبد الرحمان عبدؔ

خود آگاہ ہے فقیرے خوش بیانے
خوشا! اے خسرو شیریں زبانے

ترے افکار لافانی حقائق
ترے اشعار حکمت کے خزانے

خودی' شاہین' فقر و مردِ مومن
بڑے دلچسپ ہیں تیرے فسانے

نہ ڈوبے گا تری شہرت کا سورج
رہیں گے دیر تک تیرے زمانے

کریں نہ عبدؔ کیوں توقیر تری
شعار عبدؔ عرفان حقیقت

تجھے اقبال بخشا ہے خدا نے

مختصر نظمیں

علیم صبا نویدی

سوچ کی مانگ میں نئی بندیا
لب کے آنگن میں بیل موگرے کی
دل میں سنگیت سے بھری ندیا

مندروں کے قریب گنگا جل
نیتوں کی طہارتوں کا فلک
اور پوجا میں پھول بیٹھے پھل

تلخیوں کی حلاوتیں نسانی
انکساری ہے جوہر انساں
شیوۂ عجز نقشِ لاثانی

آنچ اندر کی لب تلک پہنچی
دل کے شعلے دماغ کے اطراف
رات دخترِ العنب تلک پہنچی

دور تک ارتقائی تشہیریں
جسم بھی خاک کا ہے آزوقہ
روح کی آسمانی تقدیریں

لذتِ اضطراب ہے دنیا
ذرے ذرے میں حسن ہے بیدار
ایک لمحے کا خواب ہے دنیا

سَمے ۔ وقت

بھگوان داس اعجاز

شوق کہے چل اُڑ نڈر سَمے کہے پھر سوچ
پنچھی ! اگر گردش میں ہیں پنکھ نہ لے کوئی نوچ

ہوا مخالف ہے ابھی دھیمی رکھیو چال
کوئی کھلونا دے اُسے ابھی سَمے کو ٹال

چور بھی مانگے معاوضہ ایسا وقت خراب
کوا بیٹھا ڈال پہ چونچ کھلونا داب

بُو بارود کی سونگھ لے وقت برا ہے بھانپ
ہاتھی چینٹی دیکھ کر جائے تھر تھر کانپ

بُرے وقت بندوق بھی لیتی آنکھیں پھیر
کندھا بدلا تھا فقط ہمیں ہو گئے ڈھیر

وقت تمہیں دیتا رہا سَمے سَمے سنکیت
دیکھ لے گوئیں کاٹھ کی چر گئیں سارا کھیت

سَمے اسی کا داس جو چلے سَمے کے ساتھ
وقت گزرنے پر سَمے کبھی نہ دیتا ساتھ

سچ ہے سَمے کے سامنے چلے نہ کوئی چال
اپنے سانچے ڈھال کر ہمیں بانکا کال

شہرِ نا پرساں

قیصر نجفی

مسافر لوٹ جا اس شہرِ نا آسودہ منزل سے
کہیں ایسا
نہ ہو اس غم کدے میں آہِ شب کے ناگ کا زہرِ جگر فرسا
تری سانسوں میں بھر جائے
فسردہ چاندنی کی ہوک کا خنجر
ترے دل میں اُتر جائے
کوئی سایہ
شبِ افسوس کے بے جاں مہ و انجم کے سب لاشے
ترے ہاتھوں پہ دھر جائے

مسافر لوٹ جا اس شہرِ نا آسودہ منزل سے
کہیں ایسا
نہ ہو کہ اس خرابے میں
غم و اندوہ کے سورج کی حدت سے
تری آنکھیں
ابل کر تیرے عارض پر ڈھلک جائیں
شفق کے گریۂ خوں ناب کے دل دوز منظر سے
ترے بھی حوصلوں کے سارے پیمانے چھلک جائیں
فغانِ صبح کی آواز کا پگھلا ہوا سیسا
ترے کانوں میں در آئے
غبارِ کربِ ہر ساعت
کی پپڑی تیرے ہونٹوں پر بھی جم جائے
فضائے سوختہ سے اوس کا تیزاب برسے اور
تو بے چہرہ ہو جائے
تری پہچان بھی اس شہرِ نا پرساں میں کھو جائے
مسافر لوٹ جا اس شہرِ نا آسودہ منزل سے

ایک خانگی المیہ

پی پی سری واستو رندؔ

بات کب حد سے بڑھی گھر میں تماشے کب ہوئے
کب منڈیریں بٹ گئیں، آنگن کے ٹکڑے کب ہوئے

رنگ الفت کے جو گہرے تھے وہ پھیکے کب ہوئے
وہ جو رشتے چہچہاتے تھے وہ گونگے کب ہوئے

اجنبی پتھر کئی سمتوں میں اچھلے تھے .... مگر
یہ ہمارے گھر کے چکنا چور شیشے کب ہوئے

ذہن و دل میں گونجتے ہیں چند آوارہ خیال
ہم جنوں پیشہ تھے پھر آدھے ادھورے کب ہوئے

اک طلسمی خواب تھی اندھے سفر کی داستاں
کب جانے گھٹ گئے رستے اندھیرے کب ہوئے

مسکراتے پیڑ، ہنستے راستے، مہکی فضا
سبز موسم جو مرے اندر تھے سوکھے کب ہوئے

چاندنی راتوں میں جو اکثر چہکتے تھے کبھی
صاف ستھرے گھر کے آئینے تھے میلے کب ہوئے

رندؔ ہم تو زندگی کے شور میں چلتے رہے
جو میرے ہم زاد تھے بہرے، وہ گونگے کب ہوئے

نیو ورلڈ آرڈر

ڈاکٹر حنیف ترین (سعودی عرب)

جنگجو نے یہ اعلان صادر کیا
میں محافظ ہوں، آقا ہوں اب دنیا کا
ساری دنیا میں اب ہوگی جمہوریت
ہوگی ہر سمت میں قدر انسانیت
منڈیوں میں چلے گا مرا ہی نظام
آئی ایم ایف سے دوں گا میں قرضے تمام
ختم کر دوں گا دنیا سے آلودگی
تا کہ خطروں سے محفوظ ہو زندگی
مہلک ہتھیار دنیا سے چھینوں گا میں
ہمنواؤں کی طاقت پہ اکڑوں گا میں
پانچ ہاتھوں کو ہے اب حق دلبری
اور حاصل رہے گی مجھے رہبری

اور پھر اس کی ہر شق بنائی گئی
حکمرانی کی پگڑی سنواری گئی
شیخ صاحب کی معتوب ہر بد نظر
کوئی اشلوک پڑھ کر جلائی گئی

الجزائر میں ابھری جو جمہوریت
اس کی گردن بدن سے اتاری گئی
ہیتی، گرینیڈا، پاناما، کولمبیا
بوسنا، منداناؤ، چیچنیا
(قبضہ کرنے کو ناطقی کا جہاں)
اپنے گرگوں سے سازش رچائی گئی
جو مخالف ہوا اس پہ بے ساختہ
یو این او کی چھری بھی چلائی گئی
(Morbid Fascination کی زندہ مثال)
اب عراق و فلسطین، افغان ہیں
ریپ انسانیت ہو گئی ہے جہاں

حکم نامے کی اب ہر جگہ دھوم ہے
جو نئی عالمی دھن سے موسوم ہے

سونامی کے تناظر میں

نثار ترابی

کیسی افتاد پڑی ہے تم پر
ہر طرف شور قیامت ہے بپا
کتنے بے گور و کفن لاشے ہیں
اور اٹھتی نہیں بینوں کی صدا
کیسا پانی ہے کسی ساحل کا
جس کی ہر موج ہی لیتی ہے خراج
ایک طوفاں تھا تہہ آب ایسا
جو چٹانوں کو ہلا دیتا ہے
زندگی سو گئی ایسے کہ زمیں
اپنے محور سے لپٹ کر روئے
چیخنے لگتا ہے راتوں کا وجود
یوں ہے بے چارگی زیست کا غم
دم بخود ہیں آنکھیں ہر چہرے پر
تیرتے جاتے ہیں پانی پر خواب
کیسی افتاد پڑی ہے تم پر
ہر طرف شور قیامت ہے بپا
کتنے بے گور و کفن لاشے ہیں
اور اٹھتی نہیں بینوں کی صدا

سُونامی (Tsunami)

دِل نوازدِل

(وہ سمندری زلزلہ جس نے حال میں جنوبی اور مشرقی ایشیا
کے ساحلوں پر قیامت خیز تباہی اور بربادی پھیلادی)

بحرِ ہستی میں جو آیا زلزلہ
ساحلوں پر موت آئی ٹوٹ کر
موج میں آتش فشاں کی آگ تھی
اور پانی تھا کہ لاوا لہر میں
لے گیا سب کو بہا کر اس طرح
جس طرح تنکے بہیں سیلاب میں
جس طرح سے خشک پتّے بھیگ کر
حاصلِ کُل اُٹھتی موجوں کا نہیں
اسقدر اونچی تھیں موجیں الاماں
موج کیا تھی موت کی دیوار تھی
زندگی پر آ گری جو ایک دم
رہ گیا ہر کوئی دب کر چیخ میں
آہ و زاری اس قدر پُر آب تھی
اس میں ڈوبی زندگی در زندگی
ہر طرف کُشتوں کے پُشتے لگ گئے
ہر طرف تھی ایک ہی آہ و فغاں
ہے جنوبی ایشیا گریہ کناں
مغربی اس حال سے بےحال ہے
ان کا ہر ساحل ہے اب ماتم کدہ
ہر طرف بکھری ہوئی لاشیں ہیں اَب
ہے زمیں گر دفن کرنے کے لئے
تو کفن ان کے لئے نا پید ہیں
ان کو دفنائے تو کیسے اَب کوئی
اور مُردوں کو جلانے کے لئے
آنسوؤں سے تر بتر ہیں لکڑیاں
آگ پانی کو لگے تو کس طرح
ہر طرف پانی ہی پانی ہے یہاں
آنکھ ہے پُر آب تو دل کا لُہو
بہہ رہا ہے پر یہ زیرِ آب ہے
بحر میں آتش فشاں پھٹنے لگے
آب سے کالا دھواں اُٹھنے لگا
آگ کے دریا رواں ہیں ہر طرف
ڈوبنے کو ہے زمیں اے آسماں
موت کی صورت میں دیکھو بحر سے
موج آئی ہے غریبوں کے لئے
ہے سمندر اب قیامت اور قہر
جو غریبوں کے لئے ہے کُبر بہر
دیکھ سالِ نَو کی آتش بازیاں
آگ برساتی شرابی مستیاں
مے کدوں میں جام ٹکراتے ہوئے
مل کے غریاں جسم بل کھاتے ہوئے
اور کہیں لاشیں ہیں بے گور و کفن
گل بدن غنچہ دہن کچھ خستہ تن
زندگی بے آب زیرِ آب ہے
رنج و غم کا ہر طرف سیلاب ہے
نُوح کا طوفان پھر آنے کو ہے
نوعِ آدم پھر سے بہہ جانے کو ہے

نوٹ: سونامی۔ جاپانی زبان کا لفظ جس کے معنی ہیں سمندری زلزلہ

پرندے اب نہیں آتے

سجاد مرزا

پرندے اب نہیں آتے
مرے آنگن کا سوکھا پیڑ
کب سے راہ تکتا ہے!

کبھی وہ دن تھے
جب شام و سحر تھیں رونقیں گھر میں
سبھی چھوٹے بڑے
مصروفِ کاروبارِ ہستی تھے

وہ شفقت
سرزنش
ماں باپ کی اب خواب لگتی ہے!

مرے بھائی.... مجھے پردیس میں
جب بھی بلاتے ہیں
مرے سینے سے اک بے چارگی کی ہوک اٹھتی ہے!

کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں
میں ان گزرے زمانوں کو
کہ جن میں زندگی کی دل کشی محسوس ہوتی تھی!

نہ جانے کب مرے گھر کی وہ رونق لوٹ کر آئے؟
کہ جب شام و سحر
ہر سو خوشی کے زمزمے گونجیں!

ثلاثی / ماہیے

خورشید انور رضوی

مت پیار جتا سجنا!
تو جھوٹی محبت کے
مت خواب دکھا سجنا!

کیوں دل کو دکھاتا ہے!
یہ ملتا کوئی ملتا
تو خواب میں آتا ہے

بے چین اُسی غم سے
جو عہدِ جوانی میں
اک بھول ہوئی ہم سے

یہ عشق کہانی ہے
ہر دم ہے تر و تازہ
گو صدیوں پرانی ہے

پنجرے میں پرندہ ہے
اُڑنے پہ نہیں قادر
احساس تو زندہ ہے

ہر رنگ میں رعنائی
اُس صورتِ زیبا کی
آواز بھی شہنائی

گُلاب

شگفتہ نازلی

گُلاب رُت میں گُلاب کھلتے ہیں
ہے لُطف تب جو.....
کسی چہرے پہ گُلاب کھلیں!

عجیب طرح کا منظر تھا روز و میرے
ہر اک گُلاب جو بکھرا.....
اُداس... کرتا.... گیا!

کسی طرح یہ خموشی کی مُہر ہی ٹُوٹے
گُلاب..... لہجے..... میں
آؤ! تو کوئی بات کریں....

جتنے گُلاب سامنے رکھے ہے جھُوئے
خوشبو کا...اور... رنگ کا تھا...پیرہن جُدا...
لگتا تھا.... آنے والوں کی ہیں... راہ دیکھتے...

تمہاری سوچ کو.. شاداب..اور.. شگفتہ... رکھے
ترے... دریچے... سے.... لپٹی
گلاب... بیل... رہے!

بہتر یہ ہے چلتا جاؤں

فیصل عظیم

جب مجھ کو معلوم ہے میری منزل کیا ہے
اور کیسی ہے
پھر میں کیوں یہ گھٹتے بڑھتے سائے تراشوں!
سبز رتوں کی ٹھنڈی چھاؤں کے سپنے دیکھوں'
کیوں ایسی دیوار سے آخر ٹیک لگاؤں
جو خود ڈھے جانے والی ہے!
کیوں ہر بدلے بدلے موسم سے گھبراؤں'
راہزنوں کے خوف سے رستوں میں چھپ جاؤں
جبکہ ہاتھ مرا خالی ہے
جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب نادیدہ ہے
کون چرائے!
پھر میں کیوں ہر موڑ پہ آ کے رکنا چاہوں۔
جب مجھ کو معلوم ہے میری منزل کیا ہے
بہتر یہ ہے چلتا جاؤں!

خلیجی ممالک میں اُردو

زیر نظر مضمون "عالمی اردو کانفرنس" بہ اہتمام ساہتیہ اردو اکادمی، دہلی (بھارت) 18 تا 20 مارچ 2005 میں پڑھا گیا جس میں امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، مشرقِ وسطیٰ، ماریشس، پاکستان، بھارت سے نامور ادیب، شاعر، دانشور، مدیر اور سکالرز شریک تھے جنہوں نے اکیسویں صدی میں اردو زبان و ادب کو درپیش مسائل کے حوالے سے نہایت مفید اور معلوماتی مقالات پیش کئے۔ اس موقع پر ساہتیہ اکادمی دہلی (بھارت) کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ان کے سبھی رفقائے کار کے حسنِ اخلاق، حسنِ انتظام اور حسنِ معاملات کو خراج پیش نہ کرنا ان کو ان کے حق سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ساہتیہ اردو اکادمی کی یہ کاوش بار آور ثابت ہوگی اور آئندہ بھی اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لئے اسی طرح کی کانفرنس کا انعقاد جاری رہے گا۔

گلزار جاوید

خواتین و حضرات! بلحاظ عقیدہ، نظریہ، مسلک و مراتب سلام و احترام قبول کیجئے......!

کانفرنس، سیمینارز، محافل، مجالس، مشاعروں، مذاکروں کی ابتدا بالعموم میزبان کی تعریف و تحسین سے ہوا کرتی ہے۔ بیشک! آدابِ میزبانی اس عمل کے جس قدر بھی متقاضی ہوں مگر دست، دل و دماغ کو اس امر پر آمادہ کرنا ہمارے لئے کارِ دشوار ہے۔ بچپن سے لے کر جوانی، جوانی سے لے کر بڑھاپے تک مرتضیٰ ہندی کی کشادگی و فراخی کے قصے سنتے پڑھتے دیکھتے آئے ہیں۔ جب جب دیارِ میر و غالب کے طواف کا موقع میسر رہا ہے دل و دماغ بہت سے لطیف احساسات سے دوچار رہے ہیں۔ شاید میر صاحب کا یہ شعر ہمارے محسوسات کی ترجمانی کا بار اُٹھا سکے!

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میرؔ
پر ترا نامہ تو اِک شوق کا دفتر نکلا

ہر چند ہم موضوع، دستور "اردو زبان و ادب" سے مشروط ہے پھر بھی غالب کی طرح اس بے نوا کو "خلیج میں اردو" کا موضوع تنگنائے غزل سے مماثل محسوس ہو رہا ہے پھر صاحب! ہر لحظہ بدلتی دنیا اور دستور بھی اس امر کے متقاضی ہیں کہ مرتضیٰ رنگ و نور کا ذکر کم از کم مرزا صاحب کی پیروی میں "ذکرِ پری وش" کی مانند ہی کیا جانا چاہئے۔

"خلیجی ممالک میں اردو" کے علاوہ بھی خلق خدا کی دلچسپی کے حامل بہت سے عنوانات تجویز کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً خلیجی ممالک میں رقصِ ذوالجلال، خلیجی ممالک میں صحرائی لطف و کمال، خلیجی ممالک میں دولتِ بے مثال، خلیجی ممالک میں شوکتِ درہم و دینار، خلیجی ممالک میں حسن و عشق، خلیجی ممالک میں کثرتِ ازدواج، خلیجی ممالک میں حضرتِ بخل وغیرہ۔

صاحب! قبل اس کے کہ ہم اور آپ "خلیجی ممالک میں اردو" کے حساس اور وسیع موضوع سے ہمدوش ہوں چند اہم نکات ہماری توجہ چاہتے ہیں۔ اول دنیا کی قدیم اقوام رومیوں، یونانیوں، روسیوں، قطبیوں، پارسیوں کی تہذیب، تمدن اور علم و فن کی ترقی و تنزلی کو حافظے میں اور کتابوں کے شاعرانہ آغاز سے سبق آموز انجام تک کا منظر ذہن میں تازہ کرنا ہوگا۔ دوئم ماہرین حیاتیات کی اس رائے کو ہر آن پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ انسانوں کی اکثریت بدلتے حالات کے مطابق اپنے حواس، وقت کے مناسب سانچوں میں ڈھال لیتی ہے۔ سوئم چیخوف کے الفاظ میں زندگی کی جو تعریف پیش کی گئی ہے وہ کچھ اس طرح ہے "زندگی وہ خواب ہے جو عالم بیداری میں دیکھا جاتا ہے مگر خواب کی طرح زندگی میں ہر چیز کو روشن تر کر کے دکھانے کی کیفیت موجود نہیں ہے۔ اکثر انسانوں کے لئے زندگی ایک خوابِ غفلت کی مانند ہے کہ قدرت کی جانب سے حواسِ خمسہ کی طاقت و دولت کی دستیابی میں بھی حقائق و کوائف کا درست طور پر اندازہ نہیں کر پاتے۔" سوئم یہ کہ ہمیں مغربی محقق ڈیوڈ کرسٹل کے 1999ء میں کئے گئے اس تحقیقاتی انکشاف پر بھی خصوصیت کے ساتھ توجہ مرکوز کرنا ہوگی کہ آئندہ پچاس سالوں میں دنیا میں بولی جانے والی کم و بیش چھ ہزار زبانوں میں سے کم از کم آدھی زبانیں وقت کی دھول میں گم ہو جائیں گی یا کر دی جائیں گی۔

تیسری دنیا خصوصاً برصغیر کے عوام بہت سی محرومیوں، مجبوریوں اور قدغنوں کے ردِ عمل میں، حواس اس طرح قابو میں نہیں رکھ پاتے جس طرح مہذب، معتبر اور بااختیار اقوام کے افراد دکھا کرتے ہیں۔ ہم لوگ مستقبل کی فکر میں پڑے بغیر حال سے لطف اندوز ہونے کے زیادہ قائل ہیں۔ موقع کی مناسبت سے از خود خوشی کے ذرائع بھی تراش لیتے ہیں۔ جس قدر میلے ٹھیلے، جلسے جلوس، محفلیں، مجلسیں، چوپالیں، بیٹھکیں اور ہاؤ ہو ہمارے خطے میں پایا جاتا ہے اس قدر شور شرابہ دنیا کے کسی حصے میں شاید ہی پایا جاتا ہو۔ ہماری سرزمین پر اُردو زبان کی پیدائش، پرورش اور پرداخت جس طرح سے ہوئی اس میں کسی طرح کی حکمت، پیش بندی یا پیش روی کے بجائے حالات زیادہ دخیل تھے جس کے سانچوں میں اس خطے کے لوگ خود کو ڈھالتے گئے۔ ہم اگر ماضی کے انہی اوراق کو اپنے اذہان میں تازہ کریں گے تو "خلیجی ممالک میں اردو" کا آغاز برصغیر میں اردو کی ابتدا سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہ آئے گا۔

ایک طریقہ "خلیجی ممالک میں اردو" کے موضوع پر گفتگو کا یہ ہے کہ ہم آپ کی انگلی تھام کر صد ہزار شعر کی دلنشین وادی کی سیر کو نکل جائیں جہاں کی ماضی آرائش و زیبائش میں میلاپ کی چاشنی گھولتے ہوئے خود بھی فریب کھائیں،

آپ کو بھی گرما کر رہی ہے۔ یہاں دقت درپیش یہ ہے کہ ہماری حساس طبع اور زود رنجی
بہت جلد بیدار ہو جاتی ہے۔ اہل اردو شعار کے محفل میں پہلے کوئی پورا اترا ہے نہ ہم
اتر سکیں گے۔ ذرا سی کوتاہی بہت سی رنجشوں اور گلے شکوؤں کے جنم کا باعث بن سکتی
ہے ویسے بھی یہ محفل منور ہے، مہذب، محب ہے، ماشاءاللہ شرکائے محفل
صدق و صداقت تعلیم یافتہ، مہذب، مؤدب اور باخبر لوگوں سے آراستہ ہے جو ہم
سے زیادہ بہتر طریق پر "خلیجی ممالک میں اردو" کی تاریخ سے آشنائی کے حامل
ہیں۔

طریقہ دوسرا بھی صائب ہے مغربی مصنفین، ماہرین اور دانشوران
کے اقوال مخمرہ سے جدید جدید اور خوش کن اقتباسات کا سہارا لے کر "خلیجی
ممالک میں اردو" کے روشن مستقبل کی نوید سنائی جائے۔ تیسرے طریقے پر بھی
آپ کو اعتراض نہ ہونا چاہئے کہ خلیج میں برپا مشاعرے، مذاکرے، سیمینارز اور
تقریبات کے مفصل زائچے "خلیجی ممالک میں اردو" کے موضوع کو مکمل اور
مفصل رنگ و روپ عطا کر رہے ہیں۔ ہمارے اختیار کردہ چوتھے طریقے سے
آپ شاید اتفاق نہ کر پائیں، حالات اس امر کے متقاضی ہیں کہ ہم خوش گمانیوں
کی دھوپ چھاؤں سے نکل کر حقیقت آشنا ہوں۔ بقول حضرت بہادر شاہ ظفر:

گو حرف پند تلخ ہے پر دل میں رکھ ظفر
اک روز یہ ہو اثر آئے گی کام تلخ

"خلیجی ممالک میں اردو" کی ابتدا کو آپ عرب تاجروں کی
ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آمد کے ساتھ جوڑ لیں۔ "خلیجی ممالک میں
اردو" کو آپ پہلی جنگ عظیم سے بریکٹ کر لیں۔ "خلیجی ممالک میں اردو" کو آپ
دوسری جنگ عظیم سے تعبیر دے لیں۔ "خلیجی ممالک میں اردو" کو آپ تقسیم ہند سے
تعبیر کر لیں، حقیقت یہ ہے کہ ساٹھ کی دہائی کے اواخر اور ستر کی دہائی کے شروع
میں خلیجی ممالک میں وافر مقدار میں تیل کی دریافت کے بعد دنیا کے کونے
کونے سے اردو داں اور غیر اردو داں لوگوں کی تلاش معاش کے سلسلے میں خلیج
میں آمد کے ساتھ ہی خلیج میں باقاعدہ اردو کا آغاز ہوتا ہے۔ گو کہ بحرین میں جعفری
برادران کے 1930ء میں قائم کردہ سٹور پر اردو کتب کی فروخت اور 1946ء
میں خلیج کے واحد مستند اور قد آور استاد شاعر جناب سعید قیس کی آمد اور اردو
سرگرمیوں کے شواہد بھی ملتے ہیں مگر خلیج میں اردو سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز زیادہ
سے زیادہ چار دہائیوں کی دین ہے۔

وقت کی قید لازم نہ ہوتی تو وہ تمام انفرادی اور اجتماعی اہل اردو شعار
آپ کی نظر کرتے جن کے توسط سے خلیج میں اردو کا پودا نشوونما پا رہا ہے۔ بنظر
غائر دیکھیں تو "خلیج میں اردو" کا آغاز خلیج کی تمام ریاستوں میں قریب قریب
ایک ہی طرز اور طریق پر ہوا ہے یعنی لوگ آتے رہے کارواں بنتا رہا۔ پہلے پہل
عام بول چال میں مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں کے درمیان اردو رابطے
کی زبان بنی۔ آہستہ آہستہ صاحب دل، صاحب قلم اور صاحب عمل احباب کی
یکجائی نے اسے ایک مشن کا درجہ دے دیا۔ بلاشبہ محفلوں، مجلسوں، مشاعروں،
مذاکروں اور تقریبات نے اردو زبان کو خلیج میں بہت بڑھاوا دیا ہے، ٹھوس کام
اردو کے باب میں سب سے زیادہ یہاں قائم ہونے والی علمی درسگاہوں نے
انجام دیا ہے۔ مستند طور پر خلیجی ممالک میں کئی درجن سے زائد تعلیمی ادارے قائم
ہو چکے ہیں۔ جن میں کم و بیش پچاس ہزار طلبا اور طالبات جدید علوم کے ساتھ
اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں جن میں امتحانات کا سلسلہ پاکستان کے فیڈرل
بورڈ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ساتھ
جڑا ہوا ہے۔ خلیج کونسل کے چیئرمین ملک سعودی عرب کی درسگاہ "جامعہ ملک
سعود" میں اردو اختیاری زبان کے طور پر پڑھائی جاتی ہے جہاں سعودی طلبا اور
طالبات بھی اردو سے آشنا اور مستفید ہو رہے ہیں۔ تیسرے نمبر پر "خلیجی ممالک
میں اردو" کی ترقی اور پرداخت کی ذمہ داری وہاں کے اخبارات نبھا رہے ہیں۔
ابتدا میں برصغیر کی خبروں کو اردو میں شائع کرنے کے بعد کئی اخبارات نے ایک
سے زائد اردو صفحات باقاعدہ اشاعت میں شامل کر کے اس خطے میں اردو کو بہت
بڑھاوا دیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ خلیج میں مقیم تجارتی حلقوں نے تشہیری مد میں مالی
تعاون پیش کر کے اردو کی ترقی کو مہمیز دی ہے۔ فوری طور پر حافظے میں کویت
ٹائمز، صوت الخلیج، عرب ٹائمز، قطر کے گلف ٹائمز، سعودی عرب کے "المدینہ
اردو" "اردو نیوز" اور الریاض ڈیلی کے نام نمایاں ہوتے ہیں۔ خلیجی ممالک کے
ریڈیو اور ٹی وی نے اردو پروگرام کے ذریعہ بھی اردو کو عام کرنے میں بہت مدد
کی ہے۔ لوگ باگ اپنے خطے کی خبروں میں اشتیاق کے باعث آل انڈیا ریڈیو،
ریڈیو پاکستان، ریڈیو سیلون، بی بی سی، وائس آف جرمنی اور وائس آف امریکہ کی
نشریات شوق سے سنتے ہیں۔ شارجہ ٹی وی نے جب سے اردو نشریات کا آغاز کیا
ہے خلیجی ممالک کا سب سے مقبول ٹی وی چینل بن گیا ہے جس کی پیروی میں خلیج
کے کئی ٹی وی چینل اردو نشریات کا دورانیہ بڑھا رہے ہیں۔ پاکستان اور
ہندوستان کے ادبی مزاج کے حامل سفیران کرام جناب نجم الثاقب، جناب مہدی
مسعود، جناب خالد سلیم، جناب سریندر لال گلاٹی، جناب کرامت غوری کی خدمات
بھی اردو کی ترقی و ترویج میں بہت معاون رہی ہیں۔ سعودی عرب، کویت، متحدہ
عرب امارات اور بحرین کی بہت سی اہم شخصیات نہ صرف اردو فہمی، اردو شناسی کی
حامل بلکہ اُن کی ذاتی دلچسپی اور جستجو نے اردو کے بہت سے دشوار راستے آسان
کئے ہیں۔ عربی زبان کے بہت سے شعراء نے بھی نہ صرف اس کی ترقی میں ذاتی
دلچسپی لی ہے بلکہ کئی محترم ہمارے ایسے بھی ہیں جنہوں نے اردو شاعری کے ذریعے
خلیج میں نئی طرح کا آغاز کیا ہے۔

تمام انفرادی اور اجتماعی کاوشوں کے نتیجے میں جو نتائج ہمارے
سامنے آتے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں۔

☆ غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اردو خلیج کی دوسری بڑی زبان بن چکی ہے۔

☆ کم و بیش دو ملین افراد اس وقت خلیج میں اردو کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ جن میں ہندوستانی، پاکستانی، سری لنکن، بنگلہ دیشی، نیپالی، برمی، مصری، سوڈانی، فلپائنی، جاپانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

☆ خلیج کے دیگر ممالک میں کئی چھوٹے بڑے سے اردو اخبار و رسائل کے ساتھ خلیج کونسل کے چھ میں ملک سعودی عرب میں ایک مکمل اردو روزنامہ "اردو نیوز" روزانہ پچاس ہزار سے زائد کی تعداد میں شائع ہو رہا ہے۔

☆ سعودی عرب میں ہی حج کے ایام میں "المدینہ" کے نام سے اردو بولنے اور سمجھنے والے حاجیوں کی سہولت کے لئے اردو اخبار شائع کیا جاتا ہے جس کی اشاعت چالیس ہزار سے شروع ہو کر لاکھ کے ہندسے کو چھو رہی ہے۔

☆ ہوٹلوں، دکانوں، مکانوں اور جا بجا اردو میں تحریر کردہ سائن بورڈ بھی اردو کا ماحول قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں۔

☆ جا بجا انڈین اور پاکستانی گانوں کی گونج سے کویت، قطر، بحرین، ام القوین، راس الخیمہ، ابو ظہبی، دمام، طائف وغیرہ پر دہلی یا لاہور کا گمان گذرتا ہے۔

☆ بہت سے ممالک میں درہم، دینار، ریال اور فلس کو روپیہ اور پیسہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

☆ خلیجی ممالک کے بہت سے سرکاری اداروں میں عربی کے ساتھ اردو میں بھی اعلانات درج ہیں۔

☆ سعودی عرب میں بعد نماز عشا اردو میں خطبہ یا تقریر کی اجازت دے دی گئی ہے۔

☆ خلیجی ممالک میں جو لوگ اردو نہیں بولتے صرف سمجھتے ہیں ان کی بول چال میں بھی اردو کے کئی الفاظ مثلاً چائے، دروازہ، دریچہ، راستہ، آؤ، ادھر آؤ، جاؤ، کھاؤ، پیو، جلدی، چھوٹی، روٹی، قیمہ وغیرہ شامل ہو چکے ہیں۔

☆ بحرین کی "بزم سخن" اور "اشفاق" کویت کی "بزم اردو" "پاک بزم سخن" اور "پاکستان آرٹس کونسل" قطر کی "بزمی کلب"، "بزم اردو" اور "مجلس فروغ ادب" متحدہ عرب امارات کی "بزم ادب" "پاک ادب سوسائٹی" "امارات اردو سوسائٹی" "بزم شعر و ادب" "آرٹس پروموشن بیورو" "پاک امارات فرینڈ شپ" سعودی عرب کی "بزم ادب" "بزم اقبال" "پاکستان کلچرل گروپ" "بزم علم و فن" "حالی لٹریری سرکل" "دائرہ ادب جدہ" "بزم اردو دمام" کے زیر اہتمام بہت سے عالمی پائے کے مشاعرے، مذاکرے اور سیمینار ہوئے ہیں۔ جن میں پاکستان سے جناب احمد ندیم قاسمی، جناب انتظار حسین، جناب احمد فراز، جناب جمیل الدین عالی، سید ضمیر جعفری، جناب شہزاد احمد، جناب امجد اسلام امجد، ڈاکٹر سلیم اختر جب کہ ہندوستان سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، جناب آل احمد سرور، ڈاکٹر خلیق انجم اور جوگندر پال صاحب جیسے بلند قامت اور معتبر اہل قلم شرکت کرتے رہے ہیں۔

☆ بہت سی بڑی ادبی شخصیات مثلاً فیض، فراز، عمار، محسن مجروح، کیفی آزاد کے جشن اور تقریب رونمائی بھی یہاں بڑے تزک و احتشام سے منائے جاتے ہیں۔

☆ خلیج سے ہی بڑے بڑے ادبی انعام و اعزاز اردو یا کستان کے نامور اہل قلم کی خدمت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ جن میں نقد رقم بھی قابل کشش ہوا کرتی ہے۔

حضور والا! "خلیج میں اردو" کا یہ اجمالی خاکہ کس قدر خوش کن اور رنگ آمیز ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی حیثیت سینما کی سکرین پر نظر آنے والی شوخ و شنگ، خوبصورت و خوبرو دلبر و دلربا ہیروئن کی مانند ہے جس کی تمام رعنائی اور دلکشی سینما کی سکرین تک محدود ہوا کرتی ہے۔ جس طرح اس ہیروئن کی ذاتی زندگی سینما کی سکرین والی ہیروئن سے قطعی مختلف ہوتی ہے اسی طرح خلیج میں نظر آنے والی اردو کی چمک دمک اس میلے کی مانند ہے جو گھر سے جیبیں بھر بھر کر آنے والوں کے لئے مصنوعی طور پر سجایا جاتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ لوگ یہاں گھر سے جیبیں بھر بھر کر آنے کے بجائے یہاں سے جیبیں بھر بھر کر جا رہے ہیں۔ اس بہتی گنگا میں کئی بے ادبی بھی دامے، درمے، سخنے اپنا دامن تر کر رہی ہے۔ کبھی ہم نے اس امر پر غور کیا ہے کہ جس وقت خلیج میں درہم، دینار، ریال کی ریل پیل نہ ہوگی، سب کچھ ہوگا مالی مفادات کے ٹھیکیداروں کو اردو سے دلچسپی نہ ہوگی تو خلیج میں اردو کا مستقبل کیا ہوگا؟ کیا درہم، دینار، ریال کی ریل پیل کے بغیر اردو زبان اور اس سے وابستہ افراد خلیج میں اردو کا وجود اسی طرح برقرار رکھ سکیں گے جس طرح آج ہم اس کے دعوے دار ہیں۔ ہماری ناچیز رائے میں ابھی تک خلیج کی سرزمین میں اردو کا بیج نہ بویا جا سکا ہے۔ جو کچھ رنگ و رونق ہے وہ زمین کی اوپری سطح تک محدود ہے جو عارضی طور پر سجائے گئے میلے سے کسی طرح بھی مختلف نہیں ہے۔

سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا استدلال درست تسلیم کر لیا جائے تو اس ساری صورت حال کا ذمہ دار کون ہے؟ کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں، سوائے ہمارے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے!

☆ خلیج میں اردو کے داعی اور سرگرم لوگوں میں کتنے ایسے ہیں جو اپنی آئندہ نسل کا مستقبل اردو سے وابستہ کرنے پر آمادہ ہیں؟

☆ کتنے اردو داں اور اہل قلم ایسے ہیں جن کی روزمرہ بول چال میں اردو زبان حاوی ہے؟

☆ خلیج میں اردو کے سفر کو چار دہائیاں گذرنے کے باوجود اس خطے سے کوئی مستند دانشور، ادیب، محقق، نقاد، شاعر، ادیب یا مدیر پیدا نہیں گذرا جسے جوش،

فراق، فیض، مخدوم، جذبی، قرۃ العین، عسکری، ناسخ، نور ملک، وارث یا سیماب کے ہم پلہ قرار دیا جاسکے!

☆ اردو کی نئی بستیوں کے علاوہ "خلیج میں اردو" کا سارا زور شاعری کی حد تک ہے۔ اس خطے سے منسوب کتنے شعرا اور شاعرات ایسے ہیں جن کے سپرد اردو شاعری کے مستقبل کو بآسانی کیا جاسکتا ہے؟

☆ کتنے احباب سنجیدگی کے ساتھ ادب سے وابستہ ہیں کتنے شوقیہ یا تفریحاً اس شغل کو اپنائے ہوئے ہیں؟

☆ کتنے شاعر اور شاعرات عروض اور اوزان سے درست طور پر واقفیت کے حامل ہیں؟

☆ کتنے مجموعوں کا بیرونی امداد پر آسرا ہے؟

☆ کتنے سخن کار حقیقی جوہر کے مالک، کتنے بیرونی کمک پر اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں؟

☆ جس قدر بھی تخلیقات اس عرصہ میں منظر عام پر آئی ہیں کیا انہیں نقد و نظر کی چھلنی سے گزارا گیا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس عمل میں دیانت و امانت کو کس قدر دخل رہا ہے؟

☆ خلیج کے ممالک میں جس قدر بھی مشاعرے، مذاکرے اور تقریبات ہوا کرتی ہیں کیا اس میں ہندوستان، پاکستان کے مستحق لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے یا پبلک ریلیشنگ کا فن کام آتا ہے؟

☆ خلیجی ممالک میں موجود انجمنوں اور مجلسوں کی جانب سے دیئے جانے والے اعزازات، انعام اور ایوارڈ شفاف مراحل سے گزر کر حق دار تک پہنچتے ہیں یا ان کا آئینہ بھی دھندلایا ہوا ہے؟

☆ سب سے اہم اور تکلیف دہ امر یہ کہ ہند و پاک کی قدیم دھڑے بندی کے اثرات اردو کی نئی بستیوں کے ساتھ خلیجی ممالک میں بھی جڑیں پکڑ چکے ہیں۔

اگر ہم اپنی صفوں میں پائے جانے والے نقائص کا غیر جانبدارانہ محاکمہ کریں، اصلاح احوال کی سبیل نکالیں! تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمیں "خلیج میں اردو" کے بہتر مستقبل کے راستے دستیاب نہ ہوں کوئی وجہ نہیں کہ سرزمین خلیج پر چہل قدمی کرتی ہوئی اردو تیکم کی جڑیں اس مادر مہربان کی آغوش میں پیوست نہ ہوں۔ جیسے ہی اوپر نشان زد کردہ خامیوں اور خرابیوں پر ہم حاوی ہو جاتے ہیں تو خم ٹھوک کر حکومت ہند اور حکومت پاکستان سے ہم راز و ہم آواز ہو کر یہ مطالبے بھی کئے جاسکتے ہیں۔

☆ خلیج کی اردو درس گاہوں کا نصاب ممکن حد تک ایک ہونا چاہئے۔

☆ خلیج سے فارغ التحصیل طلبا و طالبات کو ترجیحی بنیادوں پر برسر روزگار کیا جانا چاہئے۔

☆ خلیج میں پہلے سے موجود اردو درس گاہوں کی مناسب مالی امداد کی جانا چاہئے۔

☆ خلیج میں نئی علمی درسگاہوں کے قیام کے لئے پرکشش ترغیبات دینا چاہئے۔

☆ خلیج میں موجود دونوں ممالک کے سفارتخانوں کو اردو درس گاہوں اور اردو مجلسوں کے مسائل ہمدردانہ طور پر حل کرنے کے احکامات ہونا چاہئے۔

☆ خلیج میں موجود اساتذہ، طلبا، اہل قلم کو ایک دوسرے کے ملک میں آنے جانے کی سہولت ہونا چاہئے۔

☆ ہندوستان، پاکستان سے خلیج کے لئے آنے والے علما، ادبا، شعرا کو سفری کرایوں میں ممکن حد تک رعایت ملنا چاہئے۔

☆ خلیج کے ممالک میں مقیم دانشور، ادیب اور شاعروں کی کتب اپنے اپنے ملک میں شائع اور تقسیم کرنے کا ایسا ادارہ قائم ہونا چاہئے جو یہ کام نفع، نقصان کے بغیر انجام دے۔

☆ خلیجی ممالک میں مقیم اردو زبان سے وابستہ ہر فرد کو ایک دوسرے کے ملک میں علاج معالجہ کی مناسب سہولت ہونا چاہئے۔

☆ خلیجی ممالک میں اردو زبان و ادب کی سنجیدہ اور بے لوث خدمت کرنے والی مجلسوں کی سرکاری سطح پر حوصلہ افزائی ہونا چاہئے۔

☆ سب سے اہم اور لازمی یہ کہ اردو کی نئی بستیوں بالخصوص خلیجی ممالک کے لیے ڈاک کی شرح مخر بتانے کے ساتھ گذشتہ چار سال سے لاگو "وار ٹیکس" ختم کیا جانا چاہئے۔

جس قدر آسان تجاویز اور مشورہ دینا ہوتا ہے اسی قدر دشوار ان پر عمل کرنا بھی ہوا کرتا ہے۔ یقیناً اس امر کا ہمیں احساس ہے کہ ہماری گذارشات اس قدر رسا نہیں ہیں جس قدر معصومیت سے ہم نے انہیں بیان کر دیا ہے۔ یہ یقین البتہ ضرور ہے کہ خلیج کے علاوہ جہاں جہاں اردو بولنے لکھنے پڑھنے اور سمجھنے والے بستے ہیں اگر وہ بلا امتیاز رنگ و نسل، ملک و ملت، اردو برادری کا روپ دھار کر اپنی زبان کی سربلندی و سرفرازی کے لئے ایثار، سچائی اور خلوص دل سے جدوجہد پر آمادہ ہوں گے تو نہ صرف جابر جاپانیت کے اقوال زریں، نہ علم نحو کی تعریف زندگی نہ ڈیوڈ کرسٹل کا تجزیاتی انکشاف اور نہ دو ہم وجا رکی کیا بی ان کی راہ میں آڑے آئے گی ورنہ علامہ اقبال کے شعر میں ذرا سے تصرف کے ساتھ ہمارے حشر میں خاک!

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے اردو والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

☆

تخلیقِ عصر

تازہ تصانیف کا تعارف

عطیہ سکندر علی

رقصِ شرر

ہمارے عصر کے بلند قامت شاعر ملک زادہ منظور احمد صاحب کی خود نوشت ہے جس میں سیاسی، سماجی اور ادبی چاشنی نے افسانہ، ناول اور سفرنامہ کی سی لذت پیدا کر دی ہے۔ پڑھنے والے کو بار بار حیرت کا سامنا ہوتا ہے کہ اس غضب کی نثر لکھنے والا شخص کیونکر تمام عمر شعر گوئی یا مشاعروں میں مقید رہا؟ قریب ستر سالوں پر محیط یادوں کا خزینہ سپردِ قلم کرتے ہوئے ملک زادہ صاحب اس قدر روانی، سلاست اور سبک رفتاری سے آگے اور آگے بڑھتے ہیں کہ پڑھنے والے کو کبھی خون کی گردش تیز کبھی مدھم ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ دل کی دھڑکن قابو میں ہوتے ہوئے بھی اکثر بے قابو ہو جاتی ہے۔ شدید خواہش کے باوجود "رقصِ شرر" سے اقتباسات پیش کرنا بھی ممکن نہیں ہے کہ چھ سو صفحات پر محیط یہ کتاب جا بجا خوبصورت اشعار، نایاب و نادر خطوط، دلچسپ و دلگداز واقعات اور نادر تصاویر سے اس قدر پُر ہے کہ اس کا بیان مختصر طور پر کرنا ایک طرح سے کفرانِ نعمت ہی تصور کیا جائے گا۔ آپ ہندوستان میں رہتے ہیں یا پاکستان میں بستے ہیں، خلیجی ممالک میں آپ کا قیام ہے یا مغربی ممالک میں بسیرا، ملک زادہ منظور صاحب کے زرخیز ذہن میں ہر جگہ اور ہر قیام کی بابت معلومات یعنی دلچسپ معلومات کا اس قدر ذخیرہ دستیاب ہے کہ پڑھنے والے کو مسلسل گرفت زدہ رکھتا ہے۔ بہت سے واقعات کا رخ متنازعہ رکھتے ہوئے بھی اُن کا بیان اور اختتام مثبت طرز پر کیا گیا ہے کسی کی دل آزاری اور دل شکنی ملک زادہ صاحب کو ہرگز منظور نہیں ہے مگر نہ ایسے موقعوں پر بہت سے احباب دل کی بھڑاس جی کھول کر نکالا کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں "رقصِ شرر" اردو ادب کے تمام شعبوں سے متعلق احباب کے لئے ایسی دستاویز ہے جس میں برصغیر کے بے شمار حالات و واقعات محفوظ ہیں جن کا پس منظر ادبی، سیاسی اور سماجی ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مربوط ہے۔ سب سے اہم بات جو "رقصِ شرر" کے مطالعے ہمارے ذہن میں آئی وہ یہ ہے کہ خود نوشت تحریر کرتے ہوئے اکثر احباب "میں" کے حصار سے نہیں نکل پاتے جبکہ ملک زادہ منظور صاحب نے خود نوشت تحریر کرتے ہوئے احباب کا ذکر اس کثرت اور محبت سے کیا ہے کہ "رقصِ شرر" خود نوشت کی بجائے احباب نوشت محسوس ہوتی ہے۔ جلد، کاغذ، طباعت ہر لحاظ سے اعلیٰ درجے کی یہ کتاب صرف پانچ سو ہندوستانی روپیے کے عوض مکتبہ جامعہ اردو بازار، ساقی بک ڈپو اردو بازار، انجمن کاروان ترکمان گیٹ، ایوانِ ادب ترکمان گیٹ دہلی اور دانش محل، امین آباد لکھنؤ پر بآسانی دستیاب ہے۔

صبحِ غزل

1914 تا 1991 زندگی کی بھرپور جولانیاں اور رنگینیاں دیکھنے اور شعری دنیا کو چونکانے رکھنے والے شاعر جناب شعری بھوپالی کا مجموعہ غزل ہے جس کا پہلا ایڈیشن 1964 میں منشی رفیق احمد خورجوی نے ادارہ اشاعت القرآن اردو بازار دہلی کے زیرِ اہتمام شائع کیا۔ جبار مرزا صاحب کا نظر ثانی کردہ دوسرا ایڈیشن شہریار پبلی کیشنز اسلام آباد کے زیرِ اہتمام شائع ہوا ہے۔ ملک کے نامور شاعر جناب محسن بھوپالی "صبحِ غزل" کے بارے فرماتے ہیں۔ "شعری بھوپالی اردو کے اہم شاعر ہیں یا نہیں، اس کا جواب آنے والا دور دے گا لیکن اتنی بات طے ہے کہ اردو غزل کے بنانے اور سنوارنے میں اُن کا بھی حصہ ہے۔ اردو غزل کی کوئی بھی انتھالوجی (Anthology) ان کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے نہیں کہ وہ اپنے دور کے مقبول شاعر رہے ہیں بلکہ انہوں نے ایسی غزلیں کہی ہیں جنہیں غزل کے رسیا اور غزل کے پارکھ کسی طور بھی نظر انداز نہیں کر سکتے بلکہ انہیں مرصع غزلیں کہنے پر مجبور ہیں۔" اس قدر جامع بھرپور اور مستند رائے کے بعد صرف جناب مرحوم شعری بھوپالی کے کلام سے اقتباس ہی کافی ہے۔

اگر کچھ تھی تو بس یہ تھی تمنا آخری اپنی
کہ وہ ساحل پہ ہوتے اور کشتی ڈوبتی اپنی

لب رو کے سے کب رُکتی ہے فریاد کسی کی
نشتر کی طرح چبھنے لگی یاد کسی کی

غضب ہے جستجوئے دل کا یہ انجام ہو جائے
کہ منزل دور ہو اور راستے میں شام ہو جائے

زیرِ نظر کتاب "صبحِ غزل" کی اشاعت، زیرِ عتاب ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے تعاون اور دلچسپی کے باعث اشاعت پذیر ہوئی ہے جسے دیکھ اور پڑھ کر دل باغ باغ، طبیعت شادمان ہو جاتی ہے۔ قریب دو سو اسی صفحات کا یہ شعری نسخہ تمام کا تمام مجلد آرٹ پیپر سے آراستہ ہے جس کی قیمت چار سو پاکستانی روپئے ۳۰ امریکی ڈالر یا ۲۰ برطانوی پونڈ مقرر کی گئی ہے۔ دستیابی کے مشتاق احباب پوسٹ بکس نمبر 1692 اسلام آباد پر رجوع کر سکتے ہیں۔

لینڈ اسکیپ کے گھوڑے

جس قدر شوق، لگن، سچائی، ایمانداری اور توانائی سے شرف عالم ذوقی لکھ رہے ہیں آج کے دور میں شاید ہی اُن کا ثانی دستیاب ہو۔ شرف عالم ذوقی کی کسی کہانی کے اقتباس کے بجائے بیک ٹائٹل پر درج اُن کی تحریر کا عکس آپ کی نذر کر کے اُن کے جوش، جذبے اور ولولے کو خراج پیش کیا ہے۔

"گودھرا، گجرات، امریکہ سے عراق تک.... تاریخ صرف اپنی بربادی کے قصے ہی رقم کرتی رہی ہے.... تاریخ جیسے گونگی ہے..... جسے اپنے آپ کو دہرانے سے دیر لگانا بھی نہیں آتا...... جو ہر برس، ہر لمحہ گزرنے کے ساتھ زیادہ بے رحم اور زیادہ سفاک ہوتی جا رہی ہے۔ میں تاریخ کے ایسے بے رحم صفحوں پر اپنے لئے جائے پناہ تلاش نہیں کرتا...... میں تو ایک معصوم سا ادیب ہوں۔ مظلوم، حساس اور جذباتی...... میں تاریخ کے ایسے ہر حملے میں، ہر بار زخمی ہوا ہوں...... ہر بار مرا ہوں...... ہر بار زندہ ہوا ہوں...... اور اب تاریخ کے ان بے رحم تھپیڑوں کو برداشت کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے..... میں ایک حقیقت نگار ہوں...... دستوئفسکی، چیخوف، شولوخوف کی طرح ایک حقیقت نگار...... شاید اسی لئے میں اپنے عہد سے آنکھیں چرا کر کچھ بھی تحریر نہیں کر سکا......"

جناب شرف عالم ذوقی کی تحریر کے مطالعے سے اُن کی کہانیوں کی بابت کسی قسم کا ابہام باقی نہیں بچتا وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں بلا ہچکچاہٹ اُسے قرطاس پر منتقل کر دیتے ہیں۔ چونکہ ہر تحریر میں وہ ذاتی طور پر شامل ہوتے ہیں اس لئے اُن کے قلم سے نکلی ہوئی ہر تحریر قاری کے دل کو چھونے لگتی ہے۔ یہ کہانیاں سچی ہیں یا جھوٹی ہیں، اصلی ہیں یا نقلی ہیں اس بات کا فیصلہ آپ خود کیجئے مگر "لینڈ اسکیپ کے گھوڑے" کے مطالعے کے بعد ہمیں اُمید ہے کہ "لینڈ اسکیپ کے گھوڑے" کے مطالعے کے بعد ایک نیا شرف عالم ذوقی دریافت ہو گا جس کی طاقت، توانائی پہلے سے زیادہ بحر امواج میں ایک نئے جہاں کی دریافت میں مگن دکھائی دے گی۔ ایسا جہان جس کی تلاش میں انسان صدیوں سے سرگرداں ہے۔ تین سو سے زائد صفحات کی یہ کتاب دو صد ہندوستانی روپیہ کے عوض ساشا پبلی کیشنز، گیتا کالونی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں دہلی اور بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ پر دستیاب ہے۔

شور بادباں

آندھیوں کو تو سہہ گیا ہوتا
قہر تھا شور بادباں سہنا

اکبر حمیدی شعری محاسن میں اب اس مقام و مرتبے پر فائز ہو چکے ہیں جہاں زندگی کے تجربات اور فنی پختگی کی آمیزش چھوٹی بات کو بڑی اور عام واقعہ کو خاص بنا کر پیش کر دیا کرتی ہے۔ "شور بادباں" پروفیسر اکبر حمیدی کا نواں شعری مجموعہ ہے جس میں جابجا اُن کا دل، اُن کے ارمان، اُن کے احساسات اور تجربات بشکل فن قاری کا دل جیت رہے ہیں۔

جو عاشقوں کے لئے مرجع عقیدت ہو
کہیں کہیں پہ وہ شہر بتاں بنا ہے

عمر کیا ہے یونہی بہتی رہتی ہے
وہ بھی سنی جو دل کی دھڑکن کہتی ہے

جو بھی حالات ہوں پیچھے نہیں ہٹنے والے
ہم ہیں عشاق تری آن پہ کٹنے والے

نئی دنیا کا انساں ہو گیا ہوں
بڑے مضموں کا عنواں ہو گیا ہوں

اور کچھ لمحے میسر آ گئے
آج بھی جان بچ گئی گھر آ گئے

جو ارزاں تھے گراں ہونے پہ آئے
یہ ذرے آسماں ہونے پہ آئے

ضخامت اس نمائندہ شعری نسخے کی ایک سو بانوے صفحات اور قیمت ایک سو روپے ہے جبکہ ملنے کا پتہ عمر پبلشرز، 2029، سٹریٹ 32، آئی ٹین فور اسلام آباد ہے۔

تیرگی کے درمیاں

"عصری شعور، معاشرتی آگاہی اور انسانی نفسیات کی بوقلمونی نے باہم آمیخت ہو کر شکیلہ رفیق کے افسانوں کی صورت اختیار کی ہے۔ شکیلہ صحیح معنوں میں ایک باہنر افسانہ نگار ہے اس نے اپنی کہانیوں کے کہانی پن کو سلیقے سے قائم رکھا ہے اور اپنے قاری کو علامت یا تجرید کی بھول بھلیوں میں بھٹکانے کے بجائے سچے اور کھرے ابلاغ کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے افسانے بامعنی بھی ہیں، اثر انگیز بھی ہیں اور ان کے دم سے پڑھنے والے کے سامنے متنوع انسانی رویوں کی ایک قوس و قزح سی تخلیق ہوتی چلی جاتی ہے۔ شکیلہ نے اپنے افسانوں کے کرداروں کو اس قدر قریب سے دیکھا ہے کہ ان کے باطن کی مکمل ہلچل سامنے آ جاتی ہے۔ اس پر مستزاد افسانہ نویسی کے فن پر شکیلہ کی حیرت انگیز گرفت ہے جس نے اس کے افسانوں پر کاملیت کی مہر ثبت کر دی

ہے"

احمد ندیم قاسمی

ایک سو اٹھانوے صفحات کے اس مختصر سندیافتہ افسانوی مجموعے میں بارہ نمائندہ افسانوں کے علاوہ مصنف کا تحریر کردہ "حرفِ یقیں" اور جناب محمود ہاشمی کے پیش لفظ کے علاوہ مصنف کی بابت کئی مختصر اسنادِ درج ہیں جن کے اسمائے گرامی پر اکتفا کیجئے۔ جناب جوگندر پال، جناب شمس الرحمٰن فاروقی، محترمہ فہمیدہ ریاض، محترمہ عذرا عباس، جناب نشاط یاد اور ڈاکٹر شان الحق حقی۔ افسانے کی دنیا میں شکیل رفیق کا نام ہی بذاتِ خود ایک سند کا حوالہ ہے جبکہ اس افسانوی مجموعے میں "اردو ادب" کی ایک کہکشاں شکیل رفیق صاحب کی افسانہ نگاری کے حوالے سے اظہارِ اعتراف اس برملا طریق پر کر رہی ہے کہ دل سے استاد مرتا کے علاوہ کچھ بھی ادا ہونا کار دشوار ہے۔ تازہ بتازہ اشاعت پذیر "سیرگی کے دوریاں" صادقین کے سرورق عمدہ کاغذ بہترین چھپائی اور مضبوط جلد کے ساتھ دو صد روپے ہندوستانی کے عوض استعارہ پبلی کیشنز A-53 ذاکر باغ اوکھلا روڈ نئی دہلی پر دستیاب ہے۔

سمندر میں اترتا ہوں

ڈھلی ہے کبھی صبح کبھی شام ترا شی
یوں روز نئی گردشِ ایام ترا شی

یاران سبک گام کی تقلید کا فن سیکھ
رہنا ہے اگر شہر میں تا دیر کا فن سیکھ

انجم خلیق کا شمار ان نوجوان شعراء میں کیا جانا عین مناسب ہے کہ اردو شاعری کا مستقبل جن کے وجود سے بہت سی امیدیں باندھے ہوئے ہے۔ بظاہر ان کے عنوانات اور ان کا لب و لہجہ روایت سے جڑا ہوا ہے مگر گردو پیش سے آگاہی اور ہیجان انگیز اس قدر سنجیدگی و شائستگی کے ساتھ اشعار میں نمایاں ہوتی ہے کہ احتجاج بھی ناروا نہیں لگتا۔

اخلاص و مروّت کی روایت نہیں بدلی
یا بھی ہے یاروں میں نمایاں مرے جیسا

چاہے تو شوق سے مجھے وحشتِ دل شمار کر
دلوں سے کٹ چکا ہوں میں اپنی انا ابھار کر

پروفیسر جلیل عالی درست طور پر فرماتے ہیں۔ "انجم خلیق عدت بیان کے مکینیکل اور غیر تخلیقی مظاہروں کے فیشنی زو میں بہہ کر اچنبھے پیدا نہیں کرتا۔ جذبہ و احساس کی صداقت نے اسے سادگی میں پُرکاری کے پہلو تلاشنے کی راہ سجھائی ہے" سینئر شاعر جناب محمد اظہار الحق کے خیال میں "میرے نزدیک انجم خلیق کی غزل کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس نے غزل میں وہ سب کچھ کہا جو نظم میں کہا جاتا ہے۔ غزل کی اس صنف کا کمال تو اس میں ہے یعنی انجم خلیق کی قدرتِ کلام پر بھی سر ہلانا پڑتا ہے کہ اس نے عملی دنیا کی حقیقتوں کو اسی خواب زار میں خوبصورتی سے سمویا اور یہ کام کرتے ہوئے تغزل کو مجروح بھی نہ ہونے دیا۔ دو صد آٹھ صفحات کا یہ خوبصورت اور معیاری شعری مجموعہ صرف ایک سو ساٹھ روپے کے عوض 349- سروس روڈ جی نائن ون اسلام آباد پر دستیاب ہے۔

مصلوب

میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ ناصر بغدادی اپنی تہہ دار تحریر، باقوت بیانیہ، موضوعاتی متنوع اور دو پیرایۂ اظہار کی بدولت ایک منفرد اور ممتاز افسانہ نگار تصور کیا جاتا ہے۔ ان کی کہانیوں کا تازہ مجموعہ "مصلوب" ہمیں اس نگارخانے کی سیر کراتا ہے جس میں سجے تمام افسانوں کا عکس بیک وقت ایک دوسرے میں حلول ہوتے نظر آتے ہیں۔ شاید اسی لئے ہم اس کے کسی ایک افسانے تک محدود ہو کر نہیں رہ جاتے بلکہ ایک ہی وقت میں تمام افسانوں کے تاثرات کو اپنے میں سرایت کرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ اور ان کی اجتماعی نیرنگی ہمیں اپنے طلسم میں سمیٹے ہمارے سامنے ایک عجیب اور انوکھا حیرت کدہ وا کرتی چلی جاتی ہے۔ یہی طلسماتی فضا افسانہ نگار ناصر بغدادی کو ایک مخصوص کردار اور قد و قامت بھی عطا کرتی ہے۔ ان افسانوں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ان میں بظاہر بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ ماورائی گمشدگی بھی ہے جو قاری کو اپنی تلاش میں سرگرداں کر کے ایک عجیب سحر سے آشنا کرتی چلی جاتی ہے۔ یہی گمشدگی ناصر بغدادی کی تحریر کو حقائق تحریر بھی بناتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے ناصر کے قدردانوں نے صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں جگہ دینے کے لئے مجبور کرتی ہے۔ کوثر تسنیم

ناصر بغدادی کی تحریر میں متن کچھ اس ڈھب سے عیاں و نہاں ہوتا ہے کہ تحریر کچھ اس طرح حظ دیتی ہے جو بے پڑھا نہ جائے اور جو نہیں ہے وہ پڑھ لی جائے۔ وہ زندگی کی تنگ دو میں بھرپور شمولیت کے باوجود اپنی تحریر میں زندگی کو کھوجتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ناصر کی تحریر آپ کی آنکھ کو کھلی رکھتی ہے اور کھلی آنکھوں کی بصارت کو بند آنکھوں کی سوچ تک لے جاتی ہے۔

اقبال متین

"مصلوب" کے صفحات میں مذکورہ بالا مختصر و مستند "اقبالی بیانات" کا سلسلہ کافی مفید ہے جس کا بیان طوالت کا متقاضی ہے جبکہ زیرِ نظر صفحات کا سرنامہ تعارف تک محدود ہے لہٰذا ہماری خواہش ہے کہ آپ کے اور "مصلوب" کے معیاری و منفرد افسانوں کے تعارف میں ہرگز تاخیر نہ کی جائے۔ آپ بھی اوّلین فرصت میں E-8/14-2، بلاک 14، معمار اسکوائر، گلشنِ اقبال سے رجوع کیجئے جہاں دو صد چالیس صفحات کا یہ تحریری شہ پارہ فقط دو سو روپے میں

آپ کا منتظر ہے۔

سہ ماہی "سورج"

اردو ادب کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ لگے بندھے اصولوں کے تحت محدود دائرے میں گھوم رہا ہے۔ کتب اور رسائل کی اشاعت کے مقابل مطالعے کا رجحان تیزی سے کم ہونے کا ایک سبب یہی فرسودہ نظام ہے۔ کبھی کبھی اس خاموش سمندر میں کوئی لہر سورج کی کرنوں سے توانائی حاصل کر کے نئے زاویے بنا کر زندگی کی علامت بھی بن جاتی ہے۔ ہمارے روبرو سہ ماہی "سورج" کے تازہ شمارے کی جانب ہے جس کی ترتیب، تزئین، پیشکش اور مواد بہت معیاری اور قابلِ مطالعہ ہے۔ "سورج" کے کہنہ مشق مدیر جناب تسلیم احمد تصور نے سہ ماہی "سورج" کو ادب سے ہٹ کر بھی پڑھے لکھے انسان کے لئے کافی جدید و دلکش بنا دیا ہے۔ سرورق کے نمایاں عنوانات ہی آپ کی توجہ بھرپور طریقے سے حاصل کر لیتے ہیں۔ "لاہور کے چونکا دینے والے تاریخی حقائق" بیگم ریاض خیرآبادی سے پہلا اور آخری انٹرویو' اشفاق احمد نام طفیل محمد (غیر مطبوعہ اور نادر خطوط) حمید اختر ایک گمشدہ افسانہ نگار' جمیل الدین عالی کی طویل نظم "انسان"۔ اس کے علاوہ منتخب افسانے' غزلیات' نظمیات' سعید شیخ کی ڈائری اور نقد و نظر کے علاوہ نامور مصور اور شاعر جناب اسلم کمال کے قلم سے دنیا کی نامور مصورہ اور بلال طرز جو سنڈل کے شب و روز انوکھے انداز میں پیرو قلم کئے گئے ہیں۔ غرض سہ ماہی "سورج" کا تازہ شمارہ علم و ادب کی تمام تر رنگا رنگی کے ساتھ تین سو بیالیس صفحات کی ضخامت اور تاریخی اہمیت کی رنگین و سادہ تصاویر کے ہمراہ صرف دو صد روپیہ میں 6/A ظہیر الدین روڈ' اسلام پورہ لاہور سے دستیاب ہے۔

عالمی اردو ادب

حسبِ سابق جناب نند کشور وکرم نے دیانتداری' محنت' لگن اور شوق سے "عالمی اردو ادب" سال 2004 کا شمارہ ترتیب دیا ہے جس میں سن 2004 کے منتخب افسانے' غزلیات' نظمیات' رنج بختی' دوہے' رباعیات' تحقیقی مضامین' ہندی ادب' سوانحی اشاریئے' تازہ تخلیقات کی تفصیل اور وفیات کے عنوان سے 2004 میں رخصت ہونے والے اہلِ قلم کے اسمائے گرامی تحریر کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ "عالمی اردو ادب" کی ایک خصوصیت اس کے خاص گوشے ہیں جو جناب نصیر آغا قزلباش' جناب بیدل حیدری' جناب دیوندر ستیارتھی' جناب عبداللہ ملک اور جناب حافظ حیدر کے فن و شخصیت سے منسوب ہیں۔ ادب کے قاری کے علاوہ "عالمی اردو ادب" کا یہ خاص شمارہ علمی' ادبی' تحقیقی اور تنقیدی باب میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے جس کے ذریعہ تمام اردو دنیا کی سال بھر کی خصوصیات تمام تر خوش اور سوگواری کے ساتھ ایک جلد میں مقید ہو کر آپ کی رہنمائی کے لئے دستیاب ہوتی ہے۔ اس کارِ خیر کا تمام تر سہرا فقط ایک شخص جناب نند کشور وکرم کی ذاتِ گرامی کو جاتا ہے جو زندگی کے بکھرے ویرانوں میں نوجوانوں کی طرح تازہ دم عزم اور ادب کی خدمت کے حوالے سے پرجوش دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیشہ کی مانند اس بار بھی "عالمی اردو ادب" کی یادگار اور مفید دستاویز اپنے محقق اور لائق مدیر کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ چار صد صفحات کی یہ قیمتی سوغات دو سو پچاس ہندوستانی روپے کے عوض اے ف 21/4-ڈی' کرشن نگر دہلی بھارت سے دستیاب ہے۔

بجر زل اور سورتی

ایک انگوٹھی ایک نگینہ اپنی جگہ بجا ورنہ سہی مگر ایک انگوٹھی اور ان گنت نگینے کی اختراع بھی جلد قبولیت کی منازل طے کرتی جا رہی ہے۔ محترمہ ترنم ریاض نے جس قدر برق رفتاری سے نظم' غزل' افسانہ اور ناول میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے اس پر رشک اور حسد سے بڑھ کر نئے جذبے کی بنیاد رکھی جانا چاہیئے۔ "بجر زل" اُن کے ستر افسانوں کا ایسا مجموعہ ہے جو اپنے اندر غم' خوشی' سرشاری اور سرمستی کے ایسے ایسے انمول خزانے لئے ہوئے ہے جن کی معیت میں قاری کا ہر دن عید اور ہر رات شبِ برات کی مانند بسر ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ یک دماغ ہو کر مذکورہ بالا کتب پر توجہ مرکوز کی جائے۔ دعویٰ کی تصدیق میں راقم تحریر نے چند مستند اور معتبر اسناد پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ "ترنم ریاض کے نام پر بہت سے لوگ چونکیں گے لیکن کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ادب کی دنیا میں اپنی آہٹ سے یا آہنگ سے لہجے میں منظومہ یا افسانوی سے چونکا بھی ایک جمالیاتی عمل ہے۔ جب جب کوئی نئی آواز ادب کی جزائر میں ابھرتی ہے تو کسی کو اندازہ نہیں ہوتا' آیا پہلی آہٹ کے بعد ڈوب جائے گی یا دیر و دور سے تکرار کر ارتعاش پیدا کرے گی۔ اردو شاعری اور فکشن میں اپنی پہچان اور معروف حیثیت رکھنے والی ترنم ریاض نے موجودہ چیلنج کثیر صورت کے کڑے دور و تیزی سے بدلتے کلچرے جو سے سائل پہنچی ناول تحریر کر کے جس سفر کا آغاز کیا ہے اس میں ان کی کامیابی اسی طرح یقینی ہے جس طرح دیگر اصناف میں یقینی تھی۔" پروفیسر گوپی چند نارنگ ..... "ترنم ریاض بہت دنوں سے کہانیاں لکھ رہی ہیں مگر حال ہی میں "آج کل" میں شائع ان کی کہانی پر ملبوس کل جیسے پختہ فادگی جوم اُٹھے ہیں۔" مجیب الرحمٰن فاروقی ..... "ترنم ریاض نے اچھے موضوعات اور لکھنے کے لئے مناسب اسلوب اختیار کیا ہے۔" شیر مسعود ..... "ترنم ریاض کے افسانوں کے موضوعات' اسلوب اور اظہار کی خیر رنگی' تازگی اور سادگی اور تشکیلی قدرت ان کے فن کے قابلِ ذکر خصائص ہیں۔" معراج کول .....
"ترنم ریاض ان افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جن کا اظہار یہ اور بیانیہ اُن کی اپنی ذات کے ساتھ تہذیب و ثقافت اور اعلیٰ اقدار پر مبنی ہوتا ہے۔" ابوالکلام قاسمی ..... "ترنم ریاض کے افسانوں کی فضا بڑی مانوس بہت صاف اور شستہ ہے۔ وہ اپنی سادگی' بے تکلفی اور بے ساختگی کی وجہ سے ہمیشہ متاثر کرتی ہیں۔"

مظہر عام..... "زخمِ ریاض کے اندر عورت کے تمام روپ ماں، بہن، بیٹی اور محبوب کے بدرجۂ اتم دستیاب ہیں جس کے باعث ان کی کہانیوں کے پلاٹ، مکالمے اور منظر نامہ اپنا رنگ جما کر قدر بنا ہوا محسوس ہوتا ہے یہی ایک کامیاب فنکار کی دلیل اور دیرپا تخلیق کی علامت ہے۔" گلزار جاوید.....

"سیمر زل" عمدہ کاغذ دلکش سرورق اور روشن طباعت کے ساتھ دو صد پچاس روپے بھارتی جبکہ "سوہنی" یا کسی سرورق یا مقصد سو اور باعث مطالعہ ہوتے ہوئے ایک سو پانچ صفحات پر محیط ہے اور دونوں کتب بزم ادبی دنیا پبلی کیشنز دہلی گیٹ دریا گنج نئی دہلی سے دستیاب ہیں۔

جوگندر پال کی کہانیاں

نہیں رحمن بابو

جناب جوگندر پال کا نام آتے ہی ماحول میں خاص طرح کی باقاعدگی اور اپنا پن آ جاتا ہے وہ کہانی کہتے نہیں بنتے ہیں۔ الفاظ اور احساس کے ایسے بکل بوٹے کھلاتے ہیں کہ تخت سے تخت تے ہوئے اعصاب بھی گرہ در گرہ کھلنے اور کھلنے لگتے ہیں۔ جوگندر پال صاحب اردو کہانی کے ایسے مسیحا ہیں جن کے دم قدم سے اردو افسانے کی بغیہ میں بے شمار خوش رنگ نرالے پھول کھل بھی رہے ہیں اور پڑھنے والوں کو کھلا بھی رہے ہیں۔ ان کی دو تازہ تخلیقات حال ہی میں منظر عام پر آئی ہیں "جوگندر پال کی کہانیاں" اور "نہیں رحمن بابو"۔ کون ہے جو ان کہانیوں کا مداح نہیں ہے؟ کون ہے جو ان کہانیوں سے لطف اندوز نہیں ہوا؟ کون ہے جو ان کہانیوں سے روشنی حاصل نہیں کرتا؟ کون ہے جو ان کہانیوں کو اردو ادب کا سرمایہ نہیں گردانتا؟ کمی ہے تو قاری کی، کمی ہے تو اردو ادب کی تنگ دامانی کی، اس قدر شستہ، رواں، مدھم ترین "بھلا اب چند سو یا چند ہزار لوگوں کے درمیان گردش کر کے چند یوم، چند ہفتے یا چند مہینے بعد اجنبیت کا شکار ہو جائے گا.....! سوچئے غور کیجئے کچھ ہی پڑتا ہے تو کر گذریئے کہ عمر عزیز کی اتنی بہاریں دیکھنے کے بعد بھی جوگندر پال صاحب کا قلم اور کلام بڑے بہاؤ سبھاؤ سے مائل بہ پرواز ہیں۔ ہماری جانب سے جس قدر مہمیز انہیں ملے گی اسی قدر ان کی اڑان اونچی بے تکان ہو کمل ہوگی جس سے نہ صرف فکر و فن کے انمول موتی دریافت ہوں گے بلکہ جوگندر پال صاحب کو من کا سچا سکھ اور شانتی دستیاب ہوگی اور اردو ادب کا یہ انمول ہیرا اپنے گرد و پیش کو اور زیادہ روشن اور زیادہ تابدار کرے گا۔ "جوگندر پال کی کہانیاں" ایک سو اسی صفحات پر مشتمل ہے جس میں پندرہ کہانیاں ان گنت کرداروں اور کہانیوں کے ذریعہ افسانے کا وقار بلند کر رہی ہیں جبکہ "نہیں رحمن بابو" ایک سو ساٹھ صفحات پر محیط ہے جس کے اندر ان گنت افسانچے اور لاتعداد کردار بھٹکے ہوئے، بہکے ہوئے، مرتے، سسکتے ہوئے آدمی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ "نہیں رحمن بابو" کی قیمت ایک سو پچیس روپے ہندوستانی اور دستیابی کا پتہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس لال کنواں دہلی ہے۔ "جوگندر پال کی کہانیاں" ایک صد روپے ہندوستانی کے عوض تخلیق کار پبلشرز لکشمی نگر دہلی سے دستیاب ہے۔

سوچ نقد

پروفیسر مرزا محمد زمان آزردہ نہ صرف کشمیری تہذیب و شائستگی کے اہل پیش کار ہیں بلکہ انسانی قدروں کی ترجمانی بھی دلکشی و دلربائی سے انجام دیتے ہیں۔ ان سے مل کر ان کی شخصیت کا دھیما پن ملنے والے کے رگ و پے میں آہستہ آہستہ مکمل حل کرتا دیر قائم رہتا ہے۔ "سوچ نقد" کو جناب آزردہ نے پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب کو معنون کرتے ہوئے حافظ کا شعر پیش کیا ہے

تا مرا عشق تو تعلیم سخن گفتن کرد
خلق را ورد زبان مدحت و تحسین من است

سوچ نقد اردو ادب کے طالب علم اور محقق کے لئے بڑی مفید اور کار آمد ہے جس میں غالب اور اقبال کا موازنہ، مسعود حسن رضوی ادیب کا نظام تنقید، ادبی ترجمہ مسائل اور مسائل، مصنف و ناشر، تحریک آزادی اور ریاست جموں، چکبست، پریم چند کی حقیقت نگاری، مرزا ادیب کی اردو نثر اور فصیح کی کلیات ماتم، شیخ العالم کا تصور عشق، پریم ناتھ در کی افسانہ نگاری، فراق اور ہندوستانی تہذیب و تشخص، اردو مرثیہ میں مشترکہ تہذیبی عناصر، اردو اور کشمیری رسم الخط اور بلا، رشید احمد صدیقی صاحب کی تحریروں کا سرچشمہ، دیہات اور دیہاتی زندگی کا ترجمان پریم چند جیسے اہم اور بلیغ موضوعات پر نئے زاویوں اور نئے دلائل کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے اپنے پڑھنے والوں کے عنوان سے آزردہ صاحب یوں مخاطب ہیں۔ "ظاہر ہے میرے پاس بتانے کو کچھ نہیں البتہ کچھ اوراق پریشاں ہیں جو چھپے ہوئے ہونے کے باوجود بیشتر لوگوں کی نظروں سے چھپے ہوئے تھے۔ احباب، گذشتہ برسوں میں بہت آگے نکل گئے اور میں ایک دیوار کے سائے میں بیٹھا سوچتا رہا۔ اب نہ جانے ہوا کا جھونکا کدھر سے آیا کہ فرحت کا احساس بھی ہوا اور فرصت بھی نظر آنے لگی۔ اس لئے سوچا جس محفل کو پیچھے چھوڑ آئے تھے، اس کی طرف پھر رجوع کریں۔" مرزا پبلی کیشنز کی یہ کتاب سری نگر کے علاوہ شاہد پبلی کیشنز دریا گنج نئی دہلی سے ۱۵۰ روپے ہندوستانی کے عوض دستیاب ہے۔

نظم جدید کی تثلیث

چوہدری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ (یو۔ پی) انڈیا میں ایم۔ اے کی طالبہ نے شاداب علیم "نظم جدید کی تثلیث" کے عنوان سے شہرت کی تین نابغہ روزگار شخصیات کو نئے ڈھنگ اور نئے انداز سے دریافت کر کے مقالے کو کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ مقالے کے بارے ڈاکٹر منظر حنفی کا خیال ہے "شاداب علیم نے ایم۔ اے کے اس مقالے میں جس عرق ریزی اور جستجو سے کام لیا ہے

بساطت پی۔ایچ۔ڈی کی سطح کے مقالوں میں بھی اس طرح کی محنت اور لگن دیکھنے میں نہیں آتی۔" ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کا فرمان ہے "شاداب علیم اردو کی ذہین طالبہ ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب "نظم جدید کی تحریک" میں تحقیق، ارتقا اور اسمٰعیل میرٹھی کے حوالے سے نظم جدید کے فروغ پر مکمل کر بحث کی ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ میرٹھ شہر سے ہی نظم جدید کو فروغ حاصل ہوا" ڈاکٹر مشتاق صدف کے خیال میں "مصنفہ نے مذکورہ شاعروں کے شعری و فکری مجددانہ و امتیازات کے ضمن میں توازن، شعری سلاست اور مواد کی قطعیت کو برقرار رکھتے ہوئے ادبی معیار کا خاص خیال رکھا ہے۔" تین محترم و معتبر اور بلند قامت صاحبان علم و دانش کی آرا سے مزین ایک سو ساٹھ صفحات کا یہ ادبی تحفہ صرف ایک سو پچاس روپے ہندوستانی کے عوض شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ (یوپی) انڈیا سے دستیاب ہے۔

دوسرا اجالا

محترم شبنم رومانی فکر و فن کے اُس مقام پر ہیں جہاں سے روشنی کا اخراج ہوا کرتا ہے اور ان گنت و ان شمار لوگ بلا امتیاز اُس روشنی سے فیضان اُٹھایا کرتے ہیں۔ "دوسرا اجالا" جناب شبنم رومانی کا تازہ شعری نسخہ ہے جس کے ہر ہر ورق، ہر ہر شعر اور ہر ہر لفظ میں رومانی صاحب کا مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ رنگ دکھلا رہا ہے۔

وہ جو سورج سے بھی تابش میں سوا ہوتا ہے
کسی درویش کے حجرے کا دیا ہوتا ہے

زمیں سے جو تعلق ہے، آسماں سے کہاں
ہوا کے دوش پہ پہنچا ہوں میں کہاں سے کہاں

اب کیا بتاؤں حق جو مرا اِس زمیں پہ ہے
رکھوں قدم کہیں پہ تو پڑتا کہیں پہ ہے

ختم طریقِ مستی کا شاخسانہ ہوئی
غزل بھی جدتِ اظہار کا بہانہ ہوئی

بظاہر شبنم رومانی صاحب اُس بلند مقام پر فائز ہو چکے ہیں جہاں سے حمد اعتراف جاری ہوا کرتی ہیں پھر بھی ڈاکٹر محمد علی صدیقی فرماتے ہیں۔ "شبنم رومانی ہمارے دور کے اُن شعرا میں سے ہیں جن کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی وہ منفرد حسیت ہے جو ہم عصر شعرا کے یہاں خال خال پائی جاتی ہے" ڈاکٹر ستیہ پال آنند کا فرمان ہے "ان کے یہاں روایت کے ساتھ بہت لطیف اور واقعیت پسندانہ سلوک ملتا ہے۔ وہ ماضی اور حال میں سے کسی ایک کے نہ ہو کر رہ جانے کے بجائے اپنی شاعری میں دونوں زمانوں اور حالتوں کے مابین ایک ایسے لمحۂ خود آگہی کی جانب بڑھتے ہیں جو بالآخر عصری حسیت کا حصہ بن جاتا ہے" شبنم رومانی صاحب کے مزاج میں پائے جانے والے حسن کا ایک زمانہ معترف اور کئی نیک گواہ ہیں "دوسرا اجالا" بھی اس کا منہ بولتا ثبوت ہے اور فقط ایک سو پچاس روپے کے عوض مطبوعات اقرار 207 گھڑیالی بلڈنگ کراچی پر آپ کی منتظر ہے۔

خوف کے آسمان تلے

جناب مبین مرزا نے ربع صدی کے تخلیقی سفر کے ثمر "خوف کے آسمان تلے" کو ادبی دنیا سے متعارف کرا کر بڑا کرم اور احسان کیا ہے۔ جناب مبین مرزا کی طرز کے پڑھے لکھے، دور اندیش، دوربین، دانا و بینا لکھنے والے بالخصوص افسانہ کی دنیا میں بڑے کمیاب ہیں۔ اگرچہ "خوف کے آسمان تلے" کی بابت ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، جناب منشا یاد، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر جمیل جالبی، جناب انتظار حسین اور پروفیسر فتح محمد ملک صاحب نے نہایت حوصلہ افزا اور خوش کن اظہار خیال فرمایا ہے مگر پندرہ صفحات پر مشتمل جناب مبین مرزا کا ابتدائیہ اس قدر بسیط، مدلل، جامع اور لائق مطالعہ ہے کہ اُسے بھی ذرا سی توجہ اور طوالت کے ساتھ ایک بڑے تحقیقی مقالے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ "خوف کے آسمان تلے" کی کل گیارہ کہانیوں میں نہ صرف کراچی، پاکستان، برصغیر بلکہ دنیا کے ہر خطے کے انسان کا ماضی، حال اور مستقبل تمام تر اندیشوں، واہموں اور خوش زدیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہ ایک افسانوی مجموعہ نہیں انسانی احساس و جذبات کی ایسی دستاویز ہے جس میں ازل تا ابد انسانیت کے مختلف پہلوؤں، زاویوں اور جہانوں میں بے انسان کی شکلوں سے بھی نقاب اُٹھایا گیا ہے تو کبھی ادھوری شکلوں میں رنگ بھر کے انہیں اُن کے اصلی روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کئی ایسا نازک مقام بھی آئے ہیں جہاں مصنف کو اپنا آپ اور اپنی کیفیت کا دفاع کرنے میں دشواری بھی پیش آتی ہے مگر مصنف کی شفاف خیالی نے ایسے مراحل بھی خوش اسلوبی سے سر کروا دیے ہیں۔ اگر ہم انہیں خواہش کی تکمیل میں جناب مبین مرزا کے افسانوں سے اقتباس یا اُن کے فنی اسلوب کی بابت بیان کردہ آرا سے اختصاری جملے آپ کی نذر کریں تب بھی انصاف ہرگز نہ کر پائیں گے۔ اردو ادب بالخصوص افسانے کے قاری کے لئے "خوف کے آسمان تلے" کا مطالعہ اُسی قدر ضروری ہے جس طرح روز مرہ کی ضروریات لازم ہوا کرتی ہیں۔ تخلیقات کے علاوہ سرورق، طباعت، تزئین، ترتیب ہر چیز میں جناب مبین مرزا کے مزاج کی سلیقگی اور نفاست زیر نظر کتاب کو باوقار بنائے ہوئے ہیں۔ نہایت قیمتی کاغذ پر طباعت شدہ دو صد تیس صفحات کا یہ افسانوی نسخہ صرف دو صد روپے کے عوض اکادمی بازیافت، کتاب مارکیٹ اردو بازار کراچی کی زینت بنا ہوا ہے جسے آپ کی لائبریری کی رونق ہونا چاہئے۔

مجلس چہارسُو

ائرمارشل (ر) اصغر خان صاحب پاکستان کی عسکری اور سیاسی طور پر اس قدر بلند و بالا شخصیت کے حامل ہیں کہ جن پر قومیں جس قدر فخر کریں کم ہے۔ افسوس! ہوتے اس جوہر نایاب کو جس بے دردی اور غفلت سے عدم توجہ کا شکار کیا ہے اُس پر ہماری آنے والی نسلیں مشکل سے ہمیں معاف کر پائیں گی۔ آج کی مجلس میں کوشش کی گئی ہے کہ ائرمارشل صاحب کے سینے میں جس قدر بھی قومی راز محفوظ ہیں اُن پر سیر حاصل گفتگو کر کے قومی امانت کو کم از کم قرطاس پر محفوظ کر لیا جائے۔ شاید مستقبل قریب و بعید میں ہمیں اپنے عمل کی درستگی کے لئے ائرمارشل صاحب کے افکار و خیالات سے رہنمائی کی ضرورت محسوس ہو اور اُس وقت ہماری یہ ادنیٰ کاوش قابل اعتبار ٹھہرائی جائے.....!

گلزار جاوید

☆ آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

☆☆ پیدائش میری جموں کی ہے 1921ء میں۔

☆ آپ کا آبائی تعلق کہاں سے ہے؟

☆☆ صوبہ سرحد کے قبائلی علاقہ میں ایک جگہ کا نام تیراہ ہے وہاں سے قریب ڈیڑھ سو سال قبل ہمارے آبا کشمیر میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔

☆ بزرگ خاندان کی مصروفیات کس نوعیت کی تھیں؟

☆☆ میرے والد صاحب فوج میں ملازم تھے۔ بریگیڈیئر کے رینک سے ریٹائر ہوئے تھے۔

☆ آپ کتنے بہن بھائی ہیں؟

☆☆ بہت بڑی فیملی تھی جی ماشاءاللہ ہم نو بہن بھائی تھے۔ ایک بھائی 1948 کی جنگ میں ائرفورس میں خدمات انجام دیتے ہوئے شہید ہوئے دوسرے بھی ائرفورس کی سروس میں پیرا شوٹ نہ کھلنے کے باعث شہید ہو گئے تھے۔ والدین وفات پا چکے ہیں۔ ہم چار بھائی اس وقت حیات ہیں۔

☆ آپ کی تعلیم و تربیت کہاں اور کن حالات میں ہوئی؟

☆☆ ابتدائی تعلیم میری جموں اور سرینگر میں ہوئی۔ ہم سردیوں میں جموں میں رہتے تھے اور گرمیوں میں سرینگر میں۔ بارہ سال کی عمر تک میں نے یہیں تعلیم حاصل کی۔

☆ ابتدائی تعلیم کے حوالے سے سکول کا نام یاد ہے؟

☆☆ جی ہاں! رنبیر سنگھ ہائی سکول تھا اس کا نام۔

☆ اس کے بعد کہاں تعلیم کے لئے گئے؟

☆☆ ڈیرہ دون ملٹری کالج جو موجودہ بھارت میں ہے تعلیم بارہ سال کی عمر سے اٹھارہ سال کی عمر تک حاصل کی۔ وہ ایک نیم فوجی درس گاہ تھی۔ جس سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج میں جانا لازم نہ تھا۔ اکثر طلبا وہاں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج میں ہی جاتے تھے۔

☆ آرمی فورس سے کب وابستہ ہوئے؟

☆☆ 1939ء میں کمیشن کا امتحان پاس کر کے میں مسلح فوج میں شامل ہوا۔

☆ فضائیہ کا انتخاب آپ کا اپنا تھا یا والدین کی خواہش تھی؟

☆☆ نہیں فضائیہ کے بارے میں میں نے یا والدین نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ دراصل 1939ء میں کمیشن حاصل کرتے ہی جنگ چھڑ گئی اور کمیشن کے فوری بعد ہمیں آرمڈ کور میں جانا تھا۔ اسی دوران انڈین ائرفورس نے والنٹیئر مانگے اور 1940ء میں ہمیں ائرفورس میں بھیج دیا گیا۔

☆ کس شہر میں پوسٹنگ ہوئی تھی آپ کی؟

☆☆ اُس وقت ہمیں پشاور اور کوہاٹ بھیجا گیا تھا جہاں دو سال گزارے اس کے بعد ہمیں برما بھیج دیا گیا جہاں جاپانیوں کے ساتھ لڑائی ہو رہی تھی۔ اس لئے ہمارے سکواڈرن کو وہاں جانا پڑا اور جنگ ختم ہونے تک ہم لوگ وہیں رہے۔

☆ برما کی پوسٹنگ کے دوران کوئی اہم کارنامہ جو آپ نے انجام دیا ہو؟

☆☆ میرے خیال میں اس وقت برما میں ائرفورس کو کوئی اہم معرکہ سر کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

☆ دوران سروس آپ کے ساتھیوں میں اس وقت قومی سطح پر جانے پہچانے لوگ یقیناً ہوں گے؟

☆☆ میرے ساتھیوں میں نور خان تھے۔ ہم دونوں اکٹھے چھ سال ڈیرہ دون سکول میں رہے۔ نور خان مجھ سے ایک سال جونیئر تھے۔ اس کے علاوہ صاحبزادہ یعقوب علی خان بھی ہمارے ڈیرہ دون کے سکول فیلو ہیں اور بھی بہت سے ساتھیوں کے چہرے اور نام اس وقت حافظے میں ابھر رہے ہیں مگر وہ لوگ قومی سطح پر معروف نہیں ہیں۔

☆ دوران ملازمت بغرض ٹریننگ بیرون ملک کب اور کہاں کہاں جانے کا اتفاق ہوا؟

☆☆ مختلف قسم کے کورسز کے لئے تین چار بار یونائیٹڈ کنگڈم جانے کا

اتفاق ہوا ہے پہلی بار برطانیہ فلائنگ لیڈر کے کورس کے لئے میں 1946ء میں گیا تھا اس وقت جیٹ طیارے نئے نئے آئے تھے اور میں نے اسی دوران جیٹ طیارہ اڑانا سیکھا تھا۔

☆ پاکستان کے حوالے سے ایک تاثر یہ عام ہے کہ سرکاری ملازمت بالخصوص "خاکی" میں ایک خاص حد سے اوپر ترقی کسی اور کے اشارے یا منظوری سے ہوا کرتی ہے؟

☆☆ شاید یہ تاثر سول سروس کے بارے میں قائم کیا گیا ہو۔ سول جہاں تک مسلح فورسز کا ہے تو ہمارے دور میں تو اس قسم کا تصور ہی ناممکن تھا۔ افسروں کی مختصر تعداد میں ذہین اور لائق لوگ الگ پہچانے جاتے تھے۔ اس کی مثال میری اپنی ذات ہے کہ میں صرف چھتیس برس کی عمر میں فضائیہ کا کمانڈر انچیف بن چکا تھا۔

☆ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا دور گزرنے کے بعد اس تاثر نے تقویت پکڑی کہ اعلیٰ پائے پر ترقیاں کسی اور کے اشارے پر ہوتی ہیں۔

☆☆ مجھے نہیں معلوم! میں اس بارے میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ائرفورس کی حد تک تو میں اس تاثر کی نفی کروں گا کہ وہاں ترقیاں ہمیشہ میرٹ پر ہوا کرتی تھیں۔

☆ ایوب خان کا مارشل لاء نافذ ہوتے وقت آپ کا عہدہ اور رد عمل کیا تھا اور ایوب خان نے اس کا کیا اثر قبول کیا؟

☆☆ ایوب خان کے وقت میں کمانڈر انچیف تھا ائرفورس کا۔ میں اپنے فرائض ذمہ داری سے نبھا رہا تھا اور حکومتی کاموں سے مجھے کوئی علاقہ نہ تھا۔

☆ ہمارے دریافت کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کے محسوسات کیا تھے کہ جمہوریت کے نام پر حاصل کردہ ملک میں مارشل لاء لگ جانا کس طور مناسب تھا؟

☆☆ دراصل ہم لوگ اپنے کام میں اس درجہ مصروف اور منہمک تھے کہ ہمیں اس جانب توجہ کرنے کی فرصت نہ تھی۔ اس کی ایک وجہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ چودہ اگست 1947ء کو کراچی میں قائداعظم نے ایک ریسپشن دیا تھا۔ سروسز کے چند سینئر لوگ وہاں موجود تھے جن میں میں بھی شامل تھا۔ مجھ سے سینئر کرنل اکبر خان تھے جو بعد میں حکومت گرانے کی سازش میں شریک رہے۔ کہنے لگے چلو قائداعظم سے بات کرتے ہیں۔ اس وقت قائداعظم مہمانوں سے فرداً فرداً مل رہے تھے۔ اکبر خان نے ہمارا تعارف کرایا۔ قائداعظم کو پاکستان بنانے پر مبارکباد دی اور کہا "ہم بہت پرامید تھے کہ پاکستان بننے کے بعد ہم لوگوں کو صحیح طور پر خدمت کا موقع ملے گا مگر ہم بہت مایوس ہیں ابھی بھی انگریز ہم پر مسلط ہے" اشارہ سروسز کے انگریز چیف جنرل گریسی کی طرف تھا۔ انہوں نے انگریزی میں کہا "I thought we would be able to show our inherent native genius" قائداعظم نے جواب میں سختی سے کہا "خبردار! You are servant of people آپ عوام کے خادم ہیں ملازم ہیں ان کے۔ آپ کو کوئی حق نہیں ہے حکومتی معاملات میں دخل دینے کا آپ کو عوام کے نمائندوں کا حکم ماننے کے علاوہ کسی کام میں دخل نہیں دینا ہے" قائداعظم کے ارشادات اس وقت بھی میرے پیش نظر تھے اسی باعث میرا ایوب خان کے مارشل لاء سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا۔ میں ذاتی طور پر مارشل لاء کے نفاذ کو غلط تصور کرتا ہوں۔ میری طرف سے مارشل لاء کے حق میں کوئی تحریر یا عمل کبھی جاری نہ ہوا۔

☆ آپ کے دور میں فضائیہ نے کس قسم کی پیشہ ورانہ ترقی کے منازل طے کئے اور اس کا تسلسل کب تک برقرار رہا؟

☆☆ یقیناً اس تسلسل کو ابھی بھی برقرار رہنا چاہئے۔ 1965ء کی جنگ میں پاک فضائیہ کی کارکردگی پیشہ ورانہ ترقی کی بہترین مثال ہے۔ میں ایک واقعہ بتاتا ہوں آپ کو 1965ء کی جنگ سے قریب ڈیڑھ ماہ پہلے میں فضائیہ سے ریٹائر ہو کر PIA میں چلا گیا تھا۔ جنگ کے قریب چوتھے روز میں راولپنڈی کے ہوائی اڈے پر تھا کہ ایک پرواز کو میں نے کراچی جاتے دیکھا۔ مسافر جہاز کی طرف جا رہے تھے مگر ائر ہوسٹس کوئی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے جہاز کے کپتان سے دریافت کیا کہ کوئی ائر ہوسٹس نظر نہیں آ رہی؟ کپتان نے کہا "آپ جانتے ہیں کہ ہم بھارت سے جنگ لڑ رہے ہیں۔ خطرے کے باعث عورتوں کو پرواز سے الگ کیا گیا ہے" میں نے کہا! "آپ کے خیال میں خطرہ ہے تو PIA پرواز کیوں اڑا رہی ہے کیا اس میں سفر کرنے والے مسافروں کی جانوں کو خطرہ نہیں ہے۔ اگر PIA کی پرواز اس قدر غیر محفوظ ہیں تو اس میں کون سفر کرے گا۔ بالکل کوئی خطرہ نہیں ہے آپ نے دیکھا نہیں جنگ کے چار دنوں میں کسی بھارتی طیارے کو پاکستان کی فضائی حدود میں داخل ہونے کی جرأت نہیں ہوئی۔" میں نے اسی وقت فلائٹ ایک گھنٹہ لیٹ کرا کر ائر ہوسٹس کو بلوایا اور انہیں PIA کی اسی فلائٹ کے ساتھ کراچی بھیجا۔

☆ ائر مارشل صاحب! 1965ء میں آپ اس قدر پُراعتماد تھے۔ خدانخواستہ کبھی پھر کوئی آزمائش درپیش ہو جاتی ہے تو مسلح افواج خصوصاً فضائیہ سے کس قسم کی امید باندھی جا سکتی ہے؟

☆☆ حالانکہ میرا اب براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہے مگر مجھے امید ہے کہ آزمائش کی کسی بھی گھڑی میں فضائیہ کی کارکردگی ویسی ہی ہوگی جیسی 1965ء کی جنگ میں تھی۔

☆ ہم مسلح افواج کا لفظ استعمال کر رہے ہیں اور آپ فضائیہ کا؟

☆☆ مسلح افواج کی بابت میری معلومات بھی اتنی ہی ہیں جتنی بطور شہری آپ کی ہیں۔ اس لئے وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے البتہ بہتری کی امید

اُن سے بھی قائم و دائم ہے۔

☆ 1965ء کی جنگ سے صرف چھ ماہ قبل آپ کی ریٹائرمنٹ آپ کو منظر سے ہٹانے کی سازش بھی تصور کی جاتی ہے کہ آپ! اس منظر نامہ میں مکمل طور پر فٹ نہ تھے؟

☆☆ ہو بھی سکتا ہے مگر میں نے بطور چیف اپنے آٹھ سال مکمل کر لئے تھے۔ جب میں نے چار سال مکمل کئے تو ایوب صاحب نے مجھے کہا "ابھی آپ بہت کم عمر ہیں لہٰذا آپ کو ابھی سروس جاری رکھنا چاہئے۔" سو میں نے مزید چار سال کے لئے حامی بھر لی۔ جب بطور چیف میرے سات سال ہوئے تو ایوب خان نے مجھے پھر بلایا اور کہا "ابھی آپ کی عمر بہت کم ہے آپ کو سروس جاری رکھنا چاہئے۔" میں نے کہا اب اتنی بھی کم نہیں ہے آٹھ سال تو ہو ہی گئی ہے لہٰذا میرا اب جانا مناسب ہے۔

☆ اس کا مطلب یہ ہے کہ ریٹائرمنٹ آپ کا ذاتی فیصلہ تھا؟

☆☆ میرا ذاتی فیصلہ تو نہیں تھا ایوب خان کا فیصلہ تھا۔ ایک بات ضرور ہے 1965ء کی جنگ کا باعث بننے والا آپریشن جبرالٹر کے نام سے مشہور کا جو واقعہ ہوا اُس کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔ حالانکہ میں افواج کا سربراہ تھا اور مجھے اس طرح کے واقعہ کا علم ہونا چاہئے تھا جس کے باعث بھارت نے ہم پر حملے کا فیصلہ کیا مگر یہ بات مجھ سے اور فضائیہ سے پوشیدہ رکھی گئی۔ یہ خالصتاً فوج کا فیصلہ تھا۔ میں نے اخبارات میں اس واقعہ کی بابت اگست 1965ء میں جب پڑھا تو ایوب خان سے ملنے کے لئے وقت مانگا۔ اگست میں مانگے گئے وقت کے جواب میں تین ستمبر 1965ء کا وقت دیا گیا۔ میں نے ایوب خان سے کہا کہ "آپ نے بھارت سے جنگ کا فیصلہ کر لیا ہے؟" جواب میں ایوب خان نے کہا "تم سے کس نے کہا؟" ایوب خان بولے! "نہیں آپ کے خدشات غلط ہیں۔ مجھے وزارت خارجہ نے یقین دہانی کرائی ہے کہ بھارت ایسی حماقت نہیں کرے گا۔" اس سے آپ جو نتیجہ چاہیں اخذ کر لیں میں مزید کچھ نہیں کہوں گا۔

☆ آپ کے خیال میں فارن آفس کی یقین دہانی کی بنیاد کیا تھی۔ کیا اس میں بیرونی عوامل بھی کارفرما تھا؟

☆☆ نہیں۔ بیرونی عوامل کا کوئی دخل نہ تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو، عزیز احمد خان اور وزارت خارجہ کی اپنی Assessment تھی۔ اُن کی یقین دہانی کی بنیاد کی بابت میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

☆ اس کا مطلب یہ ہے کہ بھٹو صاحب، عزیز احمد صاحب اور وزارت خارجہ کی Assessment غلط تھی؟

☆☆ بالکل غلط بلکہ احمقانہ تھی۔ یہی حماقت ہم نے دوبارہ مشرقی پاکستان میں دہرائی جس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

☆ ائر مارشل صاحب یہ فرمائیے! آپ کے خیال میں کوئی طریقہ ایسا تھا جس کو استعمال میں لا کر 1965ء کی جنگ سے بچا جا سکتا تھا؟

☆☆ یقیناً! ہماری جانب سے مقبوضہ کشمیر میں ہلچل نہ ہوتی تو بھارت کو حملے کا جواز نہ ملتا۔

☆ آپ کس کو اس جنگ کا ذمہ دار گردانتے ہیں؟

☆☆ ایوب صاحب اور وزارت خارجہ کو میرے جیسے آدمی جس کا فارن افیئر سے کوئی تعلق نہ تھا پھر بھی میرے خدشات کے صرف تیسرے دن جنگ شروع ہو گئی تو یقین دہانی کرانے اور قبول کرنے والوں کے علاوہ اس حماقت کا کون ذمہ دار ہو سکتا ہے۔

☆ 1965ء کی جنگ کے صرف چھ سال بعد مشرقی پاکستان کا سانحہ رونما ہو جاتا ہے۔ آپ اسے اندرونی اور بیرونی عوامل سے کس طرح جوڑیں گے۔

☆☆ میرے خیال میں بیرونی عوامل کا قطعاً کوئی دخل نہ تھا۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ ہمارے سیاستدان، افسر شاہی بلکہ عوام بھی بنگالیوں کو زیادہ پسند نہ کرتے تھے کیونکہ اُن کی سوچ ہماری نسبت زیادہ جمہوریت پسند ہے۔ میرے خیال میں ہمارے ساتھ حکمرانوں نے بنگالیوں سے پیچھا چھڑانے کا فیصلہ پہلے سے کیا ہوا تھا۔ میں نے خود 1971ء کی جنگ کے دوران تین چار بار مشرقی پاکستان کا دورہ کیا تھا۔ وہ لوگ میرے کاندھے پر سر رکھ کے روتے تھے۔ میں وہاں مجیب الرحمٰن اور دیگر سیاسی لوگوں سے مل کر یہاں واپس آیا اور کوشش کی پنجاب اور ملک کے دیگر علاقوں کا دورہ کر کے انہیں قائل کروں کہ بنگالی علیحدگی پسند نہیں ہیں مگر لوگ اُس وقت کچھ سننے کو تیار ہی نہ تھے۔

☆ یہاں یہ تاثر درست نہ ہو گا کہ اُس وقت کے کچھ بڑوں کا ملک کی تقسیم پر خاموش اتفاق ہو چکا تھا؟

☆☆ بالکل ہو چکا تھا، ذوالفقار علی بھٹو اور یحییٰ خان یہ دو لیڈر تھے اس وقت مغربی پاکستان سے جن کے ہاتھ میں اختیار یا عوامی نمائندگی کا علم تھا۔

☆ مجیب الرحمٰن اور مولانا بھاشانی کے گٹھ جوڑ کی بابت کیا کہیں گے آپ؟

☆☆ میرے خیال میں انہیں اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ وہ تو اپنے حقوق مانگتے تھے۔ مجیب الرحمٰن نے ایک بار مجھ سے خود یہ گلہ کیا کہ "آپ لوگ ہمیں انسان نہیں سمجھتے۔ میں نے کلکتہ سے دہلی تک سائیکل پر سفر کر کے پاکستان کے حق میں مہم چلائی ہے اور آج آپ ہمیں مار مار کر الگ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔" میں اس امر کا گواہ ہوں کہ مجیب الرحمٰن نے یحییٰ خان سے کہا تھا کہ "آپ منتخب سیاسی لیڈروں کی کانفرنس بلائیں میں اس میں آپ کو خراج تحسین پیش کروں گا الیکشن کرانے پر اور آپ کو صدر بنانے کی سفارش بھی کروں گا۔" اس پر یحییٰ خان نے کہا "تمہارے چھ نکات کا کیا ہو گا؟" مجیب الرحمٰن نے

جواب میں کہا "جس طرح آپ لوگ ووٹ حاصل کرنے کے لئے عوام سے جھوٹے سچے وعدے کرتے ہیں اسی طرح میں نے بھی ووٹ حاصل کرنے کے لئے یہ نکات نکالے ہیں کیونکہ اب میں عوام کی اکثریت کا منتخب نمائندہ ہوں اس لئے وزیر اعظم بننا میرا حق ہے۔ آپ چھ نکات کی فکر نہ کریں انہیں میں درست کر لوں گا" سو میرے عزیز! ہم نے بڑی محنت کر کے پاکستان توڑا ہے۔ یہ ٹوٹنا نہیں تھا اس کے لئے ہم نے بڑی محنت کی ہے۔ ہم لوگ بنگالیوں کو انسان نہیں سمجھتے تھے۔ سارا کیا دھرا ہمارا اپنا ہے۔

☆ آپ کے خیال میں مجیب الرحمٰن کے چھ نکات میں کس قدر سچائی اور حقیقت تھی؟

☆☆ کچھ سچائی بھی تھی کچھ حقیقت بھی تھی۔ وہ اپنے داخلی معاملات خود چلانا چاہتے تھے۔ جو آئین میں آج بھی تحریر ہے۔ میں نے کہا! وہ یعنی مجیب الرحمٰن چھ نکات کو بھی لئے پر آمادہ تھا اگر ہم انہیں انسان گردانتے ہوئے ان کے حقوق انہیں دے دیتے۔ میرے خیال میں انہیں ایڈجسٹ کیا جا سکتا تھا بشرطیکہ ہم چاہتے مگر.....!

☆ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مستقبل میں پاکستان اور بنگلہ دیش کنفیڈریشن کی طرز کا کوئی اتحاد یا اتفاق پر مبنی رشتہ قائم کر لیں گے؟

☆☆ قریب پانچ چھ سال پہلے میں بنگلہ دیش گیا تھا اور وہاں ایک پبلک فورم پر میں نے کنفیڈریشن کی تجویز پیش کی تھی مگر ان کی جانب سے کسی مثبت رویہ کا اظہار نہ ہوا۔ وہ لوگ آزادی کے بعد بہت خوش ہیں۔ بڑی بار کہاں ہے انہوں نے ہم سے مل نہیں سمجھتا کہ ان حالات کی روشنی میں ہمارے اور بنگلہ دیش کے درمیان کنفیڈریشن طرز کا کوئی رشتہ قائم ہو سکے۔ مجھے افسوس ہے کہ پیپلز پارٹی کی سوچ ابھی تک نہیں بدلی۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہ لوگ اپنی غلطی تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ ایک ملک میں دو وزیر اعظم کا نظریہ پیش کر کے پاکستان کی نفی تو انہوں نے کی تھی۔ میں اس وقت اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ ان کی غلطیوں کا سد باب کر سکوں مگر میری خواہش بڑی تھی کہ میں پاکستان کو ٹوٹنے سے بچاؤں۔

☆ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے تھوڑے عرصہ بعد آپ بہت بڑے اتحاد کے روح رواں اور ملک کے اہم لیڈر بن جاتے ہیں۔ کیا یہ مناسب نہ تھا کہ پاکستان کے دولخت ہوتے وقت آپ سیاسی پارٹیوں کا اتحاد تشکیل دے کر علیحدگی پسندوں کے آگے دیوار بن جاتے؟

☆☆ اس وقت کی جو سیاسی قوت تھی مغربی پاکستان کی وہ پیپلز پارٹی تھی اور وہی پاکستان کو دولخت کرنے کی ذمہ دار تھی۔ میں کس کے ساتھ اتحاد بناتا اور کس کے خلاف بناتا اور اتحاد جو بنتے ہیں ان کے لئے فضا حالات سازگار کرتے ہیں یہ خود بخود وجود میں نہیں آتے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حماقتوں، جبر اور ظلم کے نتیجے میں قومی اتحاد وجود میں آیا تھا۔

☆ کیا یہ تاثر درست ہے کہ فوج کی اعلیٰ قیادت سیاستدانوں کو حکومت کا اہل نہیں سمجھتی اور اسی سوچ کے رد عمل میں قوم کو بار بار کے مارشل لاء کا سامنا ہوتا ہے؟

☆☆ جی بالکل! میں اس تاثر کو درست گردانتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ بہت سے سیاستدانوں نے اپنے عمل سے اس تاثر کو درست ثابت کیا ہے۔ یہ جو جرنیل ہوتے ہیں یہ بہت پڑھے لکھے اور قابل ہوتے ہیں۔ بہت سے امتحانوں اور ٹیکنیکل و انٹرنیشنل کورسز سے گزر کر اس مقام تک پہنچتے ہیں۔ ظاہر ہے جب سیاستدان پے در پے غلطیوں کے مظاہر کریں گے تو اقتدار کی فطری خواہش ان پر بھی غالب آئے گی۔

☆ اس فطری خواہش میں فضائیہ اور بحریہ کس تناسب سے شریک ہوتی ہیں؟

☆☆ میرے خیال میں طاقت کا توازن اس قدر ان کے حق میں نہیں ہوتا کہ وہ اس طرح کی خواہشات میں کوئی اہم کردار ادا کریں یا اس قسم کی خواہش میں براہ راست شریک ہوں۔

☆ اعلیٰ عسکری قیادت کا بار بار حکومتی امور میں ملوث ہونا اور ہر وقت حکومت کی طرف بڑھ جانے میں مصروف رہنا ہمارے دفاعی نظام کے ضعف کا باعث نہیں بن رہا؟

☆☆ اس سے پیشہ ورانہ حیثیت بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ جب ہر وقت اقتدار میں رہنے اور اقتدار کو مستحکم رکھنے کے خواب دیکھے جائیں گے تو اس کی کوئی نہ کوئی قیمت تو ادا ہی کرنی پڑے گی۔ ہم جب ہیروز میں تھے تو ہمیں خواب بھی اس طرح کے آتے تھے کہ کس طرح جہاز اڑتا ہے کس طرح اپنی استعداد بڑھائی جائے تو میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ بہت Devotion کا کام ہے ذرا سی کوتاہی یا غفلت کبھی کبھی سنگین نتائج کا باعث بھی بن جاتی ہے۔

☆ فوج کے سر پر ڈاؤن سائزنگ کا جو دباؤ ہے اس کی بابت آپ کی رائے کیا ہے؟

☆☆ میں نہیں سمجھتا کہ فوج پر اس قسم کا کوئی دباؤ ہے البتہ! میں تو بہت پہلے اپنی کتاب میں تحریر کر چکا ہوں کہ ہمیں اتنی بڑی فوج کی قطعاً ضرورت نہیں۔ دنیا کی پانچویں بڑی فوج ہے ہمارے پاس لہٰذا اس میں کمی ضرور ہونا چاہئے۔ اسے Re-organize ہونا چاہئے کیونکہ ہم ایٹمی طاقت بھی ہیں اس لئے ہمیں اتنی بڑی فوج کی ضرورت نہیں ہے۔

☆ کیا تناسب ہونا چاہئے کمی کا آپ کے خیال میں؟

☆☆ میں سمجھتا ہوں فوج کے موجودہ اخراجات میں چالیس فیصد تک کمی کی گنجائش ہے۔

☆ اس طرح ہمارا دفاعی نظام متاثر ہونے کا اندیشہ ہوگا؟

☆☆ میں نے عرض کیا! ضرورت فوج کو Re-organize کرنے کی ہے۔ ہمیں Territorial فوج کی ضرورت ہے جیسے اسرائیل میں ہے۔ ہمارے فوجی بہت کم عمر میں ریٹائر ہو جاتے ہیں لہٰذا ہمیں ایک ریزرو فورس ترتیب دینا چاہئے جہاں ریٹائر ہونے والے فوجی مزید دس پندرہ سال خدمات انجام دے سکیں۔

☆ سیاست میں آنے کا فیصلہ کب اور کیوں کیا۔ اس کا سبب تو جوانی کی ریٹائرمنٹ کا صرف تو نہیں؟

☆☆ میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا سیاست میں آنے کا نہ کوئی منصوبہ بندی کی تھی۔ میری ریٹائرمنٹ کے بعد جب بھٹو صاحب حکومت سے الگ ہوئے تو وہ میرے پاس آئے کہ "ایوب خان نے مجھے گرفتار کرنے اور مارنے کا پورا منصوبہ تیار کر لیا ہے" جس پر میں نے ان سے کہا "مانا تو دور کی بات ہے اگر وہ تمہیں گرفتار بھی کرتے ہیں تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہیں حق ہے جو لکھنا چاہتے ہو لکھو" حالانکہ میں ان دنوں ایبٹ آباد میں ریٹائرمنٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ بھٹو صاحب کے خدشات درست نکلے قریب دو ہفتوں بعد انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ میں پھر لاہور گیا اور میں نے پریس کانفرنس کی جس میں بھٹو صاحب کی گرفتاری کی مذمت کی وہ "نوائے وقت" اور ایک دو اور اخبارات میں کور ہوئی۔ عوام میں اس سے بڑا جوش آیا اسی دوران ہائی کورٹ بار نے مجھے خطاب کی دعوت دی اس کے بعد مجھے مختلف فورم سے خطاب کے دعوت نامے آنے لگے اور میری آمد و روانگی کے جلوس بننے لگے اس طرح میں سیاست میں خود بخود کھنچ گیا۔

☆ اس کا یہ مطلب ہے کہ اس وقت بھٹو صاحب کی حمایت میں آپ کو جو شہرت ملی اس لطف کے زیر اثر آپ سیاست سے منسلک ہو گئے؟

☆☆ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے بات لطف کی نہیں ہے حق سچ کی ہے آپ کو شاید یاد ہو کہ میں نے اس زمانے میں ایک سلسلہ مضامین کا بھی شروع کیا تھا۔ میں جو درست سمجھتا تھا اس کا اظہار کر دیا کرتا تھا۔ میرے خیال میں اس وقت فوج جو کچھ کر رہی تھی وہ ٹھیک نہیں تھا۔

☆ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت آپ بھٹو صاحب کو درست خیال کرتے تھے؟

☆☆ بھئی سیدھی سی بات ہے ایک شخص جمہوریت کی بات کر رہا ہے تو آپ اسے کس طرح غلط کہہ سکتے ہیں۔ میں نے جس قدر بھی بھٹو صاحب کی حمایت کی وہ آزادی اظہار اور جمہوری قدروں کی سربلندی کے لئے کی۔ مجھے مستقبل کی بابت علم تو نہیں تھا کہ یہ شخص پاکستان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔

☆ ملک میں بے شمار پارٹیوں کی موجودگی میں "تحریک استقلال" آپ نے کس جذبے اور پلاننگ کو مد نظر رکھ کر بنائی؟

☆☆ جب آپ باقاعدہ کسی شعبے سے منسلک ہوتے ہیں تو آپ کے ذہن میں اس کی ترتیب و تنظیم کا اپنے ذہن کے مطابق پروگرام ہوتا ہے۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے اپنی ترجیحات کے پیش نظر نئی سیاسی جماعت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے تحریک استقلال کی داغ بیل ڈالی۔

☆ آپ کی ملک گیر شہرت کے پیش نظر کسی سیاسی پارٹی نے آپ کو شمولیت کی دعوت نہ دی؟

☆☆ بہت سی جماعتوں نے پیشکش کی تھی اس وقت قیوم خان خود چل کر میرے پاس آئے تھے۔ جب میں نے ان کو بتایا کہ میں آپ کے ساتھ نہیں آ سکتا کیونکہ آپ کے ساتھ بہت سے ناپسندیدہ لوگ بھی شامل ہیں تو وہ بولے "پھر کیا کرو گے؟" میں نے کہا "میں اپنی سیاسی جماعت بنا رہا ہوں۔" انہوں نے دریافت کیا "کون لوگ شامل ہوں گے آپ کے ساتھ" جواب میں میں نے کہا "جو لوگ بھی ہوں گے جتنے بھی ہوں گے اچھے ہوں گے۔" قیوم خان نے ہاتھ کی انگلیوں کو قریب کرتے ہوئے کہا "پھر تو بہت چھوٹی پارٹی ہوگی۔" مجھے آج بھی قیوم خان کی وہ بات یاد ہے کہ میں پھر اسی طرف چل پڑا ہوں "پیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ" بنا کر قوم نے بہت مار کھائی ہے جھوٹے وعدوں اور نعرہ بازوں سے شاید اب عقل آ گئی ہو۔

☆ اس قدر محنت اور جستجو سے بنائی گئی "تحریک استقلال" کو آپ نے خیرباد کیوں کہہ دیا؟

☆☆ میں نے اس سے قبل بھی کئی بار صدارت چھوڑی ہے پارٹی کی۔ پارٹیاں آسمانی صحیفہ نہیں ہوتیں۔ عوام تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہیں اصل چیز آپ کا نصب العین اور پروگرام ہوا کرتا ہے جماعت کا نام بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

☆ یہ جو آپ کی موجودہ سیاسی پارٹی ہے "قومی جمہوری محاذ" اس سے آپ کو کیا توقعات ہیں۔ کیا آپ اس پلیٹ فارم سے ملک و قوم کی مفید خدمت انجام دے سکتے ہیں؟

☆☆ اس وقت جو حالات ملک کے ہیں اس میں کسی بھی سیاسی جماعت سے زیادہ توقعات نہیں باندھی جا سکتیں البتہ ہم خیال لوگوں کا مل بیٹھنا اور بہتری کی بابت غور و فکر کرنا بھی اپنی جگہ اہم ہے۔ میں نے ایک بڑے سیاستدان سے دریافت کیا کہ آج کل آپ کس پارٹی کے ساتھ ہیں تو وہ فرمانے لگے کہ میں تو فوج کی پارٹی کے ساتھ ہوں۔ اب اس سوچ کی موجودگی میں قوم کس سے توقعات باندھے اور کیا توقعات باندھے۔ اس مقام تک پہنچانے والے بھی سیاستدان ہیں۔ ایک بڑی پارٹی نے پاکستان کو دولخت کیا دوسری بڑی پارٹی نے عدلیہ پر حملہ کرائے کہاں جائیں کس کو دہائی دیں۔

☆ ایک زمانہ میں بڑی طاقت کے اشیر باد سے آپ کو بھٹو صاحب کا نعم البدل ٹھہرایا جا رہا تھا۔ آپ اس تاثر کی بابت کیا کہنا پسند کریں گے؟

☆☆ ہم نے کوئی تاثر قائم نہیں کیا نہ کسی سے جھوٹے وعدے کئے ہم اُن لوگوں میں سے نہیں جو عوام کو ورغلا کر اقتدار قبضے میں کرنا چاہتے ہیں۔

☆ ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بھٹو صاحب کے بعد آپ کے اقتدار میں آنے کی خبریں عام تھیں۔ اسی باعث جوق در جوق لوگ آپ کی پارٹی میں شامل ہو رہے تھے؟

☆☆ یقیناً 1979ء کے الیکشن آزادانہ اور منصفانہ ہو جاتے تو کوئی طاقت ہمیں اقتدار میں آنے سے نہ روک سکتی مگر ضیاالحق صاحب نے درمیان میں آکر سارا پروگرام خراب کر دیا۔ ہم اتحاد کی شکل میں برسر اقتدار آسکتے تھے۔ تحریک استقلال کا انفرادی حیثیت میں برسر اقتدار آنا ممکن نہ تھا۔

☆ آپ ضیاالحق صاحب کو مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں۔ وہ آپ ہی کے خط میں دی گئی دعوت پر تشریف لائے تھے!

☆☆ آپ نے میرا خط پڑھا ہے؟

☆ جی! آپ کا وہ خط ہماری نظر سے گزرا ہے۔

☆☆ دوبارہ پڑھیے! میں نے کسی کو مارشل لاء لگانے کی کوئی دعوت نہیں دی۔ میں نے اُس خط میں یہ کہا تھا کہ میں کوٹ لکھپت جیل میں تھا میں نے اخبار میں پڑھا کہ ایک لڑکا موٹر سائیکل پر جا رہا تھا۔ راستے میں اُس نے آرمی کو دیکھ کر V کا نشان بنایا جس پر ایک میجر نے اُسے گولی مار دی۔ اُس کے جواب میں میں نے فوج کو خط لکھا کہ یہ شرم کی بات ہے آپ کا یہ کام نہیں جو آپ کر رہے ہیں کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں سروس کے دوران کم از کم دو مرتبہ غلط حکم ماننے سے انکار کیا ہے اسی لئے میں اس عمل کو ہمیشہ برا سمجھتا ہوں۔

☆ مثلاً کب کب؟

☆☆ 1942ء میں ائر فورس میں حیدرآباد سندھ میں ہم لوگ تعینات تھے۔ اُس وقت سندھ میں مارشل لاء لگا ہوا تھا۔ پیر صاحب پگارا کے والد محترم نے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کیا ہوا تھا۔ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر انگریز جنرل تھا رچرڈسن وہ ہمارے بیس پر آیا اُس وقت ہمارے پاس چار جہاز تھے۔ میرا کمانڈر روم پرکاش مہرہ جو بعد میں انڈین ائر فورس کا کمانڈر انچیف اور ریٹائرمنٹ کے بعد مہاراشٹر کا گورنر بنا میں اُس کا نمبر دو تھا۔ انگریز جنرل نے کہا "ہمیں اطلاع ملی ہے کہ پیر پگارا کا قافلہ شرق کی طرف سانگھڑ سے دس میل دور گزرے گا۔ فوری طور پر آپ لوگ اُسے اڑا دیں۔" یہ پہلی مرتبہ اطلاع ملی تھی برٹش گورنمنٹ کو پیر پگارا کے قافلے کے گزرنے کی۔ کمانڈر نے مجھے حکم دیا کہ تم چاروں جہاز لے کر جاؤ اور اُس قافلے کو اڑا دو۔ ہم نے پرواز کیا اور سانگھڑ کے قریب دس بارہ اونٹوں، خواتین اور بچوں پر مشتمل قافلہ ہمیں نظر آگیا۔ جہازوں کی آواز سن کر قافلے میں بھگدڑ مچ گئی۔ کوئی جگہ سر چھپانے کی انہیں دستیاب نہ تھی۔ میں نے جب یہ صورت حال دیکھی تو میرا دل گوارا نہ ہوا نہتے اور مجبور لوگوں پر گولی چلانے کے لئے میں نے اپنے ساتھیوں کو واپس چلنے کا حکم دیا۔ ائر بیس پر انگریز جنرل ہمارا منتظر تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی بولا! "کیا ہوا؟" میں نے کہا "کچھ نہیں" بولا! "کیوں؟" میں نے کہا "یہ ہمارا کام نہیں ہے کوئی قانون ہمیں مجبور و نہتے لوگوں پر گولی چلانے کے لئے نہیں کہتا۔" فوری طور پر سندھ کے ائر بیس سے ہمارا بوریا بستر گول کر کے ہمیں کوہاٹ پہنچا دیا گیا۔ میں نے زبانی جمع خرچ کبھی نہیں کیا جو کیا کر کے دکھایا۔ جب بھی بھٹو کے وقت پولیس ہمیں روکتی تھی میں اُن سے یہی کہتا تھا کہ آپ لوگ یہ کیا کر رہے ہیں۔ یہ آپ کا کام نہیں ہے میں نے خط میں صرف غیر آئینی حکم نہ ماننے کی بات کی تھی مارشل لاء لگانے یا حکومت پر قابض ہونے کی دعوت ہرگز نہیں دی تھی۔

☆ ائر مارشل صاحب! اس الزام میں کہاں تک حقیقت ہے کہ بھٹو صاحب سے مذاکرات میں ہونے والی پیش رفت کو آپ Sabotage کر دیا کرتے تھے!

☆☆ بالکل غلط الزام ہے یہ بات یہ ہے کہ مجھے مولانا شاہ احمد نورانی اور سردار شیر باز مزاری کو قومی اتحاد میں Hard Liner تصور کیا جاتا تھا۔ لہٰذا ہارڈ لائنر کو جیل میں رکھا گیا اور Soft Liner کو سہالہ لا کر مذاکرات کی دعوت دی گئی۔ ہمیں بعد میں سہالہ لایا گیا۔ سہالہ میں موجود ہمارے ساتھیوں نے ہم سے کہا کہ ہمیں مذاکرات کی دعوت دی گئی ہے آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔ ہم نے کہا نہیں مذاکرات ہونا چاہئے یہ ایک حل ہے ڈیڈ لاک کو ختم کرنے کا۔ اب ہوا یہ تھا کہ مذاکراتی ٹیم کوئی ایسی بات مان کر آئی تھی جو ہماری نظر میں غلط ہوتی تھی اُسے ہم نہیں مانتے تھے۔

☆ مثلاً؟

☆☆ مثلاً یہ کہ ہمارا مطالبہ تھا کہ نئے انتخاب قومی اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمود اور وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی نگرانی میں ہونا چاہئیں تاکہ دھاندلی کا سدباب ہو سکے۔ مذاکراتی ٹیم یہ بات مان آئی کہ انتخابات بھٹو صاحب کی نگرانی میں ہوں گے۔ ہمارا اعتراض یہ تھا کہ جہاں وزیر اعظم اور وزراء اعلیٰ کے خلاف کسی کو الیکشن لڑنے کی اجازت نہ ہو جہاں اُن تمام مخالف اُمیدواروں کو اغوا یا گرفتار کر لیا جاتا ہو وہی لوگ کس طرح منصفانہ انتخابات کرا سکتے ہیں؟ یہ بات بھی ریکارڈ پر ہے کہ بھٹو صاحب نے کابینہ کی میٹنگ میں اس بات پر غور کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ ضیاالحق اُس میٹنگ میں موجود تھے۔ فوری طور پر ضروری کام کا بہانہ کر کے چلے گئے اور جاتے ہی انہوں نے مارشل لاء نافذ کر دیا کیونکہ سب کچھ پہلے سے طے تھا۔

☆ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ضیاالحق صاحب اگر مداخلت نہ کرتے تو

مذاکرات کامیاب ہو جاتے؟

☆☆ میں سمجھتا ہوں بہت اچھا چانس تھا مذاکرات کے کامیاب ہونے کا۔

☆ آپ مذاکرات کی ناکامی کا ذمہ دار کسے ٹھہرائیں گے۔

☆☆ ضیاالحق کو اور کسے وہ شخص انتہائی جھوٹا اور وعدہ خلاف تھا۔

☆ بھٹو صاحب کو دی جانے والی سزا کی بابت اس وقت آپ کی کیا رائے تھی اور آج کیا رائے ہے؟

☆☆ اُس وقت بھی اُسے نا انصافی سے تعبیر کیا گیا تھا آج بھی میری یہی رائے ہے کہ جس طریقے سے عدلیہ میں بھٹو مخالف اکثریت حاصل کی گئی اور پھانسی کا فیصلہ سنایا گیا وہ سراسر غلط ہے اور میں اسے بھٹو کے ساتھ زیادتی تصور کرتا ہوں۔

☆ 1977ء میں بھٹو صاحب کے خلاف چلنے والی تحریک واقعی تحریک نفاذ نظام مصطفےٰ تھی یا کوئی بلیک میلنگ؟

☆☆ نہیں کوئی بلیک میلنگ ہرگز نہ تھی۔ سیاسی جلسوں اور جلوسوں میں نعرہ بازی ہوا کرتی ہے یہ بھی ایک اسلامی اختراع تھی جس سے کون انکار کر سکتا ہے ہر کسی کا نظام مصطفےٰ کا تصور الگ ہے عام آدمی کے نزدیک یہی انصاف سے عبارت ہے جبکہ صالح یا عالم دین کے نزدیک پانچ وقت کی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ نظام مصطفےٰ ہے۔ میرے نزدیک نظام مصطفےٰ مولوی کی اجارہ داری سے مشروط نہیں ہے ہر آدمی کا اپنا اپنا تصور ہے۔

☆ چلئے! اس سوال کو اس طرح لیتے ہیں کہ آپ لوگ اس وقت برسر اقتدار آ جاتے تو کیا عوام کو انصاف فراہم کر دیتے؟

☆☆ میں نہیں سمجھتا کہ یہ اتحاد زیادہ پائیدار ثابت ہوتا یا زیادہ دیر ہم لوگ اکٹھے حکومت کر پاتے۔

☆ سنا ہے جنرل ضیاالحق نے آپ کو وزیر اعظم بنانے کا وعدہ کر کے مارشل لاء نافذ کیا تھا؟

☆☆ یہ سراسر جھوٹا اور لغو پروپیگنڈہ ہے۔

☆ پھر وہ آپ کو منانے ایبٹ آباد کیوں گئے تھے؟

☆☆ ضیاالحق مجھے منانے نہیں بلکہ میری پارٹی سے حکومت میں شامل کرنے کے لئے دو تین آدمی مانگنے آئے تھے۔

☆ آپ نے کیا جواب دیا تھا؟

☆☆ میں نے کہا آپ نے تو الیکشن کرانے کا وعدہ کیا تھا اب آپ حکومت بنانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ ضیاالحق کو خاموش دیکھ کر میں نے کہا معلوم ہوتا ہے آپ کا ارادہ بدل گیا ہے۔ جواب میں ضیاالحق نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا "الحمد للہ میں مسلمان ہوں اور میں نے الیکشن کرانے کا جو وعدہ قوم سے کیا ہے وہ میں ضرور پورا کروں گا اگر میں ایسا نہ کر سکا تو آپ عوام میں جا کر بے شک مجھے جھوٹا اور بے ایمان کہیے گا"

☆ بات الیکشن کی ہو رہی تھی یا نوے دن میں الیکشن کرانے کی ہو رہی تھی؟

☆☆ میرا خیال ہے نوے دن کی مدت گزر گئی تھی اس کے بعد جلد الیکشن کرانے کی بات کر رہے تھے وہ اس کے بعد میں رہا ہوا اور میں نے چوک یادگار پشاور میں پبلک میٹنگ میں ضیاالحق کو جھوٹا اور بے ایمان کہا جس پر مجھے گرفتار کر لیا گیا حالانکہ میں نے وہی کہا تھا جو ضیاالحق مجھ سے کہہ گئے تھے۔ اتفاق سے گوہر ایوب کی بیٹی کی شادی میں ضیاالحق سے آمنا سامنا ہوا تو ایک صاحب نے مجھے جنرل ضیاالحق سے ملاتے ہوئے کہا یہ ائر مارشل اصغر خان ہیں۔ "ہاں ہاں! میں انہیں جانتا ہوں۔ ایک دفعہ مل چکا ہوں ان سے۔ انہوں نے مجھے جلسے میں مجھے جھوٹا اور بے ایمان کہا تھا۔" ضیاالحق کے طنز پر میں نے اُن سے کہا! "آپ کو یاد ہے میں نے ایسا کیوں کہا تھا؟"

☆ ضیاالحق صاحب نے اس کا کیا جواب دیا؟

☆☆ کچھ نہیں اور خاموش ہو گئے تھے۔

☆ باخبر حلقوں کا خیال ہے کہ ضیاالحق اپنی منظور نظر حکومت میں آپ کو وزیر اعظم کے عہدے کی پیشکش لے کر گئے تھے۔ جواب میں آپ نے کچھ شرائط اور تحفظات کا اظہار کیا تھا۔

☆☆ نہیں بالکل نہیں! کوئی شرائط وغیرہ یا پیشکش ہرگز نہ تھی۔ بات وہی تھی جو اوپر بیان کر چکا ہوں کہ وہ مجھ سے کابینہ کے لئے دو تین آدمی مانگنے گئے تھے۔

☆ آپ کا جواب کیا تھا؟

☆☆ میں نے کہا ایک طرف آپ الیکشن کا وعدہ کر رہے ہیں دوسری طرف کابینہ کے لئے آدمی مانگ رہے ہیں۔ دو باتیں ایک ساتھ کس طرح ممکن ہیں؟

☆ 1985ء میں جنرل ضیاالحق نے الیکشن کا وعدہ وفا کیا تو اس وقت کی متحدہ جمہوری قوت MRD نے اس کا بائیکاٹ کر دیا۔ یہ فیصلہ غلط نہ تھا؟

☆☆ میرے خیال میں اُس وقت کے حالات میں اُس فیصلے کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔ جمہوری قوتوں کا ضیاالحق کے ساتھ یا اُس کے تجویز کردہ نظام میں رہ کر کام کرنا دشوار تھا۔

☆ جمہوری قوتوں کے خلاف فوج نے اپنے منظور نظر سیاستدانوں کی بڑی کھیپ قومی سیاست میں داخل نہیں کر دی؟

☆☆ یقیناً کئے ہیں مگر میرا جواب وہی ہے کہ اس وقت کے الیکشن میں سیاستدانوں کا حصہ لینا کسی طرح بھی سود مند نہ ہوتا۔

☆ جنرل ضیاالحق کی حادثاتی موت اندرونی یا بیرونی سازش میں سے کس کا شاخسانہ ہے؟

☆☆ بڑا مشکل ہے اس حوالے سے کچھ کہنا! جو بھی کچھ تھا بہر حال Sabotage تھا جو غالباً ان کے مخالفین نے ہی کرایا ہوگا۔

☆ آپ اتنی وضاحت فرما دیجئے کہ آپ اسے اندرونی سازش گردانتے ہیں یا بیرونی؟

☆☆ ہر بات میں ہم لوگ بیرونی ہاتھ کا شور کیوں مچانے لگتے ہیں۔ ہم اتنے اہم نہیں ہیں کہ باہر والے ہر وقت ہماری بابت سوچتے رہیں یا ہماری حکومتیں گراتے بناتے رہیں انہیں اتنی فرصت نہیں ہے۔ غالباً وہ ایک گیس تھی جس سے جہاز کو ان کے کسی مخالف نے اڑا دیا۔

☆ ماہرین کا خیال ہے کہ مذکورہ گیس پاکستان میں دستیاب ہی نہیں؟

☆☆ مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں!

☆ کہنے والے تو جنرل ضیاالحق کی حادثاتی موت کے بعد تجربہ کار سیاسی قیادت کی مسلسل کمی کو بھی بیرونی ہاتھ کا کرشمہ کہتے ہیں؟

☆☆ ہم اپنی ہر خامی اور کمزوری کو بیرونی ہاتھ سے منسلک کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ نہ ہم اتنے اہم ہیں اور نہ وہ لوگ اتنے فارغ۔ میرے خیال میں یہ تکرار فضول ہے۔ ابھی جو الیکشن ہوا ہے کیا یہ امریکہ نے کرایا ہے؟ جنرل مشرف نے کرایا ہے؟ دوسروں کا کیا تعلق اس سے!

☆ محترمہ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف صاحب کے دو دو بار اقتدار میں رہنا آپ کے خیال میں قوم کے لئے کس طرح سود مند رہا ہے؟

☆☆ کسی طرح بھی نہیں! بدقسمتی ہماری یہ ہے کہ جو پارٹی اپوزیشن میں ہوتی ہے وہ فوج اور ISI سے مل کر برسر اقتدار پارٹی کے خلاف سازش کرتی ہے جب وہی برسر اقتدار پارٹی اپوزیشن کا حصہ بنتی ہے تو کوئی سبق حاصل کرنے کے بجائے وہ بھی وہی کھیل شروع کر دیتی ہے۔

☆ مستقبل کی سیاست کے حوالے سے ان دونوں کا آپ کے خیال میں کیا رول ہے؟

☆☆ وثوق سے کچھ کہنا تو مشکل ہے لوگوں کی سوچ نہیں بدلی تو یہی آئیں گے اقتدار میں۔ ان دونوں نے پاکستان کو کافی نقصان پہنچایا ہے اور دونوں کی سیاست عوام کو بیوقوف بنانے کی سیاست ہے اگر عوام کی سوچ نہیں بدلے گی تو میں اور آپ کیا کر سکتے ہیں؟

☆ ائیر مارشل صاحب! آپ کی نرسری سے سیاسی تربیت پانے والے اقتدار کے اعلیٰ ایوانوں تک پہنچ گئے جبکہ آپ تمام کوششوں کے باوجود کبھی مقصود حاصل نہ کر سکے؟

☆☆ میں اکثر یہ کہا کرتا ہوں کہ ہر کلاس میں لائق اور نالائق طالب علم ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی ہر قسم کے لوگ تھے۔ جن کو نوکری کی جلدی تھی وہ کہیں اور جا کر ملازم ہو گئے۔ ہمارے ہاں اس قسم کے لوگوں کو نوکری ملنا مشکل نہیں ہوتا۔ جو طبعاً شریف اور لائق تھے مثلاً خورشید محمود قصوری صاحب وہ باقاعدہ اجازت لے کر اور خدا حافظ کہہ کر گئے کہ "جناب آپ کی پالیسی کے تحت مستقبل قریب میں آپ کو اقتدار ملنے کے امکانات نظر نہیں آتے لہٰذا ہمیں اجازت دیجئے"

☆ عمر اصغر خان کی سانحاتی موت کی بابت آپ جیسا دبنگ انسان بھی اس قدر محتاط کیوں ہے؟

☆☆ یہ پہلا واقعہ تھوڑی ہے پاکستان میں قائداعظم سے لے کر عمر اصغر تک یہ فہرست سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ ذاتی طور پر میرے لئے کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔ صوبہ سرحد کے ایک آئی جی پولیس گوہر زمان صاحب بڑے لائق افسر ہیں۔ ان سے ہم نے درخواست کی کہ وہ اس کیس کی بابت ہماری مدد کریں۔ انہوں نے خاصی تفصیلی رپورٹ بنا کر دی کہ یہ قتل ہے۔ ہم نے وہ رپورٹ پریس کو بھی جاری کی اور گورنمنٹ سے تحقیقات کے لئے کہا۔ گورنمنٹ نے ایک جج مقرر کیا کچھ عرصہ بعد وہ صاحب ریٹائر ہو گئے۔ دوسرا جج مقرر کیا گیا وہ صاحب بھی تقریباً سال بعد ریٹائر ہو گئے اب تیسرے جج اس کیس کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ ہم جب تاخیر کی جانب گورنمنٹ کی توجہ دلاتے ہیں تو وہ کام کی زیادتی کا عذر پیش کر دیتے ہیں۔ یہ میرا شیوہ نہیں کہ کسی اور کا بھی قتل ہوا ہو اس کی تحقیقات نہ کروا کر میں اپنے بیٹے کا کیس شروع کرانے پر زور دوں۔

☆ اگر یہ قتل تھا تو آپ کے خیال میں اس کے کیا اسباب تھے؟

☆☆ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں علاج کے لئے ملک سے باہر تھا اس کی بیوہ نے مجھے بتایا کہ عمر نے ان دنوں فون پر کہا تھا کہ کچھ نامعلوم گاڑیاں میرا تعاقب کر رہی ہیں پھر اس نے یہی بات اپنے دوست کامران صادق کو بتائی تھی۔ عمر اصغر جن دنوں وزیر تھا ان کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ ان کی وزارت کے ایک ذمہ دار عہدے دار کے ہاتھوں اولڈ ایج بینیفٹ کے اربوں روپے خورد برد کئے گئے ہیں۔ انہوں نے حکومت کو تجویز کیا کہ مذکورہ شخص کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل کیا جائے تاکہ قوم کا پیسہ کھانے والا ملک سے فرار نہ ہو سکے۔ شخص مذکورہ نہ صرف ملک سے فرار ہو گیا بلکہ اس کے سیکرٹری کا بھی بعد میں قتل ہو گیا جسے خودکشی قرار دینے کی کوشش کی گئی۔

☆ جنرل مشرف کی آمد کا سبب کارگل کی مہم جوئی ہے یا فوج اور سابق حکمرانوں کی ذاتی چپقلش کا نتیجہ؟

☆☆ میرے خیال میں مشرف صاحب کی اس بات کو درست تسلیم کرنا چاہئے کہ کارگل کی مہم جوئی کی اجازت خود نواز شریف صاحب نے دی تھی۔ دوسری وجہ شاید درست ہو کہ انہوں نے قدم بقدم پر خود کو نااہل ثابت کیا جس کے

باعث فوج کی اعلیٰ قیادت نے متفقہ طور پر اُن کے خلاف اقدام کیا۔

☆ آپ کے خیال میں کارگل کی مہم جوئی درست فیصلہ تھی یا غلط؟

☆☆ میں نہیں سمجھتا کہ درست اقدام تھا۔ بھارت نے اس قدر React نہیں کیا جس قدر اندیشہ تھا مگر یہ سوچ غلط تھی کہ بھارت اس کا جواب نہیں دے گا یا اسی طرح کی کارروائی تھی جو ایوب خان نے 1965ء میں کشمیر کے اندر کی تھی۔

☆ مشرف صاحب کی آمد جس طرح جس شکل میں بھی ہوئی آپ اس کی بابت کیا رائے رکھتے ہیں؟

☆☆ میری رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ پوری پاکستانی قوم نے انہیں خوش آمدید کہا تھا۔ حتیٰ کہ تمام سیاسی پارٹیوں مسلم لیگ، پیپلز پارٹی وغیرہ نے بھی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

☆ آپ کی پارٹی کی پالیسی کیا تھی؟

☆☆ اس حوالے سے ہماری پارٹی نے کسی قسم کا ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

☆ مشرف صاحب کے مستقبل کی بابت آپ کی کیا رائے ہے؟

☆☆ بہت مشکل ہے کچھ کہنا! یہ تو مہر پر منحصر ہے کہ وہ مشرف صاحب کو کب تک برسرِ اقتدار دیکھنا چاہتی ہے۔

☆ آپ کب تک دیکھ رہے ہیں؟

☆☆ موجودہ حالات میں فوج کے جانے کے مجھے کوئی امکانات نظر نہیں آتے۔ مشرف صاحب ہوں یا نہ ہوں فوج ابھی اقتدار میں رہے گی۔

☆ اس کے نتائج کیا دکھائی دے رہے ہیں؟

☆☆ پہلے کشمیر کا تصفیہ تو کر لیجئے! باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ بات پھر وہی ہے کہ سیاستدانوں نے بار بار خود کو نااہل ثابت کر کے فوج کو اس پوزیشن پر لا کھڑا کیا ہے۔ بیشک آپ نا اہلی کا دعویٰ کرتے رہیں مگر مجھے حیرت ہو گی اگر کوئی لانگ مارچ یا تحریک فوجی حکومت کے خلاف کامیاب ہو سکے۔

☆ کالا باغ ڈیم کی بابت آپ اور آپ کی جماعت کا کیا موقف ہے؟

☆☆ دس بارہ ٹی وی چینل ہیں آٹھ دس اور آنے والے ہیں جن پر ہر طرح کی بک بک ہوتی ہے کیوں ہم کالا باغ ڈیم کی بابت Debate نہیں کرتے۔ جب تک ہم قوم کو اس کے نقصانات اور مضر اثرات سے صحیح طور پر آگاہ نہیں کریں گے اُس وقت تک کچھ کہنا ممکن نہیں۔

☆ آپ نے ذاتی طور پر غور و خوض کیا ہے کالا باغ ڈیم کے مسئلے پر؟

☆☆ اس قدر نہیں کیا جتنا اس کا تقاضا ہے۔ اس کے جو Aspects ہیں۔ جب تک قومی سطح پر اس حوالے سے کھلی بحث و تمحیص نہیں ہوتی تب تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچا جا سکتا۔

☆ آپ کے خیال میں کالا باغ ڈیم بننے سے توانائی کا مسئلہ حل ہو جائے گا؟

☆☆ توانائی کی ضرورت تو وقت کے ساتھ بڑھتی جائے گی۔

☆ وقتی طور پر یہ مسئلہ ہوگا کہ نہیں؟

☆☆ میں سمجھتا ہوں جب تک اس مسئلہ پر قومی سطح کی مفاہمت نہیں ہوتی اُس وقت تک کچھ کہنا اور کرنے سے پیچیدگیاں بڑھنے کا امکان ہے۔

☆ قومی سلامتی اور تمام تر وسائل کو داؤ پر لگا کر ایٹمی قوت حاصل کرنا ازاں بعد اسے ضائع کرنے کے مراحل تک پہنچ جانا پھر اس کے خالق کو سامانِ عبرت بنا دینا کن عوامل کی نشاندہی کرتا ہے؟

☆☆ میں اس کو غلط سمجھتا ہوں۔ ایٹمی قوت بہت لمبا سفر ہے۔ اس موضوع پر آپ میرا مضمون لے لیجئے اُسے پڑھئے اور اپنے انٹرویوں کے لئے اُس سے استفادہ کر لیجئے۔

☆ آپ ایٹمی طاقت کو غلط کیوں سمجھتے ہیں؟

☆☆ میرے خیال میں ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

☆ اور اُس کے خالق کی بابت روا رکھا جانے والا سلوک کس امر کی غمازی کرتا ہے؟

☆☆ مجھے حیرت ہے مشرف صاحب انہیں قومی ہیرو کہتے ہیں یا کوئی شخص کتنا بھی عالم فاضل ہو اگر وہ بددیانت ہے راشی ہے اس نے قوم کا پیسہ کھایا ہے میرے نزدیک کسی رعایت کا مستحق نہیں ہے۔

☆ جس قدر تیزی اور شدت سے پاک بھارت مذاکرات کا ڈول ڈالا جا رہا ہے اس وقت کو آپ کس کروٹ بیٹھتے دیکھ رہے ہیں؟

☆☆ مشرف صاحب کی تمام تر پُرامیدی اور بھارت کی پُرجوشی کے باوجود یہ مسئلہ اس قدر آسان نہیں ہے جس قدر نظر آ رہا ہے۔ جب تک زمین پر بتدریج سوچ نہیں بدلے گی جب تک لوگوں کو آزاد نہیں کیا جائے گا تب تک حالات جوں کے توں رہیں گے۔ کشمیر کا بہترین حل اُس کی آزادی ہے جس کے بعد ہندوستان اور پاکستان اُس کی سلامتی کی ضمانت دیں اور کشمیر کی اپنی کوئی فوج نہ ہو پھر آپ دیکھیں گے کہ وہ خطہ کس قدر تیزی سے ترقی کی منازل طے کر کے خوشحال ہو سکتا ہے۔

☆ کیا ذاتی فوج نہ رکھنے والے ملک نیپال نے مثالی ترقی کی ہے؟

☆☆ نیپال کے پاس اپنی مختصر فوج ہے دوسرے اُن کے مسائل اور طرح کے ہیں۔ اس طرح یہ تو ہوگا کہ اُن کی آدھی قومی آمدن فوج پر تو خرچ نہ ہوگی اُن کے عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ ہوگی۔

☆ طبقاتی پسندگی، تعلیم سے بیگانگی، اختیار کا ارتکاز، معاشی عدم مساوات کس سبب پاکستانی قوم اس قدر تنزلی کا شکار ہے نیز مستقبل کی بابت کیا حسنِ ظن قائم کیا جا سکتا ہے؟

☆☆ میں کوئی Professy تو نہیں کرسکتا کہ کل ملک میں کیا ہوگا اور کیسے ہوگا؟ جب تک ہم ہوش کے ناخن نہیں لیں گے تب تک بہتری کی اُمید قائم نہیں کی جاسکتی۔ صحیح لوگوں کا آگے آنا اور صحیح سمت پیش قدمی کرنا انتہائی ضروری ہے اُس کے بغیر کامیابی کامرانی بہت دور بہت دشوار ہے۔

☆ دنیائے اسلام کی پس ماندگی کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

☆☆ آپ کے سوالات اتنے اہم ہیں ان پر کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

☆ مرزا مارشل صاحب! 9-11 کی بابت آپ کا نظریہ کیا ہے؟ یہ واقعی دہشت گردی تھی یا اُن کا اپنا رچایا ہوا ڈرامہ؟

☆☆ کسی ثبوت یا دلیل کے بغیر کوئی بات کہنا غیر ذمہ داری کے زمرے میں آتی ہے اس لئے میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا البتہ اُسامہ بن لادن نے اپنے انٹرویو میں ان حملوں کا کریڈٹ لیا ہے۔

☆ آپ کے خیال میں اُسامہ بن لادن مسلمانوں کے ہیرو ہیں یا ولن؟

☆☆ یہ سب امریکہ کی مہربانیاں ہیں۔ پہلے اُن کو طاقت بخشی بعد میں وہ اُن کے ہی سر آیا۔

☆ آپ اُسامہ بن لادن کا مستقبل کیا دیکھ رہے ہیں۔

☆☆ میرے خیال میں کسی نہ کسی روز اُن کے پکڑے جانے کی خبر آ جائے گی۔

☆ افغانستان اور عراق کی جنگ کی بابت آپ کی کیا رائے ہے؟

☆☆ عراق کی حد تک تو بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔ دھونس دھاندلی کی انتہا کردی گئی ہے اس کا کوئی جواز نہ تھا۔ بغیر کسی ٹینڈر کے ڈک چینی صاحب کی فرم کو ٹھیکے وغیرہ بھی دے دیئے گئے ہیں اور تیل کی دولت پر بھی ہاتھ صاف کیا گیا ہے۔ افغانستان کا سارا ڈرامہ اور لوگ اُن کے اپنے تھے۔ نہ معلوم کیوں آج کل امریکی حکومت عقل سے ماورا فیصلے کررہی ہے۔

☆ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجوہات ہوسکتی ہیں کیوں امریکی حکومت پر اضطراری کیفیت طاری ہے؟

☆☆ یہ مزاج سیاں کا اور عمل اُس کی عکاسی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جس قدر طاقت اُن کے پاس ہے انہیں دنیا پر حکومت کرنے کا حق ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں Fundamentalism وہاں بھی زور پکڑ رہا ہے سب کچھ اسی کے زیر اثر ہو رہا ہے۔

☆ آپ امریکہ کو کب تک اس پوزیشن میں دیکھ رہے ہیں؟

☆☆ میرے خیال میں یورپ، افریقہ، ایشیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے کہ وہ امریکہ کو روک سکے۔ یہ دنیا کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور اسے تباہی کے دہانے پر لے جائیں گے۔ ذہنی طور پر متاثر ہیں وہ لوگ اور اس وقت انہیں روکنا بہت مشکل ہے اس وقت جو اُن کے خلاف سر اُٹھائے گا وہ مار کھائے گا۔

☆ یہ جو ایک تصور زور پکڑ رہا ہے کہ اس کے بعد فلاں ملک اور اس کے بعد فلاں ملک کی باری ہے اس کی بابت آپ کیا فرمائیں گے؟

☆☆ یقیناً اس کے بعد اُن کا رُخ کوریا، ایران، شام اور فلسطین کی جانب ہوسکتا ہے شاید عراق کا تلخ تجربہ وقتی طور پر اس طوفان کو روک لے۔

☆ کیا پاکستان بھی کبھی اس زد میں آسکتا ہے؟

☆☆ اگر ہم نے سر اُٹھانے کی کوشش کی تو ہمارے ساتھ بھی کوئی رورعایت ہرگز نہ ہوگی۔ اس حوالے سے مجھے مشرف گورنمنٹ سے ہمدردی ہے کہ ان کے پاس کوئی متبادل راستہ نہ تھا۔ ہم ذرا بھی مزاحمت کرتے تو ہندوستان کو آزادانہ طور پر ہمارے خلاف کارروائی کی اجازت دے دی جاتی جس کے نتائج سے آپ بے خبر ہیں نہ میں لیکن میں یہاں یہ کہنا ضرور چاہوں گا کہ اس کڑے وقت میں ہماری حکومت کو مجبوری کی تمام حدیں پار نہ کرنا چاہئیں۔

☆ مرزا مارشل صاحب کچھ اپنے ہیروز کے بارے بتایئے جن سے آپ کسی طرح متاثر رہے ہوں؟

☆☆ کبھی اس حوالے سے زیادہ غور نہیں کیا۔ قوم نے جس شخص کو ہیرو کے درجے پر فائز کیا تھا اس کا انجام آپ دیکھ چکے ہیں۔ ویسے میں قائداعظم کو بہت پسند کرتا ہوں۔ سیاسی طور پر اُن سے اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے مگر کریکٹر کے حوالے سے وہ ایک بڑے اور مضبوط انسان تھے۔

☆ فیوچر کے حوالے سے آپ کی کوئی پلاننگ یا خواہش؟

☆☆ اس عمر میں ذاتی حوالے سے خواہش اور پلاننگ فضول سی بات ہے۔ ملک کے حوالے سے بہتری کی خواہش یقیناً ضرور محرک رکھتی ہے۔ ہماری پارٹی "نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ" اسی خواہش کا تسلسل ہے کہ چند اچھے لوگ مل کر قوم کو بہتری کی طرف مائل کریں۔ ہمارے ساتھ شامل لوگ بڑے قابل اور نیک نام ہیں۔ جسٹس (ر) سجاد علی شاہ، جسٹس (ر) مراد الدین سابق چیف جسٹس صوبہ سرحد بڑے نیک نام ہیں۔ جسٹس (ر) علی حسن قزلباش، پنجاب کے سابق گورنر میاں اظہر ہیں، الٰہی بخش سومرو صاحب ہیں۔ اس طرح کے پندرہ بیس اچھے اور روشن دماغ مل کر کوئی مثبت پیش رفت کریں تو شاید کوئی بہتر نتیجہ برآمد کرلیں۔

☆ مرزا مارشل صاحب! موجودہ سیٹ اپ میں آپ کو کسی قومی خدمت کے لئے منتخب کیا جائے تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟

☆☆ آپ ایسا غیر متوقع سوال کر رہے ہیں کہ اس کی بابت میں کوئی رائے زنی نہیں کرسکتا۔ میرا کہا ہوا ایک لفظ بھی اخبار کی سرخی بن سکتا ہے۔ میں ذاتی طور پر کسی خوش فہمی میں قطعاً مبتلا نہیں ہوں۔ ہوسکتا ہے "نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ" منظم و فعال ہو کر مستقبل میں کوئی اہم کردار ملکی سیاست میں ادا کرسکے۔

رس رابطے

جمع و ترتیب و تدوین

اعجاز کھوکھر

زیر نظر صفحات "چہار سو" میں شامل تعلیقات کی بابت احباب کی آرا کے لئے مخصوص ہیں۔ ذاتی رنجش یا مخاصمت کے لئے ان میں قطعی گنجائش نہ ہے۔ جناب قیصر نجفی کا مکتوب اس نوعیت کا آخری مکتوب ہے جو "جواب آں غزل" کے طور پر شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔ امید ہے احباب "چہار سو" اپنے خطوط میں صحت مند روایات کی پاسداری ہر حال میں ملحوظ خاطر رکھیں گے اور ذاتیات سے بالاتر ہو کر تعلیقات کی بابت اظہار خیال فرماتے رہیں گے۔

ادارہ

جناب [illegible] گلزار جاوید صاحب

السلام علیکم! "چہار سو" منیر نیازی والا بھی مل گیا ہے۔ آپ اپنا کام کر رہے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ منیر نیازی پر دوبارہ غور کرنے کا موقع ملا۔ گویا تجدید فکر والی بات ہوئی۔ ان حضرت سے میری کئی ملاقات ہو چکی ہے لیکن بس یونہی سرراہے یا کسی محفل میں مگر ایک گونہ مسرت ہی حاصل ہوتی ہے

مشکور حسین یاد

مکرمی تسلیم!

"چہار سو" میں اس مرتبہ قرطاس اعزاز حضرت منیر نیازی کے نام ہے۔ میں نے ان کی شاعری پر لکھے گئے توصیفی مضامین بھی پڑھے اور ان کے اشعار بھی جو اس شمارے میں شائع ہوئے ہیں۔ منیر نیازی ایک نئے طرز کے شاعر ہو سکتے ہیں مگر اردو زبان سے اور اس کے اصول و قواعد سے ان کی واقفیت لائق افسوس ہے۔ اسی شمارے میں درج ان کے اشعار سے چند مثالیں ان کی غلطیوں کی پیش کر رہا ہوں۔

۱۔ "سر حرفی" کے تحت ص ۳۸ پر ان کے تین شعر درج ہیں جن میں انہوں نے مشکل، شمال اور دل کے ساتھ جنگل کا قافیہ باندھا ہے جب کہ یہ لفظ "جنگل" ہے جنگل ہرگز نہیں ہے۔

۲۔ جگہ کی اردو جمع تین مقامات پر انہوں نے "جگھوں" لکھا ہے جو صریحاً غلط ہے۔ جگہ کی جمع "جگہیں" بروزن فعلن ہونا چاہئے۔ بروزن فعل غلط ہے۔

۳۔ لائی ہے اب اڑا کے گئے موسموں کی باس۔ برکھا کی رت کا قہر ہے اور ہم ہیں دوستو۔ پہلے مصرعے میں "گئے موسموں کی باس اڑا کر لانے" کی جو خبر دی گئی ہے اس لحاظ سے دوسرے مصرعے میں ہوا کا ذکر لازمی ہو جاتا ہے۔ محض برکھا کی رت گئے موسموں کی باس اڑا کر نہیں لا سکتی۔

۴۔ دل کو ہجوم نکہت مہ سے لہو کئے۔ یہ نکہت مہ کیا بلا ہے؟ محض ایجاد بندہ ہے اور بے معنی بھی۔

۵۔ غالب کا ایک شعر ان کے اردو دیوان میں درج ہے جس میں لفظوں کی شوکت اور ترکیب کی ندرت چونکانے والی ہے لیکن معنی کے لئے بہت کھینچ تان کرنا پڑتا ہے تب بھی بات نہیں بن پاتی۔ وہ شعر یہ ہے:

نقش نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

منیر نیازی صاحب فرماتے ہیں ہوا پہ حرف خوف سا فصیل سنگ تل پہ ہے یا عدم کا زرد رنگ خواہش خراش میں۔ فصیل سنگ تل سے کیا مراد ہے اور عدم کا زرد رنگ کہاں سے آ گیا؟ عدم کا کوئی رنگ ہو بھی تو وہ سیاہ ہو سکتا ہے۔ زرد رنگ ایجاد بندہ کے سوا کچھ نہیں۔ اسی طرح خواہش خراش بھی بے معنی ہے۔

منیر نیازی کی شاعری میں اس قسم کے وافر تسامحات کے باوجود ناقدان ادب کے توصیفی مضامین ان کی شاعری کو سرفراز کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ اصلیت یہ ہے کہ اس قسم کے توصیفی مضامین میں نام اور نمونے کے اشعار تبدیل کر کے ان کو کسی بھی ہمعصر شاعر پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔ یہی عمومیت نقد و نظر کو کم عیار بنا دیتی ہے۔ اس شمارے میں محسن احسان اور افتخار عارف کی غزلیں غزل کے حقیقی رنگوں کو اجاگر کرتی ہیں اور بیحد منظم و بہ خیال ہیں:

حیرت ہے سب نشان لب تشنگاں پہ تھے
جتنے بھی زخم لب کے رگ تاک پہ لگے

(محسن احسان)

ہم بھی اس سلسلۂ عشق میں بیعت ہیں جسے
ہجر نے دکھ نہ دیا وصل نے راحت نہیں دی

(افتخار عارف)

چہار سو کے اس شمارے میں اور بھی بہت کچھ لائق مطالعہ ہے خاص کر ڈاکٹر جاوید اقبال سے مصاحبہ جس کو بہت اطمینان سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔

دلی میں آپ کی پروفیسر گوپی چند نارنگ سے ملاقات ضرور ہوئی ہو گی۔ کچھ مفاد پرست لوگوں نے آج کل ان کے خلاف ایک مہم چھیڑ رکھی ہے

فاروق ارگلی کی مرتب کردہ ایک نئی کتاب میں نارنگ صاحب کے خلاف جو معاندانہ مضامین شامل کئے گئے ہیں وہ بےکطرفہ نمائندگی کے حامل ہیں جبکہ ان کے کیریئر کے مثبت پہلوؤں کو پردۂ اخفا میں ڈال دیا گیا ہے جو صریح ناانصافی ہے اس سلسلے میں چند نکات خاص طور سے قابل ذکر ہیں:

۱۔ ساہتیہ اکادمی دہلی کی پچاس سالہ تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ اردو کا کوئی آدمی اس کا صدر منتخب ہوا ہے۔ یہ بات پوری اردو برادری کے لئے باعث فخر ہے نہ کہ باعث تشویش۔

۲۔ نارنگ صاحب بہت صاف لفظوں میں اعلان کر چکے ہیں کہ وہ صرف اور صرف اردو کے آدمی ہیں۔ سیاسی طور سے وہ سوشلسٹ نظریات کے طرفدار ہیں۔ اس صورت میں ان کو آر ایس ایس سے ملوث کرنا یقیناً ناانصافی کی بات ہے۔

۳۔ ہو سکتا ہے کہ نارنگ صاحب کے انتخاب میں کامیاب ہونے پر آر ایس ایس نے بغلیں بجائی ہوں لیکن آر ایس ایس اس عہدے کے لئے ہندی یا تامل تلگو یا کسی دیگر زبان کے ادیب کو اپنا امیدوار بنا سکتی تھی۔ وہ اردو کے آدمی کی کیوں حمایت کرتی؟

۴۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو کے وائس چیئرمین کی حیثیت سے انہوں نے سارے ملک میں اردو کی ترقی و ترویج اور اس کو معاش سے جوڑنے کے لئے جیسے اور جتنے کام کئے ہیں ان سے ہزاروں نوجوانوں کو روزگار ملا ہے۔ ان کے زمانے میں قومی کونسل کا بجٹ دو کروڑ سے بڑھ کر گیارہ کروڑ سالانہ ہو گیا ہے اگر وہ اس وقت کے چیئرمین مرلی منوہر جوشی کو مطمئن نہ کر سکے تو کیا حکومت کونسل کو گیارہ کروڑ روپے کی خطیر رقم الاٹ کر سکتی تھی؟

امید کی جانی چاہئے کہ اردو زبان کی اعلا روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے نارنگ صاحب اپنے اور دیگر چند مخصوص لوگوں کا گھیراؤ نہیں بننے دیں گے جس سے لوگوں کو چہ میگوئیاں کرنے کا موقع ملے اگر وہ وسیع النظری اور کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے فرائض انجام دیتے رہیں تو یہ ہم سب کے لئے باعث فخر و اطمینان ہوگا۔ صاحب طرز ادیب اور منفرد طنز و مزاح نگار مشفق خواجہ کی رحلت باعث صد رنج و غم ہے۔

نامی انصاری

برادر مکرم سلام و رحمت!

مدت دراز سے کوئی خط آیا نہ رسالہ۔ صحت ساتھ نہیں دے رہی ورنہ پہلے کی طرح تقریباً دو سال کے چکر لگاتا۔ خدا کرے آپ صحت مند اور چاق و چوبند ہوں۔ فیصل سے آپ کا خاصا ذکر رہتا ہے آپ کی محبت کے نقوش اتنے گہرے ہیں کہ ان کو کوئی دھندلا نہیں سکتا۔ ابھی ابھی آپ کا ذکر خیر ہو رہا تھا سو چند حرف ہی سہی تجدید مراسلت ہو رہی ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ آپ بہ اعتبار صورت خوبصورت ہیں اور میں خوبصورتی کا دلدادہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام اہل خانہ کو صحت و سلامتی اور ایمان و ایقان کے ساتھ عمر دراز عطا فرمائے۔

شبنم رومانی

کرم فرما گلزار جاوید صاحب! سلام مسنون

آپ کے ہاتھ سے تازہ "چہار سُو" پا کر اچھا لگا بلکہ اندر میں خوشی کی لہر محسوس کی۔ ملاقات کے تین دن بے حد یادگار ہیں۔ دنیا بھر کے مشاہیر کے گوشے ہم نے روشناس حاصل کی ہے "چہار سُو" جتنا بلند معیار کا ہے اس سے زیادہ حسین، خوبصورت اور جوان آپ کی شخصیت ہے اپنے انٹرویوز میں اور اپنے افسانوں میں آپ جتنے گمبھیر اور تہہ در تہہ یا پرت در پرت فنکار نظر آتے ہیں آپ کے چہرے کی تازگی اور مسکراہٹ اس کے برعکس ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ ملاقات کے محسوسات کا تازہ کو سمارٹ میں شائع کروں گا۔ کاپی میں شمارہ آپ کو ملیگا۔

منیر نیازی پر گوشہ بہت ہی وقیع ہے شخصیت اور فن کا آئینہ خانہ سجانے اور سنوارنے کا فن کوئی آپ سے سیکھے۔ اس گوشہ پر بھی مبارکباد قبول کریں۔ عطیہ سکندر علی کے قلم کا جادو دھیرے دھیرے کام کر رہا ہے اور دل پر چھا جا رہا ہے اپنے قلم کی چابک دستی سے سرشاری بخشنے کا ہنر انہیں آ گیا ہے۔

میری غزل کے چھٹے شعر کا مصرعہ اس طرح ہے:

دردکی رود اور زخموں کی صدا

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

محترم بھائی گلزار جاوید! السلام علیکم

منیر نیازی کی شخصیت اور شاعری کو جس طرح آپ نے "مکالمہ راست" اور مضامین کے پیرائے میں سمیٹا ہے وہ یقیناً چہار سُو کی گراں قدر روایت کی دلیل ہے مجھے اس شاعر کے بارے میں بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ پھر منیر نیازی کی اچھوتی شاعری! لگتا ہے آپ نے دریا کو کوزے میں بند کر کے چہار سُو کے قاری کو ایک انمول تحفہ دیا ہے خراج تحسین پیش ہے۔

انور سدید صاحب نے اپنے ہر دو مضامین میں منیر نیازی اور مرحوم تابش دہلوی کو جس طرح نذرانہ ہائے عقیدت پیش کئے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے "اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"۔ "روح کا موسم" گلزار جاوید کا ایسا افسانہ ہے جس میں روح کی کلبلاہٹ منظر نگاری اور واقعہ نگاری کے بین السطور کہیں نہاں اور کہیں عیاں موجود نہیں پڑھنے والے کے دل میں کسک کا سامان بھی مہیا کر رہی ہے مبارکباد۔

"مجلس چہار سُو" میں ڈاکٹر جاوید اقبال سے مکالمہ بہت پسند آیا اور اپنی طوالت کے باوجود مختصر لگا۔ اس رابطے میں بھائی خیال آفاقی نے مجھ غریب کے ایک شعر پر ایک "پی۔ ٹی۔ سر" کی جس طرح گرفت کی ہے اس کی

سچائی پر میں اُن کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ ویسے آپ کو یاد ہو گا کہ یہ "پی۔ٹی۔ سر" منیر سے ہی ذریعے پہلی بار چہارسُو کے صفحات پر نظر آئے تھے مجھے ایسے موقع پر نہ جانے کیوں حضرت علیؓ کا یہ قول یاد آ گیا ہے "تم جس پر احسان کرو ہمیشہ اُس کے شر سے بچتے رہو۔"

غالب عرفان

محترم گلزار جاوید صاحب! سلام و رحمت۔

آپ ایک اچھے انسان اور محترم دوست ہیں جس کی میں قدر کرتا ہوں اس بار تھوڑی تفصیلی ملاقات تو ضروری مگر آپ کی علالت کے سبب وہ بے تکلفی کی فضا نہیں پیدا ہو سکی؟ آپ کی خاطر بھی ٹھیک طریقے سے نہیں کر سکا جس کا ملال ہے مگر ہم تو اس بات کے ماننے والے ہیں کہ "یار زندہ صحبت باقی"۔ منیر نیازی پر "چہارسُو" کا خصوصی شمارہ ہر لحاظ سے مکمل ہے آپ کا "براہ راست" کے عنوان سے کیا گیا انٹرویو قابل ذکر ہے۔ مجید امجد، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، سہیل احمد، محمد مجاہد سید کے مضامین اور کچھ تبصرے بھی آ رہا ہے انشاء کے عنوان سے وقار جاوید نے چہارسُو میں دی ہیں جن میں فیض احمد فیض، صوفی تبسم، انتظار حسین، ڈاکٹر وزیر آغا، نوقد پیر، افتخار عارف کا نام شامل ہے بابا جی دہلوی پر محترم انور سدید کا مضمون اس شمارہ کو اور زیادہ محترم بناتا ہے بابا جی دہلوی کی شاعری اور ان کے مزاج کو بڑے سلیقے سے محترم انور سدید صاحب نے اجاگر کیا ہے۔

محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ سے انٹرویو لینا بڑے حوصلے اور جگر کی بات تھی مگر آپ کی ذہانت نے اس دشوار کن مسئلے کو بڑی آسانی کے ساتھ سر کر لیا۔ جناب تنکہ کشور و کرم اور گلزار دہلوی صاحب کی باتوں میں سے سوالات کے لئے وقت چرا لینا بھی ایک کارنامہ تھا جسے آپ نے بخوبی انجام دیا؟ "چہارسُو" کے اگلے شمارے کا انتظار رہے گا۔

ملک زادہ جاوید

جناب گلزار جاوید صاحب! تسلیمات

چہارسُو کا تازہ شمارہ ملا۔ اس مرتبہ آپ نے قرطاس اعزاز منفرد لب و لہجے کے شاعر اور جدید شخصیت کے حامل جناب منیر نیازی کے نام کیا۔ وہ اقلیم سخن کے تاجدار ہوتے ہوئے بھی کہتے ہیں کہ "ابھی کام باقی ہے" میں یہ نہیں کہتا کہ آپ نے "براہ راست" کے سلسلے میں ان کی ذات کے کچھ مخفی گوشوں کو بے نقاب کیا ہے کیونکہ ان کی ذات سے منسوب داستانوں میں جھوٹی سچی حکایتوں نے بہت جگہ پائی ہے البتہ آپ کے سوالوں نے سچ کے بارے کی کھوج محنت سے کی ہے۔ مجید امجد نے قطع نظر اپنے ذاتی تعلقات اور منیر سے دوستی کے اپنی دیانتدارانہ رائے کی روشنی میں ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے یہ بات منیر جیسا منفرد شاعر ہی کہہ سکتا ہے کہ "خدا کو اپنے اعزاز کا انتظار

ہے" احمد ندیم قاسمی انہیں تنہائی کا شاعر گردانتے ہوئے ان کی تیز دھار انفرادیت کو پھیلا کر کائنات تک لے گئے ہیں۔ بقول ڈاکٹر انور سدید بعد میں قاسمی صاحب نے یوٹرن لیتے ہوئے کہا کہ "منیر نیازی دو مصرعے بھی ٹھیک سے نہیں لکھ سکتے اور انہوں نے جو تعریف پہلے لکھی تھی وہ بسلسلہ منافقت تھی۔" اب نہ جانے منافقت کی روشنائی سے قرطاس پر پہلے بکھری تھی یا سیاہی اب لنڈھائی گئی ہے۔ ان کے مختلف ہونے پر تو ہر صاحب علم متفق ہے اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے "اردو شاعری کی نئی زبان دراصل ایک حد تک منیر نیازی کی زبان ہے" دیکھی جا سکتی ہے۔ اشفاق نقوی کہتے ہیں کہ "منیر سے پہلی ملاقات کے بعد لوٹیے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کس چیز سے مل کر آئے ہیں ایک انسان سے یا ایک...... سے (اس خالی جگہ میں آپ "فرشتہ" بھی لکھ سکتے ہیں)۔

ڈاکٹر عمران مشتاق

جناب گلزار جاوید! سلام مسنون۔

خیریت موجود و خیریت مطلوب۔ "چہارسُو" ہر طرح سے ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے اس کے معیار میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے جو آج کل کے دور میں نہایت اطمینان بخش بات ہے۔ جہاں ادبی رسالہ نکالنا عذاب ہو وہاں معیار برقرار رکھنا کتنے کرب کا حامل ہو گا۔ یعنی اس کا برقرار رکھنا کسی بڑا سے کم نہیں۔ لیکن آپ کی ہمت اور استقامت کی داد دینا پڑتی ہے۔

اللہ کرے یہ پائیداری استوار رہے اور آپ ادب کی خدمت اسی لگن سے کرتے رہیں۔ آپ کے شوق کا کوئی "مثل" نہیں۔ کہ یہ انمول ہے اور یہ آپ ہی کا حصہ ہے باقی سب تو اب آپ کے نقش قدم پر نظر آتے ہیں۔ میں نظر آنے تک کی بات کر رہا ہوں تا کہ کسی طرح نازک پرکس نہ گذرے کہ زود رنجی اب ہماری عادت ہی نہیں فطرت بن چکی ہے برداشت کا مادہ اب مفقود ہے آج۔

دل نواز دل

محترم! سلام و رحمت۔

آپ کے.... ہمارے.... سب کے نہایت پسندیدہ... اور... عہد رواں کے بہ لحاظ تخلیق کار و شاعر... محترم منیر نیازی کے ذکر و فکر... ابھی اک کام باقی ہے... سے مزین قرطاس اعزاز پا کر... طبیعت شاداں و فرحاں... اور... سوچ شاداب و خوشگوار ہوئی....

ابھی حال ہی میں ۲۳ مارچ کو کوئٹہ ہاؤس میں... دوبارہ ایوارڈ وصول پاتے ہوئے... اُن کی شخصیت سے... کچھ کچھ بیٹا گئی... کسی حد تک بے نیازی... اور... ہم سب کے مشاہدے کے لئے نہایت ہی مانوس... حیرتوں کا تاثر بڑے بھرپور انداز سے مرتّب ہو رہا تھا... یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنی

حیرتوں میں... جانے کن کن زمانوں اور جہانوں کی.... کھوج لیے ہوئے
ہیں.... اور... اس تناظر میں... میں تو حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا
دیکھوں... ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا... اور... ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے
آگے... کی بازگشت ہر جا محسوس ہوتی رہتی ہے۔

شعیب حیدر زیدی صاحب نے تیکھے کے دونوں زاویے ماہرانہ نوکِ قلم
سے... قرطاس چہار سُو... پہ اتارے ہیں... براہ راست میں ہمیشہ کی طرح
آپ کے تیکھے نپے تلے سوالات خوب ہیں۔ اور... جوابات بھی انہوں نے
اپنے... متوقع خاص اسلوب میں دیے ہیں... البتہ کچھ مزید فکری و فنی جہتوں
کے بارے بھی استفسار ہو سکتا تھا... شاید اسی کی نشاندہی آغاز میں کی گئی...

”سحر روپ منیر“ کے کلام کی ضیا پاشیوں میں.... زبان زدِ خاص و
عام شاعری کی جگمگاہٹ بھی... کھلی اور ڈھکی ہوئی لی.... متنوع موضوعات،
مقامات و شخصیات کے بارے اُن کا تخلیقی رویہ تمام تر خصوصیات سے مزین رہا
جن کے ساتھ وہ اپنی شاعرانہ روش میں منفرد دکھائی دیتے ہیں....!

منیر نیازی صاحب کے بارے جملہ مضامین... جناب مجید امجد
کے 'کالے کٹھن پہاڑ' سے لے کر اشفاق نقوی صاحب کے 'شہر سنگ دل'...
تک نے ان کے مختلف شعری مجموعوں کے حوالے سے اُن کی شاعرانہ خصوصیات،
فنی اسلوب و لہجہ شعری منظر تحریکات شاعر معاصروں میں امتیازی تخصص سے متعلق
اپنے اپنے انداز اور... جداگانہ نظریے کے ساتھ قاری کے لیے کئی گوشے کشادہ
کیے... اور... کئی جہتوں کے امکانات ابھر کے سامنے آئے.... جدید ترین لہجہ کا
پیامبر یا کھلے منظروں کی دنیا... تین بڑے مکمل ہوں یا تیرۂ صدا... ہر تحریر شاعر
اور شاعری کے باہمی رابطے اور عوامی تحریکات کی تفہیم میں ممد و معاون رہی...
'انتساب و قلب' سے بھی متقدمین و معاصرین کے تاثرات و اعترافات کا علم ہوا
جو لہا تو آیا.... 'منیر کی شاعری 'حیرت' کی شاعری ہے پڑھنے والا اکھڑ ہی
نہیں سکتا“.... محترمہ شمیم شکیل 'منیر نیازی کی شاعری ایک عمر کی ریاضت ہے
اور اُن کا اسلوب ”اسلوبِ منیر“ ہے اور افتخار عارف صاحب 'ہم منیر نیازی کی
موجودگی میں خود کو بہت ثروت مند محسوس کرتے ہیں۔“

طویل افسانے کے مطالعے میں یہ مسئلہ درپیش رہتا ہے... کہ...
اگر اُسے قسط وار میں یا وقفوں میں پڑھا جائے تو اس کا مجموعی تاثر وہ بن نہیں
پاتا... جو ذہن چاہتا ہے... اس لیے... 'تسلسل'... کے لیے کسی نایاب فرصت کی
تلاش ہے۔ 'روح کا موسم' کے حوالے سے محاوروں و ضرب الامثال کا کمال یہ
ہوتا ہے کہ وہ کسی واقعے، حادثے یا زود و دیر طوالت کو سمیٹے ہوئے اُن کے برمحل
استعمال سے ساری صورت حال کا علم نہایت ہی precisely ہو جاتا ہے
جب کہ اگر جینے کا کوئی جواز سمجھ میں نہ آئے... اور... کوئی راہ بھی روشنی نہ
دے... تو 'روح کا موسم' ہی زندگی بسر کرنے کا حوصلہ و توانائی عطا کرتا ہے

فلیش بیک میں ماضی کے اوراق اُلٹتے ہوئے مذہبی، سیاسی، سماجی و تہذیبی مناظر
قاری کو یکے بعد دیگرے اپنی خصوصیات و جزئیات سمیت اختتام کی طرف
بڑھتے ہوئے ملتے ہیں جہاں زمانی و مکانی مائل فاصلوں نے رنگ روپ،
سراپے، چہرے مہرے، مزاج کی شگفتگی و شادابی کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا ہے سو
روح کے موسم کی گھٹا آفرینی یہ بھی رہی کہ ابتدا حسن سے ہوئی... انتہا تک آتے
آتے تخلیق کار کے ساتھ قاری کو بھی کسی ایسے تجزیے کا اور سیاق ضرب المثل کی
ضرورت محسوس ہوئی جو سارے سیاق پہ محیط ہو سکتا.... مجلسِ چہار سُو کے توسط
سے بزبانِ محترم ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب، علامہ اقبالؒ کے نظریات و افکار کی
مملکت اسلامیہ میں تشہیر و فروغ نشر و اشاعت کے ضمن میں متعدد مختصر خیالات و
احساسات سے آگہی پائی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال فہمی میں بہت بڑی رکاوٹ
شرح تعلیم میں نمایاں کمی بھی رہی... کچھ شعری و نثری تخلیقات دیگر رسائل میں
پڑھی ہوئی ملیں بعض ذاتی و شخصی تاثرات پہ بنی نظموں نے متاثر کیا۔ ربط
طویل ہوا کمپوزنگ کی خبر چاہتے ہوئے کوئی متبادل ای میل ایڈریس بھی
شامل تحریر کیجیے۔

شگفتہ نازلی

محترم گلزار جاوید صاحب!

”چہار سُو“ مارچ اپریل ۲۰۰۵ء کا شمارہ ملا۔ سرورق پر منیر نیازی کی
تصویر دیکھ کر آپ کے لیے بے اختیار لبوں سے دعائیں نکلیں کہ آپ نے باکمال
شاعر کو قرطاس اعزاز کے لیے منتخب کیا ہے۔ میں کسی بھی رسالے کے خطوط سب
سے پہلے پڑھتا ہوں۔ اس رابطے میں مشکور حسین یاد کا تفصیلی خط اہم ہے۔ حمیدہ
معین رضوی صاحبہ نے دیانت داری سے وضاحت کی ہے۔ ممکن ہے سجاد نقوی
صاحب کو اپنے خط کا جواب بھی محترمہ کے خط میں مل گیا ہو۔ معذرت کے ساتھ
”براہ راست“ میں آپ کی منیر نیازی سے گفتگو یا مصاحبہ بہت کمزور رہا۔ ورنہ
آپ کے سوالات کی کاٹ آپ کی علمی و ادبی رجحانات کے حوالے سے سوالات
بہت اہم ہوتے ہیں مگر آپ نے منیر نیازی صاحب سے پرانے اور نئے زمانے
کا اچھا شاعر مشاق افسانہ نگار معلوم کرنے میں اپنی ذہانت و توانائی صرف کی۔
آپ نے خود اظہار کیا ہے کہ:

”جس قدر منیر نیازی صاحب کی شخصیت عظمت سے عبارت ہے
اُس قدر رسالے کا معیار فکری زاویوں کا احاطہ نہیں کر رہا ہے کچھ ذاتی حالات، کچھ
وقت کے شتابی مزاج کا ہے“

نہ معلوم وہ کیا حالات تھے کہ ہم آپ کی ایک باکمال شاعر سے علمی
گفتگو سے محروم ہو گئے مگر آپ نے اس کمی کو ”مجلسِ چہار سُو“ میں بخوبی پورا کیا۔
آپ نے ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے علمی و ادبی اور علامہ اقبال کے نظریات
اور پاکستان کے حوالے سے حقیقت پسندانہ گفتگو کی۔

فرمان فتح پوری صاحب نے "جدید تر لہجے کا بانی" میں منیر نیازی کے فن پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ان کی شاعری کے مخفی گوشوں کو سامنے لائے ہیں مگر انہوں نے اردو شاعری کو پانچ دوروں میں تقسیم کر کے منیر نیازی کو پانچویں دور کا شاعر قرار دیا ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ مضمون کا مجموعی تاثر بہت اچھا ہے ڈاکٹر انور سدید نے "منفرد شاعر" میں مختصراً منیر نیازی کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور انہیں انوکھے جذبات اور حیران کر دینے والی سوچ کا شاعر قرار دیا ہے مگر وہ آخر میں کہیں اور نکل گئے اگر وہ یہ سطور بھی منیر نیازی کے لیے مخصوص رکھتے تو کیا اچھا ہوتا۔ مجید امجد، احمد ندیم قاسمی اور شکیل احمد کے منیر نیازی پر مضامین اچھے ہونے کے باوجود اپنا تاثر نہیں چھوڑ سکے۔ محمد سلیم الرحمن کا مضمون "صبح کاذب کی ہوا میں" منیر نیازی کی شاعرانہ فضا کا رنگ لیے ہوئے ہے کہ اس میں منیر نیازی کی علامات اور لفظیات کا مختصراً اچھا تجزیہ ہے۔ قاری شاہد اور مصطفیٰ ملک نے منیر نیازی کے کلام کا انتخاب بہتر کیا ہے۔ غزلیات کا انتخاب بہت اچھا ہے برج نرائن کی غزل نے بہت لطف دیا۔ عامر سہیل شاعر کی غزل کا یہ شعر اُن کی مرحوم بیگم سے محبت و رفاقت معلوم ہوتا ہے۔

اک پیکرِ جمال ابھی تک نظر میں ہے
محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے وہ گھر میں ہے

مظفر ایوبی صاحب کی پرانی غزل نے نیا مزہ دیا۔ عبدالعزیز خالد کی غزل مشکل پسندی کا شکار ہے۔ افتخار عارف، امجد اسلام امجد، عابد انصاری، عزیز نسیم ساحل، جگجیت سنگھ حسرت اور محمد ظہیر کی غزلیں انفرادیت لیے ہوئے ہیں۔ بھگوان داس اعجاز کی چھوٹی بحر کی غزل میں گیت کی مٹھاس شامل ہے۔ سید امتیاز احمد کا یہ شعر بہت اچھا لگا۔

اگر ہوئے بھی کبھی گفتگو پہ آمادہ
میں اس سے کیا کہوں گا اور وہ مجھ سے کیا کہے گا

ڈاکٹر وزیر آغا، بلراج کومل، کرامت بخاری اور فیصل عظیم کی نظمیں فکر کے نئے دریچے وا کرتی ہیں۔ سوہن راہی، مختار بابر اور دل نواز دل کی نظموں میں محبت و افسردگی کا اظہار احساس کو جھنجھوڑتا ہے۔ "روح کا موسم" افسانے میں آپ نے ایک جہان آباد کر دیا ہے۔ جتندر بلو کا افسانہ "تعلق" اچھا ہے مگر کچھ بے محل جملوں سے افسانہ نگار کی عصبیت کا شائبہ نظر آتا ہے۔

"تخلیقِ عصر" میں علیہ سکندر علی خاصی محنت سے کتاب اور صاحبِ کتاب کا وضاحتی تعارف پیش کرنے میں کامیاب رہیں جس سے کتاب پڑھنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔

نوید سروش

محترم و مکرم گلزار جاوید صاحب السلام علیکم

خیریت مطلوب۔ "چہار سو" جلد ۱۴، شمارہ مارچ اپریل ۲۰۰۵ء موصول ہوا۔ میں اس کرم کے لیے سپاس گزار ہوں۔ آپ کی ادارت میں یہ تاریخ ساز ادبی مجلہ جس کامیابی کے ساتھ ارتقائی مراحل طے کر رہا ہے وہ لائقِ تحسین ہے۔ اس شمارے میں "قرطاس اعزاز" پسند آیا۔ افسانوں میں "روح کا موسم" نہایت موثر ہے۔ شاعری کا انتخاب دلکش ہے۔ مجلس چہار سو کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

غلام شبیر رانا

بھائی گلزار جاوید صاحب سلام مسنون

"قرطاس اعزاز" والا سلسلہ بہت اچھا ہے اس سے شخصیت کی تصویر پوری طرح سامنے آجاتی ہے اور تاثرات بھی۔ منیر نیازی بہت بلند پایہ شاعر ہیں۔ نظمیں غزلیں قریباً تمام ہی اچھی ہیں۔ تابش دہلوی کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید کا مضمون اور جتندر بلو کے افسانے اچھے لگے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال سے آپ کا مکالمہ بھی خوب ہے۔

انوار فیروز

گرامی قدر گلزار جاوید صاحب سلام و رحمت

"چہار سو" جلد ۱۴ شمارہ مارچ اپریل ۲۰۰۵ء میں صفحہ ۱۴۳، ۱۴۴ پر ایک مکتوب نگار کی کچھ باتیں محلِ نظر ہیں۔ جن کی وضاحت ضروری ہے تا کہ ان کے غم ادبی نخوتوں سے نئی نسل گمراہ نہ ہو جائے۔ موصوف اس سے پہلے بھی "چہار سو" جلد ۱۴ شمارہ جنوری فروری ۲۰۰۵ء میں ہمارے مضمون "سید عبدالحمید عدم... کچھ یادیں کچھ باتیں" کو نشانہ بناتے ہوئے سراسر لایعنی افکار و خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ جبکہ انہی صفحات پر مذکورہ مضمون کے حوالے سے مستند شاعر و ادیب آنجہانی پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ممتاز افسانہ نگار جوگیندر پال اور بعض دیگر اہلِ علم کی آراء ان الفاظ میں درج ہیں۔

☆ دوسرے حصے میں قیصر نجفی صاحب کا مضمون "سید عبدالحمید عدم... کچھ یادیں کچھ باتیں" بہت پسند آیا۔ عدم صاحب سے کسی حد تک قربت کا فخر مجھے بھی حاصل ہے..... جگن ناتھ آزاد

☆ مجھے عدم صاحب کی نجی زندگی کے حالات جاننے کی بڑی چاہ تھی۔ قیصر نجفی نے اپنے مضمون میں یہ معلومات بڑی حساس آگہی سے پہنچائی ہیں... جوگیندر پال

☆ قیصر نجفی کی یادداشت "سید عبدالحمید عدم" ایک عمدہ کرداری دستاویز ہے۔ دیکھیں تو ہم کتنی جلدی اپنے نامور شاعروں کو بھول جاتے ہیں.... ارشاد احمد صدیقی

☆ برادرم قیصر نجفی کی یادداشت "عبدالحمید عدم" ایک خوبصورت تحریر ہے۔ عدم صاحب کو ignore کیا گیا ہے ورنہ ساغر کاشمیری، شہرت بخاری، سجاد باقر رضوی، انجم رومانی اور دیگر اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ مضبوط اور اہم شاعر ہیں۔ عدم صاحب پر مزید کام ہونا چاہیے.... کرامت بخاری

☆ "سید عبدالحمید عدم... کچھ یادیں کچھ باتیں" میں عدم صاحب کا شخصی و مزاجی خاکہ شعر و سخن کی کائنات کے پس منظر میں پرلطف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جس سے ان کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ واضح ہوتا ہے... شگفتہ نازلی

ہمارا خیال تھا کہ ہمارا "آراء" پڑھنے کے بعد موصوف نے کافی نفسی اطمینان ہو گی اور آئندہ علم دشمن اور ادب مخالف رویہ اپنانے سے توبہ کر لی ہو گی۔ مگر افسوس کہ ہمارا یہ خیال خام نکلا۔ شاید انھیں ہماری خاموشی سے بھی شہ ملی ہے کہ وہ پنجے جھاڑ کے ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ بہرحال ہم نے آ تا نامہ میں جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان کے تناظر میں درج ذیل معروضات پیش ہیں...

۱۔ کسی زبان کے قواعد و ضوابط منجمد نہیں ہوتے لیکن ان پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اپنے ہاتھوں پر بھی غور کر لینا چاہئے۔ وہ خیال آفاقی صاحب ہوں یا غالب عرفان صاحب، میری تقی میر نہیں ہیں۔ جنھوں نے کہا تھا:

؎ مستند ہے میرا فرمایا ہوا

آج کی دنیا میں ایسا دعویٰ مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ یہاں نئی لسانی تشکیلات کا نعرہ بلند کرنے والے بڑے بڑے لوگ اپنی آگ میں خود جل کر راکھ ہو گئے ہیں۔ کیمبرج کی ہر انگریزی کا حوالہ دینے کے لئے کیمبرج کی محاورات اور سوانح کا عرفان بھی ضروری ہے۔ "خلاؤں در خلاؤں کا" دعا غلط ہے بلکہ ادب دشمنی ہے۔ ادب و زبان میں پاگل کی خواہش رکھنے والوں کو اس کے اعصابی نظام سے بھی ڈرنا چاہئے۔

۲۔ خیال آفاقی صاحب اپنے مصرع "اور پتنگ کٹ کے پھٹ چکی ہو گی" کے حوالے سے خوش فہمی کا شکار ہیں۔ یہ مصرع ناموزوں ہے۔ ان کے کہنے سے موزوں نہیں ہو جائے گا۔ کٹ کا کاف ساقط الوزن ہے۔ اس میں ہرگز دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ چاہیں تو کسی اہل علم سے رجوع کر لیں۔

۳۔ خیال صاحب نے میری غزل کے تین اشعار پر خیال آرائی فرمائی ہے۔ جس سے ان کی سخن فہمی کی قلعی کھلتی ہے۔ زخم کو گلاب لکھ کر ہم نے زندگی کی ظاہری اور باطنی شفا کی سے حوصلہ مندی سے نبرد آزما ہونے کا جذبہ اجاگر کیا ہے کہ جگرداری ہی حقیقی نصاب زندگی ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ تشبیہیں اور استعارے یا تمثالیں اور علامتیں نئے پرانے نہیں ہوتے بلکہ شاعر کا طرز احساس ان کی اسلوبیاتی سطح پر صورت گری کرتا ہے۔ موصوف کو اعتراض ہے کہ زخم کو گلاب یعنی پھول سے تشبیہ دینا حقد میں کا شیوہ تھا۔ یہ تشبیہ اور متعدد موتوں فرسودہ ہو چکے ہیں۔ ہم یہاں پہلے مرزا غالب ایسے استاذ فن کا ایک شعر پیش کرتے ہیں جن کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہی جدت طرازی قرار دی گئی ہے:

شغل میں کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پر گل خیال زخم سے دامن نگاہ کا

غالب نے زخم کے لئے گل کی امیج وضع کر کے اپنی بلند حوصلگی کی جس قوتِ مجاہدت سے تصویر کاری کی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ عصر حاضر میں اردو غزل کو جدید تر رخ دینے والے شاعر شکیب جلالی کے درج ذیل اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

دعوتِ غم کو رگِ جاں چلا
زخم خنداں کو گل تر چلا

دل کے ویرانے میں اک پھول کھلا رہتا ہے
کوئی موسم ہو مرا زخم ہرا رہتا ہے

اڑ گیا تن نازک سے پتیوں کا لباس
کسی کے ہاتھ نہ آئی مگر گلاب کی باس

موصوف دیکھ لیں کہ ہمارے عہد کے جدید تر ین شاعر نے زخم اور پھول میں کس حسن کاری سے تشبیہ کا رشتہ قائم کیا ہے اور تیسرے شعر میں گلاب کے استعاراتی استعمال میں تازہ کاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ موصوف کو معلوم ہونا چاہئے کہ شاعری دو اور دو کا نام نہیں ہے۔ امیجز کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ فطری یا غیر فطری، تصویری اور Surrealistic کا اظہار کر دینا انھیں کا محل نہیں ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے، صحیح کہا ہے "علم کے جہل سے جہل کا علم بہتر ہے"

۴۔ ہمارا شعر ہے:

ایک ایسا بھی خط ملا جس کا
عمر بھر میں جواب لکھتا رہا

اس شعر میں ظاہر ہے "کا" کی جگہ "کو" کمپوزنگ کی غلطی ہے۔ اتنا اندازہ تو کوئی طفل مکتب بھی کر سکتا ہے۔

۵۔ ہمارا تیسرا شعر یوں ہے:

رزق تو تھا نپا تلا یا رب
میں اسے بے حساب لکھتا رہا

ہم کہ بندگان خدا ہیں عاجز و کمتر ہیں۔ اس شعر پر اعتراض کرنے سے قاصر ہیں۔ بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ قادر مطلق ہے لیکن اپنی حکمت کو وہی بہتر سمجھتا ہے۔ دنیا میں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسان تنگی رزق کا شکار ہیں اور فاقوں پر مجبور ہیں۔ اقبال نے کہا تھا:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

بندگان رب شب و روز رزق کے لئے اور رزق میں آسانی کے لئے دعائیں مانگتے ہیں۔ یہ ایسی کوئی سمجھ میں نہ آنے والی بات نہیں ہے۔ ہم نے بھی اظہار

قناعت کے ساتھ فراخیٔ رزق کی تمنا کی ہے۔ ہماری عاجزانہ فریاد کو رازق اکبر کے باب میں سوئے ظن قرار دینے سے پہلے اگر موصوف قرآن حکیم کا مطالعہ کر لیتے تو شاید انہیں احساس ہو جاتا کہ وہ صرف اپنے موقف کو صائب ثابت کرنے کے لئے آیاتِ ربانی کے متن میں تخفیف کے مرتکب ہو رہے ہیں بلکہ اللہ کے ایک حکم کو تسلیم کرنے سے واضح طور پر گریزاں ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۰ میں فرماتا ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا ۝

ترجمہ: اس میں شک نہیں کہ تمہارا پروردگار جس کے لئے چاہتا ہے روزی کو فراخ کر دیتا ہے اور جس کی روزی چاہتا ہے تنگ رکھتا ہے اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے بندوں سے بہت باخبر اور دیکھ بھال کرنے والا ہے۔

اور یہی فرمان سورۂ رعد کی آیت ۲۶ میں یوں بیان ہوا ہے۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۝

ترجمہ: اور خدا ہی جس کے لئے چاہتا ہے روزی کو بڑھا دیتا ہے اور (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگ کرتا ہے اور یہ لوگ دنیا کی (چند روزہ) زندگی پر بہت نہال ہیں۔ حالانکہ دنیاوی زندگی (نعیم) آخرت کے مقابلے میں بالکل بے حقیقت چیز ہے۔

درج بالا آیات مبارکہ کے علاوہ سورۂ عنکبوت آیت ۶۲، سورۂ روم آیت ۳۷، سورۂ سبا آیت ۳۶، سورۂ زمر آیت ۵۲ اور سورۂ شوریٰ آیت ۱۲، ۱۹ میں بھی رب العزت کے تقسیم رزق کے حوالے سے ایسے ہی ارشادات ملتے ہیں۔

۲۔ تذکرہ بالا شعر میں خیال آفاقی صاحب نے "یارب" کے استعمال پر بھی اپنی بقراطی جھاڑی ہے اور اس کے استعمال کو بے جا اور شعر کو مہمل بنانے میں پیش پیش کیا ہے۔ شاید ایسے ہی مواقع پر یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی ہے "چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی" کیونکہ سنا ہے موصوف اردو کے استاد ہیں۔ فرہنگ عامرہ کے مطابق "یا" حرف ندا یا حرف مناجات ہے۔ جس کے معنی ہیں اے، او، خوب اور یارب کا مطلب ہے اے اللہ... شعر میں اللہ سے خطاب کیا گیا ہے۔

آخر میں ہم آفاقی صاحب کو اُن کی ایک اور ادبی گمراہی سے مطلع کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ فیصل عظیم کی نظم "ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا ملبہ" آزاد نظم ہے نثری نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ کاشف ایک ماہر نقاد کو آزاد نظم، معریٰ نظم اور نثری نظم کا فرق ہی معلوم نہیں ہے۔ یہاں ہم تدریسی معلومات فراہم کر کے سخن شناسی کی توہین نہیں کریں گے۔ آفاقی صاحب اس کم لکھے کو زیادہ جانیں اور اس چیپٹر کو بند (close) سمجھیں۔

قیصر نجفی